
شاعر

شاعر کے پتے میں تبدیلی

شاعر کے خریدار و قارئین سے گزارش ہے کہ اب وہ اپنے زرِ سالانہ کی ترسیل اور خط و کتابت کے لئے صرف نیا پتہ ہی استعمال کریں۔ نیا پتہ نوٹ کر لیجئے

منی آرڈر، رجسٹری وغیرہ کا پتہ

ماہنامہ شاعر
۲۰۲-۲۲۸، دینا ناتھ بلڈنگ
پی - بی مارگ - بمبئی ۴۰۰۰۰۴

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شاعر
پوسٹ بکس نمبر 3770
گرگام پوسٹ آفس، بمبئی ۴۰۰۰۰۴

یکم مئی ۱۹۹۵ء سے نیا پتہ نافذ العمل ہوگا



Change in the Address of 'Shair'

Readers of the '**Shair**' are hereby informed that with effect from 1-5-1995 the address of '**Shair**' is changed. Kindly use the new addres for all your correspondences and remittances of annual subscription

The New Address is

For Correspondences

'Shair' Monthly
PO Box No. 3770
Girgaon H.P.O.
Bombay 400 004

For Moneyorder and Registered Articles.

'Shair' Monthly
202-228, Dinath Building,
P.B.Marg, Bombay 400 004.

فکر امروز



علم، اصل ہے اور ادب فرع ہے۔ علم سرچشمہ ہے اور ادب اس کی ایک لطیف موج۔ علم ایک چمنستانِ غیر محدود ہے اور ادب اس کی بہارِ معطر۔ علم کے معنیٰ "دانستن" یعنی جاننا ہیں۔ موجودات کی گوناگوں نوعیات کے لئے گوناگوں علوم بھی ہیں، مثلاً علم الاشیأ، علم الانسان، علم اللسان وغیرہ وغیرہ۔ یہاں نفسِ موضوع علم اللسان سے متعلق ہے، اور ادب اسی کی ایک شاخ ہے۔ علم اللسان ہر ملک کی زبان سے تعلق رکھتا ہے اور اسے درس گاہوں یعنی مکاتب، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حاصل کیا جاتا ہے، مگر ادب، ذہن و دماغ کا وہ جوہرِ گرانمایہ ہے جو اکتسابِ علوم و فنون کے بعد صرف ادراک و معارف کی قوت سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ انہیں درسگاہوں میں ادب الالسنہ کے نمونے تو مل سکتے ہیں، مگر وہ دماغ، جو ادب کا خلاق ہو، صرف فطرت کی ودیعت ہی کا رہینِ منت ہے اور کسی نوعیت سے بھی اکتسابی نہیں کہا جا سکتا۔

[۱۶ر اپریل ۱۹۳۳ء]

سیماب اکبرآبادی

بانئ اعظم سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۶واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد — ۶۶
شمارہ — ۲

فون: ۳۸۲۹۹۰۴

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۵ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

ناظرِ خصوصی خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

۲۶/۳

[illegible]

Abu Mohd Sahar
پروفیسر ابو محمد سحر
Professors' Quarters
Opp. Char Bungalow
Bhopal

نیاز فتحپوری بنام ابومحمد سحر

 نیاز محمد خان [نیاز فتح پوری] لیاقت علی خان [تاریخی نام] پ : سنی گھاٹ ضلع بارہ بنکی ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء م : ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کراچی، پاکستان

ترتیب

شاعر نمبر ۲ [1995] جلد ۶۶

اپنی بات

پہلے اس تحریر کو پڑھ لیجئے

یکم مئی سے چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر شاعر کے پتے میں تبدیلی کی جارہی ہے۔ اب خط و کتابت کے لئے نیا پوسٹ بکس نمبر 3770 نوٹ کرلیجئے۔ اپنے زر سالانہ کے منی آرڈر، رجسٹری اور SPEED POST وغیرہ کے لئے ۲۲۸۱-۲۰۲، دیپا تھ بلڈنگ، پی بی مارگ بمبئی ۴۰۰۰۰۴ کا پتہ استعمال کیجئے۔ اس طرح آپکے منی آرڈر، رجسٹرڈ خطوط اور پارسل وغیرہ محفوظ طریقے سے ہم تک پہونچ جائیں گے۔ شاعر سے وابستہ اپنے دیگر احباب کو بھی شاعر کے نئے پتے کی تبدیلی کی اطلاع دیجئے گا۔ نئے پتے کو فعال بنانے کے لئے ہمیں ایک خط ضرور لکھ دیجئے۔

ہم عصر اردو ادب نمبر کو مکمل کرنے میں شب روز کی مصروفیت کے باوجود شاعر کے عام شمارے بھی قارئین تک پہنچ رہے ہیں۔ جنوری، فروری، مارچ کے شمارے اور خاص نمبر سے قبل اپریل ۹۵ء کے شمارے کے ساتھ آپ تک خاص نمبر کی مکمل تفصیلات پہونچ جائیں گی۔ خاص نمبر دو جلدوں میں شائع ہوگا۔ خاص نمبر کے صفحات، قیمت، خریداروں کے لئے رعایتی قیمت، اشتہارات کی شرح، کتب و رسائل کے اشتہارات کی نئی رعایتی شرح اور دیگر امور سے متعلق معلومات کو آپ تک پہونچانے کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ آئندہ چند ماہ اور سال ۹۵ء شاعر سے آپ کی وابستگی اور مصروفیت کا سال ہوگا۔ کسی روایتی خاص نمبر کے لئے طرح طرح کے خاکوں سے ماوراء، بیسویں صدی کی اہم ترین ادبی دستاویز کے لئے رفیقان شاعر اپنے ہر ممکنہ تعاون کے لئے تیار رہیں۔ کہیں آپ شاعر کے فقید المثال خاص نمبر سے محروم نہ رہ جائیں۔

آپ کہیں بھی ہوں، شاعر کے خاص نمبر کے حصول کے لئے باخبر رہیں شاعر سے اور اپنے شہر یا علاقے کے کتب فروش سے رابطہ رکھیں۔ اپنے بقایاجات اور حالیہ مہینوں میں مدت خریداری پر نظر کیجئے اور دیکھئے کہ کسی وجہ سے آپ خاص نمبر کے حصول میں ناکام نہ رہ جائیں۔

ضروری گذارش ہے کہ

- ★ اپنے بقایاجات جلد ارسال کیجئے۔
- ★ اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہو تو اپنا زر تعاون جلد بھجوا دیجئے۔
- ★ نئے رفیقان شاعر اپنا زر سالانہ ارسال کرکے خاص نمبر کی رعایتی قیمت کا فائدہ اٹھائیں۔

سخن ہے بہرِ غزل

اعجاز صدیقی

شعارِ خودنگر و خودنما کو بند کرو
دکھاوے، فلسفہ و ادّعا کو بند کرو
دماغ کھول دو کھری حقیقتوں کیلئے
غرورِ شکوہ و نازِ نوا کو بند کرو
خود اپنے اپنے گریباں میں جھانکنا سیکھو
طریقِ تہمت و طعن و خطا کو بند کرو
یہ تم نہیں ہو کہ ناخواں ہیں جیسے گوشے
گداز سلسلۂ مرحبا کو بند کرو
لگی ہے آگ سماعت کے خشک صحرا میں
فغاں کو گھونٹ لو، حرفِ نوا کو بند کرو
نہیں ہے کوئی مریضِ ہوس کی ضد کا علاج
دعا سے ہاتھ اٹھا لو، دوا کو بند کرو
یہ چھیڑ طنز پہ گندہ ہے تو کافی ہے
برائے نام ہی رسمِ وفا کو بند کرو
ابھی تو روزنِ زنداں حیات سے کھلا
خودی کو گھونٹ دو اس میں انا کو بند کرو
یہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے ڈسنا کوئی زنا ہے!؟
ہوا پہ روک لگاؤ، گھٹا کو بند کرو
بصارتوں پہ ہی جائے بصیرتیں اندھی!
شعاعِ منبعِ نور و ضیا کو بند کرو
ہزار سلسلہ ہائے زبوں نکل آئیں
جو ایک سلسلۂ ناروا کو بند کرو!!
مناؤ جیب و گریباں کی اپنے خیر اعجاز
اس اپنی فکرِ جنوں آزما کو بند کرو

◆

کٹتا نہیں، ہر چند کوئی کاٹ رہا ہے
شاید مرا پیکر کسی پتھر کا بنا ہے
اکثر اسے پڑھ کر مجھے ہنسنا ہی پڑا ہے
جو کچھ مرے ہاتھوں کی لکیروں میں لکھا ہے
ڈھونڈے ہے بہانہ کوئی احساس کی لذت
لغزش تو سنبھلنے کے لئے حیلہ ہے
جو کچھ ہے وہ ہے اپنی ہی رفتار پہ موقوف
جنوں ہم سفر، وقت کی رفتار میں کیا ہے
ہم نام سا، ہم شکل سا، ہم صوت و صدا سا
مجھ سا ہی کوئی شخص مرے ساتھ رہا ہے
میں جنسِ گراں مایہ فرومایہ ہوں کیا ہوں؟
بازار کا ہر شخص مجھے دیکھ رہا ہے
کیا کہتی ہیں کیا کہتی ہیں سرگوشیاں ان کی!
یہ شہر جو کچھ روز سے بے لفظ و صدا ہے

◆

مہ رخوں، گل بدنوں، زہرہ جمالوں سے ملیں
جو کوئی پیار کا صحرا تو غزالوں سے ملیں
سینۂ مہر و وفا اور سبھے اور سجے
داغ کچھ اور ہمیں چاہنے والوں سے ملیں
راستوں کا نہیں ادراک ہے، منزل کا شعور
ہوں جو گمراہ، وہی قافلے والوں سے ملیں
کیوں کسی اور کے گھر جائیں یہ امواجِ بلا!
انہیں ملنا ہے تو ہم سے جیالوں سے ملیں
ہم نے جو حال میں کھینچے ہیں تحیر کے خطوط
نہیں ممکن، کہ وہ ماضی کی مثالوں سے ملیں
ہم جنوں پیشہ و نا عاقبت اندیش سہی!
پھر بھی لوگ آئیں، ہم آوارہ خیالوں سے ملیں
آج وہ طرۂ دستار بنے پھرتے ہیں
بے کمالی کے نشاں جن کے کمالوں سے ملیں
ظلمتِ جہل میں مانگے کا اجالا کہئے
جو خیالات کتابوں کے حوالوں سے ملیں
بازگشت اب بھی جوابوں کی ہے شرمندۂ گوش
فرصتیں کاش ہمیں اپنے سوالوں سے ملیں
چھپ کے بیٹھیں تو اندھیروں کا ہو احساس شدید
سامنے آئیں تو سوزِ غمِ اجالوں سے ملیں
ذہن کو چھوتی ہے اس طرح خیالات کی رو
مکڑیاں جیسے لپکتے ہوئے جالوں سے ملیں
جن کی تاریخِ جنوں ہے متلاشی اعجاز
وہ مثالیں تو ہماری ہی مثالوں سے ملیں

◆

نظامِ فکر نے بدلا ہی تھا سوال کا رنگ
جھلک اٹھا کئی چہروں سے انفعال کا رنگ!!
نہ گل کتروں کو میسر، نہ چاند تاروں کو
ترے وصال کی خوشبو، ترے جمال کا رنگ
نظر اشارہ کناں، لب حریفِ لفظ و صوت
وہ جذبِ شوق کا عالم، یہ عرضِ حال کا رنگ!!
ذرا سی دیر کو چہرے دمک تو جاتے ہیں!
خوشی کا رنگ ہو یا ہو غم و ملال کا رنگ!
بھریں تو اور ہوں گہرے، کھلیں تو اور ہوں تنگ
ہے ان دنوں یہی زخموں کے اندمال کا رنگ!
زمانہ اپنی کہانی سنا رہا تھا ہمیں
ابھر گیا مگر آغاز میں مآل کا رنگ!
کوئی زباں، کوئی طرزِ ادا نہ کام آئی
ہے لاجواب ابھی تک ہر اک سوال کا رنگ
پڑے ہوئے ہیں کشش و پنج میں ابھی مہرے
جما ہوا نہیں لگتا ابھی بحال کا رنگ
مرے ہی چاکِ گریباں سے رندِ شب کی نمود
مرے ہی اشک سے عبارت ہے ماہ و سال کا رنگ
اسیرِ وقت ہے تو، میں ہوں وقت سے آزاد
ترے عروج سے اچھا مرے زوال کا رنگ!
بیانِ تختۂ گل میری فکر ہے اعجاز
مثالِ قوسِ قزح ہے مرے خیال کا رنگ

[بمبئی ۲۷ فروری ۱۹۷۸ء ★ آگرہ ۱۹۸۳ء]

◆

لوگ کس لئے آخر، تھوڑی دوریوں چل کر، ساتھ ساتھ آئے ہیں
ہم تو خود ہی رہبر تھے، خود ہی اپنی منزل تھے، جب قدم اٹھائے ہیں
میکشو ابھی تک تو، بات صرف یہی ہے، رقصِ جام و مینا تک
ان کا ذکر بھی چھیڑو، جن کی مست نظروں نے، میکدے بنائے ہیں
ہم نقیبِ بیداری، ہائے رے یہ سرشاری، نیند آئی جاتی ہے
عارضوں کی رنگت ہے، انکھڑیوں کا جادو ہے، گیسوؤں کے سائے ہیں
میکدہ جب ان کا ہے، وضعِ میکشی ان کی، احتیاط کیا جانے
جام خوب چھلکائے، مستیاں بکھیری ہیں، خم پہ خم لنڈھائے ہیں
ہم سے آنسوؤں میں بھی، دلکشی نہیں پیدا، روشنی نہیں پیدا
مسکرانے والے تو، دار کی بلندی پر، جا کے مسکرائے ہیں
جو لبِ محبت پر آئے، اس کو آنے دیں، احتیاط رہنے دیں
دل کی وارداتوں میں، آپ لفظ و معنی کی، قید کیوں لگائے ہیں
دیکھنا فقط یہ ہے، ان میں اپنی رنگت ہے، ان میں اپنی خوشبو ہے
موسمِ بہاراں نے، پھول یوں تو کتنے ہی، باغ میں کھلائے ہیں
روشنی کے شیدائی، ہم بھی اور تم بھی ہو، فرق صرف اتنا ہے
تیرہ رہگزاروں میں، تم دیئے جلاتے ہو، ہم نے دل جلائے ہیں
ہر نفس ہے لرزیدہ، زندگی سے ہیں پیدا، تھرتھرا رہیں اعجاز
آج کل کی دنیا میں، آدمی نہیں شاید، آدمی کے سائے ہیں



وزیر آغا

۵۰، سول لائنز، سرگودھا، پاکستان

انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاری

انشائیہ کیا ہے؟ ہمارے ہاں پچھلے تیس برس سے اور مغرب میں کم و بیش پچھلے تین سو برس سے یہ بحث جاری ہے کہ انشائیہ کیا ہے مگر تا حال انشائیہ کی کوئی ایسی تعریف یا DEFINITION سامنے نہیں آسکی جو اس کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کر سکے۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ غلط نتیجہ اخذ کیا کہ انشائیہ بحیثیت صنف ادب ناقص ہے۔ کیوں کہ اس کی حدود متعین نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا دیگر اصناف ادب کی حدود کا تعین ممکن ہو سکا ہے؟ کیا ہم غزل یا افسانہ کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کیا ہیں؟ دوسرے لفظوں میں کیا ہم ان کی کوئی ایسی تعریف، وضع کر سکتے ہیں جو حتمی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر اشیاء اور مظاہر کو ہم پہچانتے تو ہیں مگر ان کو بیان نہیں کر پاتے۔ مثلاً میں آپ سے پوچھوں کہ نیلاہٹ کیا ہے تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟ یہی کہ میں اسے پہچانتا ہوں اور بآسانی اسے نشان زد کر سکتا ہوں مگر سوال یہ ہے کہ کیا آپ اسے بیان بھی کر سکتے ہیں؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ سو اصل بات یہ ہے کہ کیا آپ نے خیال، شے یا مظہر کو پہچان لیا ہے؟ نیکی، سچائی، حسن۔ ان میں سے کسی کی بھی حتمی تعریف ممکن نہیں لیکن پہچان بہر حال ممکن ہے۔ میں اپنے احباب سے یہ بات بار بار کہتا رہا ہوں کہ جس طرح آپ غزل کے ہزاروں اشعار میں سے صحیح غزلیہ شعر کو پہچان کر برملا کہہ اٹھتے ہیں کہ غزل کا شعر ہو گیا، اس طرح آپ تربیت، ریاضت، اور بار بار مطالعہ سے انشائیہ کو طنزیہ، مزاحیہ، فلسفیانہ، سائنسی یا دیگر وضع کے مضامین سے بآسانی الگ کر سکتے ہیں۔

اس دنیا میں ہر شے دوسری اشیاء سے جڑی ہوئی ہے اور ہر خیال ہزاروں دیگر خیالات کی ڈور سے بندھا ہوا ہے۔ لہٰذا جب آپ شے یا خیال کے بارے میں کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو ارد گرد کے ہزاروں پیش پا افتادہ خیالات اور پٹی پٹائی باتیں بھی آپ کی تحریر میں شامل ہو جاتی ہیں۔ یوں آپ کی اور یجنل سوچ کے راستے میں ایک قسم کی رکاوٹ یا BLOCKAGE نمودار ہو جاتا ہے۔ جب تک اس رکاوٹ کو دور نہ کیا جائے آپ پر موضوع کے ان چھوتے پہلو منکشف نہیں ہو سکتے۔ انشائیہ نگار کا اصل کام یہی ہے کہ وہ موضوع پر خود کو اس طور مرتکز کر لیتا ہے کہ ارد گرد کے موضوعات کی مداخلت بے جا نہیں ہونے لگتی ہے۔ پھر وہ موضوع کے ساتھ اس طور کھیلنے لگتا ہے جیسے وہ پہلی بار اس سے آشنا ہوا ہو۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو بچہ کا انداز نظر بھی انشائیہ نگار کا سا ہے کیوں کہ وہ بھی ارد گرد کی اشیاء اور مظاہر کو پہلی بار دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ بچہ تو براہ راست مظاہر کی نیرنگی کا ادراک کرتا ہے جب کہ انشائیہ نگار پہلے موضوع سے چمٹی ہوئی پیش پا افتادہ باتوں کے چھلکے کو اتارتا ہے۔ پھر اس کے ان چھوئے پرتوں تک رسائی حاصل کر کے بچے ہی کی طرح حیرت زدہ ہوتا ہے۔ یوں گویا وہ اپنے تخلیقی باطن کو برانگیخت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

آج سے کم و بیش بیس برس پہلے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام تھا:

ZEN AND THE ART OF MOTOR-CYCLE MAINTENANCE

مصنف کا نام تھا رابرٹ ایم پرسگ! سننے میں آیا ہے کہ یہ بیسویں صدی کی چند اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میں ایک جگہ یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ کسی امریکی پروفیسر نے اپنی کلاس کی ایک طالبہ سے امریکہ پر مضمون لکھنے کو کہا۔ چند روز بعد وہ طالبہ پروفیسر موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ وہ مضمون نہیں لکھ سکی۔ کیوں کہ اسے امریکہ کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں سوجھی جو پہلے سے معلوم نہ ہو۔ تب پروفیسر موصوف نے اس طالبہ سے کہا۔ اچھا! اگر یہ بات ہے تو اپنے موضوع کی طنابیں کھینچو اور امریکہ کے بجائے اپنے شہر پر مضمون لکھ لاؤ۔ چند روز کے بعد وہ طالبہ آئی اور کہا اب کی بار بھی اسے کوئی نئی بات نہیں سوجھی۔ اس پر پروفیسر صاحب جز بز ہوئے۔ اور طنزاً کہا کہ اگر تم اپنے شہر پر بھی مضمون نہیں لکھ سکتیں تو شہر کے اوپیرا ہاؤس کے صدر دروازے پر اپنی

توجہ مرکوز کرو اور اس کے بائیں جانب کی اینٹوں کو موضوع بنالو۔ یہ کہہ کر پروفیسر موصوف مسکرائے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ تاہم چند ہی روز کے بعد وہی طالبہ پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ایک مضمون لکھ لائی۔ کہا کہ میں نے چند سطریں پہلی اینٹ پر، مزید چند سطریں دوسری اینٹ پر لکھنے کے بعد جب تیسری اینٹ پر لکھنے کا آغاز کیا تو گویا دریا کا بند ٹوٹ گیا اور ان چھوئے خیالات کے ایک سیل رواں نے آگے بڑھ کر مجھے شرابور کر دیا۔ دیکھا جائے تو اس طالبہ نے وہی طریق اختیار کیا تھا جو ایک انشائیہ نگار کرتا ہے۔ انشائیہ نگار بھی شے یا خیال کو اس کے ماحول سے کاٹ کر مقصود بالذات قرار دیتا اور یوں قطرے میں دجلہ دریافت کرتا ہے۔ اس کام کے لئے وہ پٹے ہوئے اور پامال طریق کار کو ترک کر کے ایک نیا زاویہ نگاہ اختیار کرتا ہے۔ مثلاً وہ شے یا موضوع کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو جاننے کے لئے یا تو اپنی جگہ سے سرک کر اسے دوسری جانب سے دیکھتا ہے یا پھر شے یا خیال کو اس کی متعین جگہ سے ہٹا کر اس کے عقبی دیار پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ دونوں باتوں کا ایک ہی مقصد ہے یعنی موضوع کے ان دیکھے پہلوؤں تک رسائی! اس نکتے کو بیان کرنے کے لئے میں نے انشائیہ پر لکھے گئے اپنے مضامین میں متعدد مثالوں سے کام لیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ فرض کیجئے آپ دریا کے ایک کنارے سے اس کے دوسرے کنارے کو سال ہا سال سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ لہٰذا ایک مستقل نوعیت کی تصویر آپ کے ذہن پر مرتسم ہو چکی ہے۔ اب آپ کسی روز دوسرے کنارے پر جا نکلیں اور وہاں سے پہلے کنارے کو دیکھیں یا دوسرے کنارے ہی کو دیکھیں تو آپ کو ایک بالکل نیا منظر دکھائی دے گا اسی طرح بچپن میں لڑکے بالے اکثر اوقات جھک کر اپنی ٹانگوں میں سے ماحول کو دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ انہیں ہر روز کا دیکھا بھالا منظر بالکل بدلا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے۔ عام زندگی میں دیکھئے کہ آپ جب کسی میدان کو ہموار سطح سے دیکھتے ہیں تو آپ کو اس کا محض ایک بعد DIMENSION نظر آتا ہے لیکن اگر آپ قریبی پہاڑ پر سے اسی میدان پر نظر دوڑائیں۔ تو آپ کو ایک اور ہی منظر دکھائی دے گا۔ تو احرف یہ ہے کہ آپ اپنی مقررہ جگہ سے سرک جائیں۔ یہی انشائیہ نگار بھی کرتا ہے۔ وہ روایت، عادت اور انا کی دیواروں کو پار کر کے جب ایک بچے کی سی حیرت آمیز مسرت کے ساتھ اپنے ماحول کو دیکھتا ہے تو اسے وہ سب کچھ نظر آ جاتا ہے جو سر پر بھاری عمامہ رکھے، ناک کی سیدھ میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے بزرگوں کو کبھی دکھائی نہیں دے سکتا۔

بات کی وضاحت کے لئے میں اردو کے ایک انشائیہ "آندھی" کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں "آندھی" سامنے کا ایک موضوع ہے۔ جب آپ اس پر کچھ لکھیں گے تو معلوم کو اف ہی کا سہارا لیں گے مثلاً یہ کہ جب کسی علاقے میں ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے تو اس سے ملحقہ علاقے سے جہاں ہوا کا دباؤ زیادہ ہو۔ ہوا کے تند و تیز ریلے امڈ آتے ہیں اور اپنے سفر کے دوران مٹی ریت اور جھاڑ جھنکار بھی اٹھا لاتے ہیں۔ اسے ہم "آندھی" کہتے ہیں یا یہ کہ آندھی سے بہت نقصان ہوتا ہے، چھتیں اڑ جاتی ہیں، درخت گرتے اور انسان مر جاتے ہیں وغیرہ۔ اب اگر آپ آندھی سے کوئی مزاحیہ صورت حال پیش کرنے کے موڈ میں ہوں تو آپ وہی رویہ اختیار کریں گے جو برسات کے سلسلے میں نظیر اکبر آبادی نے کیا تھا۔ اس نے برسات سے پیدا ہونے والی مضحک صورت حال پر نسبتاً زیادہ توجہ مبذول کی تھی اس کی نظم کا ایک بند مجھے یاد آ رہا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے لکھا تھا

کرتی ہے گرچہ سب کو پھسلنی زمین خوار   عاشق کو پر دکھاتی ہے کچھ اور ہی بہار
آیا جو سامنے کوئی محبوب گلعذار   گرنے کا مکر کر کے اچھل کو دا ایک بار
اس شوخ گل بدن سے لپٹ کر پھسل پڑا

اس طرح جب آندھی کے موضوع پر طنزیہ یا مزاحیہ لہجہ ابھارنا مقصود ہو تو آپ رستم کیانی مرحوم کا تتبع کر سکتے ہیں۔ ایک بار جب کیانی صاحب جھکر گئے جو آندھیوں کے لئے بدنام ہے تو انہوں نے ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جھکر کے بارے میں یہ کیسی غلط بات مشہور ہے کہ یہاں آندھیاں بہت آتی ہیں۔ حالانکہ میرا یہ تجربہ ہے کہ جھکر میں سال بھر کے دوران صرف ایک بار آندھی آتی ہے جو اپریل سے شروع ہو کر اکتوبر تک جاری رہتی ہے

انشائیہ کا میدان طنزیہ، مزاحیہ یا معلوماتی طرز کے مضامین سے قطعاً مختلف ہے۔ چنانچہ میں نے "آندھی" کے موضوع پر لکھے گئے جس اردو انشائیہ کا اوپر ذکر کیا ہے اس میں آندھی کو طنز یا مزاح کے لئے استعمال نہیں کیا گیا بلکہ آندھی کو مقصود بالذات قرار دے کر اس سے انشائی نکات پیدا کئے گئے ہیں مثلاً

(۱) آندھی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ یہ آپ کی توجہ کو بیرونی مظاہر سے ہٹا کر اندر کی روشنی پر مبذول کراتی ہے۔ یہ جو عرب، ایران، ہندوستان اور چین نے زندگی اور کائنات کے بارے میں فلسفیانہ موشگافیاں کیں۔ کیا ان کا باعث ان ممالک کے لوگوں کی بعض غیر معمولی صلاحیتیں تھیں؟ ہرگز نہیں۔ ان کا باعث صرف یہ تھا کہ قدرت ان ممالک کو قرن ہا قرن تک آندھیوں سے نوازتی رہی اور اس کے باسیوں کی ظاہری آنکھوں میں خاک جھونک کر انہیں اپنے "اندر" کی تیرہ و تار دنیا کو منور کرنے پر اکساتی رہی۔

۲۔ آندھی فطرت کی جاروب کش ہے۔ اس کا کام تیزی اور پھرتی سے کوہ و صحرا، شہر و دیہات اور باغ و راغ کو ہر طرح کے خس و خاشاک سے پاک صاف کرنا ہے۔ ہمارے شہروں کے میونسپل کمشنروں کو آندھی کے طریق کار سے سبق لینا چاہیئے۔

۴۔ آندھی کی برکتیں ان گنت ہیں۔ آندھی کے تھپیڑے تصنع اور فریب کے سارے پردوں کو چاک کرتے اور ہر شے کی اصلیت کو ننگا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ مبلک ساران ساحل کو شاید یہ بات پسند نہ آئے لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ شخصیت کی تکمیل آندھی کے بے رحم تھپیڑوں ہی کی رہین منت ہے اور جس شخص کی زندگی میں کبھی آندھی نہیں آئی اس کی حالت قابل رحم اور اس کی ذہنی پختگی محل نظر ہے۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح انشائیہ نگار نے ہمیں تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر آندھی کی معنیاتی توسیع کی ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اس کے لئے مزاح یا طنز قطعًا ممنوع نہیں ہے۔ اس نے انشائیہ میں بقدر ضرورت ان کو بھی برتا ہے مگر اس طور کہ نتیجے میں تبسم زیر لب نے جنم لیا ہے نہ کہ خندۂ بے باک نے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو انشائیہ کا کام موضوع پر سے متعین معانی کے میلے کچیلے برتوں کو نوچ کر الگ کرنا تھا تاکہ نئے مفاہیم کی آمد کا راستہ ہموار ہو سکے۔ انشائیہ آندھی، میں یہ کام انجام دینے کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔

اس سلسلے میں انشائیہ کو طنزیہ اور مزاحیہ سے ممیز کرنا بھی ضروری ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ طنز نگار ہمیشہ بلندی پر سے نشیب پر ایک نظر ڈالتا ہے جہاں اسے ناہمواریاں ہی ناہمواریاں نظر آتی ہیں۔ دراصل نشیب بجائے خود ایک ناہمواری یا گڑھا ہے جو زمین کی ہموار سطح سے منقطع ہونے کے باعث وجود میں آتی ہے۔ سو طنز نگار اس ناہمواری کو خندۂ استہزا میں اڑاتا ہے تاکہ سطح دوبارہ ہموار ہو جائے۔ طنز نگار کے ہاں احساس تفاخر نمایاں اور ایذا رسانی کا جذبہ غالب ہوتا ہے وہ جس چیز سے نفرت کرتا ہے اسے بیخ و بن سے اکھیڑ دینا چاہتا ہے تاکہ معاشرہ از سر نو صحت مند ہو سکے۔ دوسری طرف مزاح نگار نشیب میں خود کو لا کھڑا کرتا ہے یعنی خود ایک ناہمواری بن کر دوسروں کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ اس پر ہنسیں۔ جس مضمون میں طنزیہ انداز غالب اور معنی کے ذریعے اصلاح احوال مطلوب ہو اسے ہم طنزیہ مضمون کہیں گے۔ دوسری طرف جس مضمون میں مزاحیہ انداز نمایاں اور آسودگی بہم پہنچانا مقصود نظر ہو اسے مزاحیہ مضمون کا نام دیں گے۔ انشائیہ ان دونوں سے مختلف چیز ہے۔ اس کا مقصد نہ تو اصلاح احوال ہے اور نہ وہ قہقہہ اگلوا کر اور یوں اندر کی فاضل اسٹیم کو خارج کر کے آپ کو آسودگی یا RELIEF مہیا کرنے کا متمنی ہے۔ انشائیہ اسلوب کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ انشائیہ میں انشاء کا عنصر بجائے خود اس بات پر دال ہے کہ انشائیہ اسلوب کی تازگی پر زور دینا چاہتا ہے اور اس کام کے لئے وہ مزاح اور اس کے امثال کے علاوہ تشبیہ، استعارہ، نیز اس سارے مواد کو بقدر ضرورت استعمال کرتا ہے جو اچھی ادبی نثر کا امتیازی وصف ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں کہ انگلستان میں انگریزی زبان کی لطیف ترین کروٹوں اور کیفیتوں سے طلبا کو آشنا کرنے کے لئے لائٹ ایسے یا انشائیہ کو بطور خاص نصاب میں شامل کرنے کی روش عام ہے۔ آج سے چند برس پہلے ہمارے یہاں ایف۔ اے کے کورس میں انشائیے بھی شامل کئے گئے تھے جو ایک بہت اچھی بات تھی مگر بوجوہ اس روایت کو مستحکم ہونے سے روک دیا گیا اور نصاب سے انشائیے حذف کر دیئے گئے۔ اب جامعہ پشاور نے انشائیہ کو اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں شامل کر کے ایک ایسی عمدہ مثال قائم کی ہے جو دوسری یونیورسٹیوں کے لئے بھی قابل تقلید ہے۔ اس جملۂ معترضہ کے لئے معذرت خواہ ہوں مگر میں اس بات پر بہر حال زور دوں گا کہ انشائیہ وہ واحد نثری صنف ہے جو زبان کی صلاحیت کا امتحان بھی ہے اور زبان کے ارتقاء کا باعث بھی! یہ تو ہوئی اسلوب کی بات۔ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین سے انشائیہ اسلوب کے علاوہ اپنے رویے کے بنا پر بھی مختلف ہے کیوں کہ جہاں طنزیہ مضمون ایک ROD OF CORRECTION بن کر ابھرتا ہے اور مزاحیہ مضمون اعصابی تسکین بذریعہ ہنسی مہیا کرتا ہے وہاں انشائیہ، شاعری اور افسانے کی طرح، جمالیاتی چکا چوند ہم پہنچاتا ہے۔ شاعری یا افسانے کے ذریعے ایسا کرنا آسان ہے۔ کیوں کہ ان میں سے اول الذکر جذبات اور محسوسات کے جزر و مد کا سہارا لیتا ہے جب کہ موخر الذکر کہانی کے اتار چڑھاؤ کو بروئے کار لاتا ہے مگر انشائیہ نہ تو شاعری ہے اور نہ افسانہ! وہ تو غیر افسانوی نثر کو ادبی درجہ عطا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ دوسرے لفظوں میں انشائیہ کا کام "مضمون" کے پیکر کو شعر اور افسانہ کے پیکر کا ہم پلہ بنانا ہے اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ اس ضمن میں مختلف انشائیوں سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جو اپنے اندر چکا چوند پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یعنی قاری کو معنی کی عام سطح سے معانی کی ایک لطیف تر سطح کی طرف جست بھرنے پر اکساتے ہیں۔

۔۔ مردی طبقہ نسواں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے اس کا سارا نظام مادری ہے اس میں وہی شفقت، تحمل، سپردگی اور ملائمت ہے جو عام طور پر

خواتین میں پائی جاتی ہے اس کے برعکس سرما کا سارا انتظام پدری ہے یہ باپ کی طرح قدم قدم پر آپ کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے آپ جب ذرا اس کے وجود سے صرف نظر کرتے ہیں تو یہ آپ کو ڈانٹ پلاتا ہے اور کبھی کبھی ایسا سلوک کرتا ہے کہ سردی کا سارا لطف اور مادرانہ شفقت یاد آجاتی ہے ۔ ———— (سردی)

"شور ایک تیزابی طوفان کی طرح ہے جو سیلاب کی طرح آتا ہے اور ہر امن گرد و پیش کو لپیٹ میں لے لیتا ہے اس کے برعکس خاموشی اگربتی کی خوشبو کی طرح ہے جو خود جلتی ہے لیکن دوسروں کو معطر کر دیتی ہے ۔ (شور)

"ہمارا یہ کرۂ ارض ایک طویل و عریض پلیٹ فارم ہی تو ہے جسے بنی نوع انسان نے انوکھے رنگوں، رسیلی زبانوں، خوبصورت نسلوں اور دلکش ثقافتوں سے مزین کیا ہوا ہے ۔ زمین پر ہی کیا موقوف، یہ چاند اور لاتعداد ستارے جو خلا کے بسیط میں معلق ہیں، انگنت پلیٹ فارم ہی تو ہیں ۔ زمین سے چاند کی طرف سفر کرنے کا عمل دراصل ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر قدم جمانے ہی کا عمل ہے اگر دیکھا جائے تو ہمارے جسم روح کے لئے، دماغ خیالات کے لئے اور لب بولوں کے لئے پلیٹ فارم ہی کا درجہ رکھتے ہیں جہاں وہ کچھ دیر قیام کرتے ہیں، پھر رخصت ہو جاتے ہیں ۔"

"غزل نے قصیدے کی پسلی سے جنم لیا ہے ۔ پسلی سے پیدا ہونا اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے ۔ نہ جانے کب سے غزل بے چاری قصیدے کے قید میں تھی ۔ بالکل جیسے داستان کی نرم و نازک شہزادی ہیبت ناک دیو کے طلسم میں گرفتار ہو گئی تھی مگر یہ قید و بند والی بات بھی شاید درست نہیں کیوں کہ غزل تو قصیدہ کا اٹوٹ انگ تھی ۔ اس کی لاتعداد پسلیوں ہی سے ایک پسلی تھی مگر ایک روز یہ پسلی قصیدے کے ڈھانچے سے منحرف ہو گئی ۔ اس نے سوچا بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ہر وقت زمین بوس ہوتے چلے جاؤ ۔" (غزل)

"ایک اچھی گاڑی ہر لحظہ ڈرائیور سے ہم کلام ہوتی ہے ۔ اس پر جو کچھ گزر رہا ہوتا ہے ۔ اس پر جو کچھ گزرنے والا ہوتا ہے وہ سب کچھ با آواز بلند بتا رہی ہوتی ہے ۔ صرف اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ جتنے ناز نخرے ہم نئی گاڑیوں کے اٹھاتے ہیں اتنے اگر پرانی گاڑیوں کے اٹھانے لگیں تو وہ مسلسل سڑک پر رہیں ۔ ورکشاپ نئی گاڑی کا نخرہ ہے اور پرانی گاڑی کی مجبوری! نئی گاڑی تو خود ہم پر سوار ہوتی ہے جب کہ پرانی گاڑی پر ہم خود سوار ہوتے ہیں ۔ (نئی پرانی گاڑیاں)

"انسان کتنا بھولا ہے ۔ اسے اتنا بھی علم نہیں کہ یہ سارا جہانِ ہوش ربا اور یہ ساری خلق خدا، اس صدائے بازگشت کا ایک روپ ہے جو صدائے کُن کی صورت نمودار ہوئی تھی لیکن جو آج تک بے آواز ہے البتہ کسی روز یہ صدائے بازگشت صور اسرافیل بن کر پلٹے گی تو پھر شاید اسے اس کے وجود کی خبر ہو سکے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ ہماری چار دن کی زندگی فقط "کن" اور "صور" کے درمیانی وقفے کا نام ہے کیا واقعی ہے؟ (صدائے بازگشت)

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انشائیہ کا مسلک آزاد روی ہے ۔ وہ شاہراہ پر سفر کرنے کو ناپسند کرتا ہے ۔ لہٰذا بار بار شاہراہ کو ترک کر کے چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر سفر کرتا دکھائی دیتا ہے ۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ اپنے عمل سے خود ہی ایک نئی پگڈنڈی ترکشتا ہے ۔ شاہراہ پر چلنے والے کی نظر میں پگڈنڈی اختیار کرنا وقت کا ضیاع ہے ۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے توجہ زندگی کے "عظیم مقاصد" سے ہٹ کر چھوٹی چھوٹی باتوں پر مرکوز ہو جاتی ہے مگر انشائیہ نگار کا کہنا ہے کہ اس کائنات میں اکبر و اصغر MACRO اور MICRO میں حد فاصل قائم کرنا ایک بے معنی بات ہے کیوں کہ یہاں جز بھی اتنا ہی بے کراں ہے جتنا کہ کل! اور معمولی شے کو بھی کسی دوسرے زاویے سے دیکھیں تو وہ غیر معمولی دکھائی دیتی ہے ۔ ہم انسانوں نے اپنے تحفظ کے لئے ہر طرف قاعدوں، اصولوں، عقیدوں اور نظریوں کی دیواریں استوار کی ہیں ۔ ان کی اہمیت سے انکار نہیں ہے ۔ مگر انشائیہ نگار کا کہنا ہے کہ اگر اب ان دیواروں میں روزن نہیں بنائیں گے تو تازہ ہوا کی کمی کے باعث آپ کا سانس رکنے لگے گا ۔ دیکھا جائے تو انشائیہ بجائے خود ایک روزن ہے جس سے لگ کر آپ نہ صرف باہر کی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ جس کے ذریعے آپ باہر کی وسیع و بے کنار دنیا سے بھی متعارف ہوتے ہیں ۔ کسی شے کو دیکھنا اسے اوڑھ لینے کے مترادف ہے ۔ سو جب انشائیہ نگار روزن میں سے باہر کی دنیا دیکھتا ہے تو اسے گویا اوڑھ لیتا ہے یوں وہ اپنے بندی خانے سے آزادی پاتا ہے ۔ وہ نہ صرف خود آزاد ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو آزادی

حاصل کرنے کا راستہ بھی دکھاتا ہے اگر کوئی صنف ادب قید و بند سے رہائی کا ایسا اچھا انتظام کر سکے تو اس سے زیادہ جاندار صنف اور کیا ہو سکتی ہے طرفہ یہ ہے کہ انشائیہ ایک ایسا روزن ہے جس کا رخ باہر کے علاوہ اندر کی طرف بھی ہے۔ لہٰذا انشائیہ نہ صرف کائنات اکبر کی سیاحت کرنے میں کامیاب ہے بلکہ کائنات اصغر کی غواصی پر بھی قادر ہے۔ دونوں صورتوں میں اسے شے، شخصیت اور شاہراہ کی قید سے رہائی ملتی ہے۔

اوپر میں نے انشائیہ کو طنزیہ مزاحیہ مضامین سے ممیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں چند الفاظ میں انشائیہ اور عام مضمون کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ عام مضمون سے میری مراد تنقید، تاریخ، سائنس یا سیاست کے موضوع پر لکھا گیا مضمون نہیں بلکہ عام سے غیر رسمی اور بظاہر غیر اہم موضوعات پر قلم بند کی گئی تحریر ہے۔ طنزیہ یا مزاحیہ مضمون کو انشائیہ سے الگ کر کے دکھانا نسبتاً آسان تھا مگر غیر رسمی موضوع پر لکھے گئے مضمون کو انشائیہ سے الگ کر کے دکھانا قدرے مشکل ہے کیونکہ دونوں کا میدان ایک ہے تاہم انداز نظر کا فرق اتنا زیادہ ہے کہ دونوں کو ایک ہی زمرے میں شامل کرنا ممکن نہیں ہے سرسید اور ان کے رفقا نے جو مضامین لکھے ان کے موضوعات تو تقریباً اسی وضع کے تھے جو انشائیہ نگار کو مرغوب ہے مگر مزاجاً یہ مضامین ESSAYS کے تحت شمار ہو سکتے ہیں نہ کہ LIGHT-ESSAYS کے تحت جن میں موضوع کو منطقی طور پر نہیں بلکہ تخلیقی طور پر اجاگر کیا جاتا ہے میں اس سلسلے میں ایک ہی موضوع پر لکھے گئے ایک ESSAY اور ایک LIGHT ESSAYS سے چند اقتباسات مثالاً پیش کر کے اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

منشی پریم چند نے زمانہ (دسمبر ۱۹۰۹ء) کے شمارہ میں "گالیاں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انواع و اقسام کی گالیوں کی فہرست پیش کر کے دشنام طرازی کی وبا کی مذمت کی تھی۔ اس مضمون سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"اس سے بڑھ کر ہمارے قومی کمینہ پن اور نامردی کا ثبوت نہیں مل سکتا کہ جن گالیوں کو سن کر ہمارے خون میں جوش آ جانا چاہئے۔ ان گالیوں کو ہم دودھ کی طرح پی جاتے ہیں۔ یہ بھی قومی زبان کی ایک برکت ہے۔ قومی پستی دلوں کی عزت اور خودداری کا احساس مٹا کر آدمیوں کو بے غیرت اور بے شرم بنا دیتی ہے"

"غصہ میں ہم گالی بکیں، دل لگی میں ہم گالی بکیں، گالیاں بک کر زور لیاقت ہم دکھائیں، گیت میں گالی ہم گائیں، زندگی کا کوئی کام ان سے خالی نہیں۔"

"حق تو یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے رہنماؤں نے اس وبائے عام کی بیخ کنی کرنے کے لئے سرگرم کوشش نہیں کی۔۔۔۔۔۔ اس امر کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ گالیوں کا اثر ہمارے اخلاق پر بہت خراب پڑتا ہے۔ گالیاں ہمارے نفس کو مشتعل کرتی ہیں اور خودداری اور پاس عزت کا احساس دلوں سے کم کرتی ہیں جو ہم کو دوسری قوموں کی نگاہوں میں وقیع بنانے کے لئے ضروری ہے۔"

غور کیجئے کہ منشی پریم چند کے اس مضمون میں سرسید کی آواز کتنی صاف اور واضح سنائی دے رہی ہے۔ پریم چند نے موضوع کا انتہائی سنجیدگی سے، منطقی انداز میں جائزہ لیا ہے اور موضوع کے بارے میں وہ سارے حقائق پیش کر دیئے ہیں جو ہمیں پہلے سے معلوم نہیں اس پر مستزاد یہ کہ گالیوں کی بیخ کنی کے لئے ایک پنج سالہ قومی منصوبہ کی بھی سفارش کر دی ہے۔ یہ تمام باتیں انشائیہ کے مزاج اور اسپرٹ کے منافی ہیں۔

منشی پریم چند نے یہ مضمون ۱۹۰۹ء میں لکھا تھا۔ اس کے تقریباً ستر برس بعد اسی موضوع پر غلام جیلانی اصغر نے ایک انشائیہ لکھا۔ اس انشائیے سے میں چند اقتباسات پیش کرتا ہوں تاکہ مضمون اور انشائیہ کا فرق واضح ہو سکے۔

"گالی دینے کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی گالی دے کر فارغ ہو جاتا ہے۔ اور ذہنی طور پر ایک خوشگوار آسودگی محسوس کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ اعصاب کا کھچاؤ دور ہو جاتا ہے اور دل کی گہرائیوں میں بہجت اور سرور کا عالم ہوتا ہے۔ پنجاب میں جو آپ کو ہشاش بشاش مونچھیں، بڑھا پیٹ اور بڑھکیں مارتے ہوئے چہرے نظر آتے ہیں تو دراصل اس کی وجہ منہ بھر کی وہ گالی ہے۔ جس پر تمام ویلا اور حکیم زور دیتے ہیں۔"

"گالی جتنی سقیم اور کمزور ہو گی۔ گالی دینے والے کی شخصیت اتنی ہی گھٹی گھٹی ہو گی۔ گالی جتنی پر وقار اور پر زور ہو گی شخصیت میں اتنا ہی وقار اور کشادگی ہو گی۔ چھوٹا آدمی ڈرتے ڈرتے چھوٹی سی گالی دیتا ہے اور فوراً اپنی ذات کے ڈربے میں چھپ جاتا

> لیکن بڑا آدمی موٹی سی گالی کی کمند پھینک کر اسے دلدل سے باہر کھینچ لاتا ہے ۔"
>
> "گالی دینے سے جمہوریت کو فروغ ملتا ہے ۔ آمریت صرف اسی دور میں پنپ سکتی ہے جب گالیوں پر قدغن لگادی جائے ۔ اسی لئے ایک اچھے نظام میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر ہائیڈ پارک کی گنجائش رکھتا ہے ۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح جب ایک ہی موضوع کسی سنجیدہ مضمون نگار کے ہاتھوں سے نکل کر ایک آزاد طبع انشائیہ نگار کے ہاتھوں میں آیا تو اسلوبِ اظہار کے ساتھ ساتھ اسلوبِ خیال بھی تبدیل ہو گیا ۔ منشی پریم چند اپنے موقف کے سلسلے میں بے حد سنجیدہ ہیں ۔ ان کی جگہ کوئی مزاح نگار ہوتا تو انتہائی غیر سنجیدہ ہو جاتا مگر انشائیہ نگار کا کام یہ ہے کہ وہ سنجیدگی اور غیر سنجیدگی کی ملتی ہوئی سرحد پر چہل قدمی کرتا ہے ۔ یہ گویا پل صراط پر چلنے کا انداز ہے وہ موضوع کے ساتھ گویا کھیلتا ہے ۔ ایک ہی وقت میں موضوع کی ناہمواری کو بھی نشان زد کرتا ہے اور اس کے گہرے مفاہیم کو بھی ۔ غلام جیلانی اصغر نے اپنے انشائیہ "گالی دینا" میں یہی انداز اختیار کیا ہے ۔ چنانچہ جب ہم انشائیہ پڑھ چکتے ہیں تو گالیوں کی قابلِ مذمت بالائی سطح اور اس کے علاوہ نظام کے ساتھ ساتھ ہم پر اس کے گہرے مطالب اور نئے بہت بھی عیاں ہونے لگتے ہیں ۔ یوں ہم گالی کے روشن پہلوؤں تک رسائی پا کر اپنے پیش پا افتادہ روایتی ، اصلاحی اور اخلاقی اندازِ نظر پر غور کرنے لگتے ہیں ۔ انشائیہ ہنسنے ہنسانے کے عمل یا پند و نصائح کے کاروبار سے آگے کی چیز ہے جو انسانی فکر و عمل کو ایک نئے زاویے سے دیکھتی اور نتیجۃً ہمیں آگاہی کے ارفع مدارج تک لے جانے میں کامیاب ہوتی ہے ۔

اردو میں مضمون نگاری کا آغاز کرنے والوں میں سرسید احمد خان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے مگر خود سرسید اس سلسلے میں مغرب کی مضمون نگاری سے متاثر تھے ۔ سرسید کے زمانے کی مغربی ادبیات میں مضمون نگاری نے تین واضح صورتیں اختیار کر رکھی تھیں ۔ ایک صورت تو علمی اور سائنسی یا اصلاحی مضامین کی تھی ، دوسری طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی اور تیسری لائٹ ایسے کی جس میں مضمون نگاروں نے غیر افسانوی نثر کو ادب کی سطح تفویض کر دی تھی ۔ سرسید نے ان میں سے علمی اور اصلاحی طرز کو اردو میں رائج کیا اور جہاں غیر رسمی موضوعات پر اظہارِ خیال کیا وہاں بھی زیادہ تر منطقی اندازِ ہی کو اپنایا ۔ لہٰذا انہیں ہم اردو میں لائٹ ایسے یعنی انشائیہ کا موجد یا علم بردار نہیں کہہ سکتے ۔ تاہم اردو نثر کے فروغ کے سلسلے میں سرسید کی عطا سے انکار ممکن نہیں ہے ۔ آج اگر اردو نثر نے اپنے اندر علمی ، سائنسی اور تنقیدی نظریات کو پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے تو یہ سرسید کی اولین مساعی ہی کا نتیجہ ہے ۔ دوسری طرف طنزیہ مزاحیہ مضامین کو اردو میں رواج دینے کے ضمن میں زیادہ اہمیت اودھ پنچ اور اس کے معاونین کو حاصل ہے ۔ گو اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ان لوگوں نے زیادہ تر پھکڑپن اور ہجویہ انداز ہی کو فروغ دیا ۔ بعد ازاں اردو میں طنزِ لطیف اور مہذب اور مزاح ایک مثالی انداز میں نمودار ہوا ۔ اور یہ سلسلہ ہمیں فرحت اللہ بیگ ، فلک پیما ، رشید احمد صدیقی ، پطرس ، کنھیا لال کپور اور امتیاز علی تاج سے لے کر مشتاق احمد یوسفی تک صاف دکھائی دیتا ہے ۔ مضمون نگاری کی ان دونوں صورتوں کے بین بین خالص انشائیہ کی روش تھی جسے بعض ادیبوں نے غیر شعوری طور پر اپنانے کی کوشش تو کی مگر شاید ابھی ذریعۂ اظہار یعنی اردو نثر اس سطح پر نہیں پہنچ پائی تھی کہ انشائیہ کے لطیف نکات کو گرفت میں لے سکتی یا شاید خود لکھنے والوں کے ہاں ابھی انشائیہ کا مزاج واضح نہیں تھا کہ انہوں نے اپنے مضامین میں یہاں وہاں انشائی نکتے تو پیدا کئے مگر کوئی مکمل انشائیہ لکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ اس سلسلے میں بہت سے نام گنوائے گئے ہیں ۔ یہاں تک کہ بعض کرم فرماؤں نے ملا وجہی کو بھی نہیں بخشا اور اس کی کٹی پھٹی نثر پر بھی انشائیہ کا قشقہ لگا دیا ہے ۔ دیگر جن لکھنے والوں کے نام لئے گئے ہیں ان میں محمد حسین آزاد ، مولوی نذیر احمد دہلوی ، الطاف حسین حالی ، مولوی ذکاء اللہ دہلوی ، رتن ناتھ سرشار ، وحید الدین سلیم ، عبدالحلیم شرر اور ان کے بعد نیاز فتح پوری ، شیخ عبدالقادر مہدی افادی ، ناصر علی دہلوی ، سجاد انصاری ، سجاد حیدر یلدرم ، خواجہ حسن نظامی ، ابوالکلام آزاد اور بعض دیگر اکابرین کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ مگر دیکھا جائے تو ان لکھنے والوں میں بھی ناصر علی دہلوی ، سجاد انصاری ، خواجہ حسن نظامی اور ابوالکلام آزاد ہی ایسے ادیب تھے جن کے ہاں انشائیہ کے مخصوص مزاج اور اسلوب کی طرف پیش قدمی کے شواہد ملتے ہیں ۔ یہ وہ لوگ تھے جو انشائیہ نگار بنتے بنتے رہ گئے ۔ وجوہ وہی تھیں جن کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ۔

ایک بات کا ذکر کر دوں ۔ یہ ادیب جن کا جھکاؤ لائٹ ایسے کی طرف تھا ، انہیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ غیر شعوری طور پر کس سنہری چڑیا کو زیرِ دام لانے کے متمنی ہیں ۔ اسی طرح پاکستان کے وجود میں آنے سے ذرا قبل کرشن چندر ، فلک پیما اور رشید احمد صدیقی ابھرے جن کے ہاں بھی انشائیہ نویسی کا رجحان شعوری سطح پر موجود نہیں تھا ۔ گو ان کے مضامین میں انشائی عناصر یقیناً موجود تھے ۔ اسی زمانے میں اختر اورینوی وہ پہلا ادیب تھا جس نے لوگوں کو شعوری طور پر لائٹ ایسے کے مزاج سے آشنا کرنے کی کوشش کی ، اختر اورینوی نے

علی اکبر قاصد کے مضامین کا تجزیہ پیش کیا یا تحریر کیا اس میں پہلی بار نہ صرف لائٹ ایسے کے مقتضیات کے بارے میں کھل کر لکھا بلکہ لائٹ ایسے کے لئے انشائیہ کا لفظ بھی استعمال کیا مگر جن مضامین (یعنی علی اکبر قاصد کے مضامین) پر اس نے لفظ "انشائیہ" چسپاں کرانے کی کوشش کی وہ عام سے طنزیہ مزاحیہ مضامین تھے۔ جن کا انشائیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختر اورینوی انشائیہ کے مقتضیات کو پیش کرنے پر تو قادر تھا۔ لیکن انشائیہ کو پہچاننے میں کامیاب نہ ہوا۔ اسی لئے اس کا تجویز کردہ لفظ "انشائیہ" بھی اس زمانے میں مقبول نہ ہو سکا۔

تقسیم کے فوراً بعد (بالخصوص پاکستان میں) انشائیہ نویسی کا رجحان اپنے واضح خدوخال کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس زمانے میں نظیر آغا، داؤد رہبر، جاوید صدیقی، ممتاز مفتی اور امجد حسین کے ایسے مضامین سامنے آئے جن میں سے بعض انشائیہ کے اولین نمونے تھے۔ گو ان ادبا کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ صنف انشائیہ میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ دراصل یہ لوگ اپنی ترنگ میں اشیاء، تجربات اور تعلقات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے مگر اس کے نتیجے میں ان کے ہاں جو تحریریں جنم لے رہی تھیں وہ مغرب کی مقبول صنف ادب یعنی لائٹ ایسے یا انشائیہ کے زمرے میں شامل تھیں۔ خود راقم الحروف کو اس بات کا اعتراف ہے کہ نظیر آغا کے نام سے اس کا جو پہلا انشائیہ "ادبی دنیا" میں چھپا تھا وہ بطور انشائیہ لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ البتہ اس کے تین چار برس بعد قیوم نظر کے ایما پر اس نے شعوری طور پر ایک انشائیہ بعنوان "گرمی" لکھا اور یہیں سے پاکستان میں انشائیہ نگاری کی ایک باقاعدہ تحریک کا آغاز ہو گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گو راقم الحروف کو اس بات کا علم تھا کہ وہ لائٹ ایسے لکھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کے لئے کوئی موضوع متبادل اردو لفظ ابھی اسے سوجھا نہیں تھا۔ چنانچہ آغاز کار میں Essay، ایسے، لائٹ ایسے، لطف پارہ وغیرہ الفاظ اور تراکیب رائج کرنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ انہی دنوں ہندوستان میں فکاہی مضامین کے لئے بعض ادبا نے "انشائیہ" کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ راقم الحروف نے ادب لطیف کی معاونت سے اس لفظ کو لائٹ ایسے کے لئے استعمال کرنے کا آغاز کیا اور خوش قسمتی یہ ہوئی کہ نہ صرف اردو انشائیہ کی تحریک کامیاب ہوئی بلکہ اس کے ساتھ ہی لفظ انشائیہ بھی مقبول ہو گیا۔

اردو انشائیہ نگاری کی پہلی کھیپ میں مشکور حسین یاد، مشتاق قمر، جمیل آذر اور غلام جیلانی اصغر تھے۔ ان میں سے مشکور حسین یاد انشائیہ شناس تو تھے مگر ایک تو وہ اصلاحی رویئے کی قدیم روایت کے تابع تھے۔ دوسرے ان کے ہاں منطقی انداز نسبتاً نمایاں تھا۔ مگر دوسرے انشائیہ نگاروں بالخصوص مشتاق قمر مرحوم، جمیل آذر، غلام جیلانی اصغر، انور سدید، کامل القادری، تقی حسین خسرو، احمد جمال پاشا، اکبر حمیدی، سلیم آغا قزلباش اور ارشد میر نے جو انشائیے لکھے وہ لائٹ ایسے کے معیار پر پورا اترتے تھے۔ ان کے بعد لکھنے والوں کی ایک اور کھیپ سامنے آ گئی جس میں رام لعل نابھوی، محمد اسرار، حمید قریشی، عبدالقیوم، حامد برگی، انجم نیازی، بشیر سیفی، جان کاشمیری، شمیم ترمذی، محمد اقبال انجم، خالد پرویز صدیقی، حنیف باوا، خیرالدین انصاری، محمد یونس بٹ، مشتاق احمد، ناصر عباس نیر اور دیگر بہت سے انشائیہ نگار تھے جنہوں نے اس صنف ادب میں طبع آزمائی کی اور کر رہے ہیں۔ آج اردو انشائیہ اپنے عروج پر ہے اور ہر چند کہ اس تحریک کو اردو ادب کا جزو بدن بنے۔ ابھی چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ نہیں ہوا تاہم اس قلیل مدت میں بھی اس کے طفیل متعدد ایسے اعلیٰ پائے کے انشائیے وجود میں آئے جنہیں ہم کامل اعتماد کے ساتھ مغرب کے بہترین لائٹ ایسیز کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ اردو انشائیہ کی کامیابی کا اہم ثبوت یہ بھی ہے کہ انشائیہ کے صنف کے خلاف بالعموم اور اردو انشائیہ کے خلاف بالخصوص ایک اخباری مہم چلائی گئی ہے جو اب اردو کے بعض سرکاری ادبی جریدوں میں بھی نظر آنے لگی ہے۔ کسی بھی صنف ادب کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگانا چاہئے کہ اس کے خلاف ردعمل کی شدت کس قدر ہے۔ انشائیہ اور اردو انشائیہ نے جو شدید ردعمل پیدا کیا ہے وہ اب سامنے کی بات ہے تاہم اس ردعمل میں مضمر بغض یا نفرت کی زیریں لہر کا احساس ابھی زیادہ لوگوں کو نہیں ہے۔ مگر وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے جب ردعمل کا یہ مخفی پہلو قاری پر عیاں ہو جائے گا۔ جب ایسا ہوا تو اردو انشائیہ کے فروغ کے راستے میں آخری رکاوٹ بھی باقی نہیں رہے گی۔ *

خلیل تنویر

وہ ملا بھی تو اس سے کیا کہتے
بڑھ چلے تھے جو فاصلے دل کے

وہ بھی اک سایۂ گریزاں تھا
ہم بھی کائنات بجے تھے

پھر لہو میں دھواں سا اٹھتا ہے
یاد آتے ہیں قافلے گل کے

تیری آمد کی منتظر آنکھیں
بجھ گئیں خاک ہو گئے رستے

پاس لگتی تھی دور کی آواز
یہ کرشمے بھی رات بھر کے تھے

● گورنمنٹ میوزیم، اودے پور۔ راجستھان

مہدی پرتاپگڑھی

کبھی تو وہم سے گزرے، کبھی گماں میں رہے
تمام عمر ہم اک سخت امتحاں میں رہے

فرورتوں کے تحت رابطہ تھا دنیا سے
مسافروں کی طرح ہم بھرے جہاں میں رہے

میں ایسا سچ کہ جگہ جس کو حاشیے پہ ملی
وہ جھوٹے لفظ تھے صفحوں کے درمیاں میں رہے

ابھی سلوک کی منزل بھی طے نہ ہو پائی
ابھی تلک تو ہم اک سعیٔ رائیگاں میں رہے

ہمارا نام ہمیشہ ہی سرخیوں میں رہا
ستارہ بن کے جبینِ شب گراں میں رہے

کہاں زمیں پہ ٹھہرتے ہیں آدمی کے قدم
ہر آن ایک تردد کہ آسماں میں رہے

● ۲۸۔ اسکول وارڈ پرتاپ گڑھ۔ ۲۳۰۰۰۱

رحمٰن جامی

مرقعے

[مرقع : ۷۲ ماتراؤں پر مشتمل ایک نئی صنف]

اپنا ایک ایچ ہے
دنیا ایک اسٹیج ہے، جس کا نقشہ گول
آکر لوگ نبھا گئے، اپنا اپنا رول
کہیں کہیں ہے جھول

●

میں میں ہوں تو تو نہیں
اب کوئی سا ہو نہیں، ہر کوئی ہے چور
دنیا ہے پیچھے مرے، بھاگوں اب کس اور
بندھی ہوتی ہے ڈور

●

غم سمٹے گی آگہی
کیا نمٹے گی آگہی، کیا اس کی اوقات
نمٹے گا میرا جنوں، اس دنیا کے ساتھ
بدلیں گے حالات

●

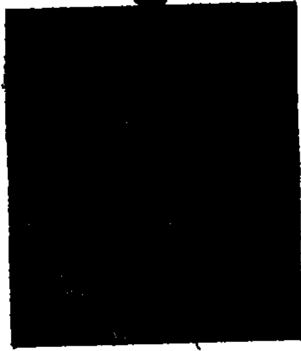
جام خوشی کا بھر چکو
جو کرنا ہے کر چکو، اپنا اپنا کاج
جامی ورنہ آئے گا، وقت نہیں محتاج
کل کی کر لو آج

● الحرا، ۱۲/۷/ ۳۰-۹-۲-۱۲، پل کالونی
مہدی پٹنم، حیدرآباد ۲۸

قیوم راہی

ڈی بلاک، ایس۔۲۰۰، نارتھ ناظم آباد، کراچی۔۲۳۳۔ (پاکستان)

دسترس



پکچر ہاؤس میں سے انسانوں کا ایک ہجوم امڈ کر باہر آیا۔

وہ سب سے پیچھے تھا، اکیلا، سست رو، کمہلایا کمہلایا سا گویا پکچر دیکھنے کے بجائے وہ کسی جنازے کو کاندھا دے کر آیا ہو وہ خود بھی تو ایک چلتی پھرتی لاش بن کر رہ گیا تھا۔ نہ کوئی امنگ، نہ کوئی لہر، نہ کوئی آس، ایک دن بس یوں محسوس ہوا تھا جیسے چلتی گاڑی یکلخت رک گئی ہو۔

گیٹ سے باہر آکر اس نے سگریٹ سلگایا۔ یوں ہی ادھر ادھر کا جائزہ لیا اور سوچنے لگا اب کدھر جائے۔ کیسی کیسی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ وہ جن کے حصول کے لئے نہ کسی تگ و دو کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ ہی اس کی جیب پر کوئی بار پڑتا تھا اور کتنے ہی عرصے وہ اس محور کے گرد چکر لگانے میں مگن رہا تھا۔ لیکن اب تو تمام سہارے بے جان ہو کر رہ گئے تھے۔ سارے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔ پھیکے، مدھم اور اداس۔

دھیرے دھیرے وہ اس سڑک کی جانب چل پڑا جہاں پر آمد و رفت بہت کم تھی۔

ایک خوبصورت جوڑا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اس کے نزدیک سے گزرا۔

ماں — اگر میں صاف صاف بتا دوں تو تم نڈھال ہو جاؤ گی۔ تم سمجھتی ہو کہ میں بدل گیا ہوں۔ مجھے اس بڑے شہر کی ہوا لگ گئی ہے تمہیں اپنے بیٹے کے بارے میں یہی کچھ سوچنا چاہیئے جو تم سوچ رہی ہو۔ لیکن ماں تم اگر کبھی یہاں آؤ اور دیکھو کہ تمہارا بیٹا ایک چھوٹے سے کمرے میں کس قدر بے کیف زندگی گزار رہا ہے۔ تو تمہیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا

اور موجودہ آمدنی میں تو زندگی کی بیشتر خوشیوں سے محروم رہنے کے باوجود بمشکل گزارہ ہوتا ہے اور تم ہو کہ شادی کے لئے مسلسل اصرار کئے جا رہی ہو اور یہاں اب حالت یہ ہے کہ محرومی اور کم مائیگی کے احساس نے میرے وجود کو خود اپنی نظروں میں بے معنی اور بے وقعت بنا دیا ہے جیسے کوئی انتہائی بے کار اور حقیر سے شے ہوں۔

اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا، چوراہے کو پار کر کے وہ تھوڑی دور چلا اور بس اسٹاپ کے پاس رک گیا۔ تکان کے باعث اس نے فیصلہ کیا کہ پیدل نہیں جائے گا بس کا انتظار کرے گا۔

تھوڑی دور ایک گھنے درخت کے نیچے کتھئی رنگ کے برقعے میں ایک عورت ادھر ادھر تکے جا رہی تھی۔ گویا اسے کسی کا انتظار ہو۔ ایک نوجوان اس کو بغور دیکھتا ہوا آگے چلا گیا۔ چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ پھر لوٹا اور عورت کے نزدیک آکر کھڑا ہو گیا کچھ باتیں ہوئیں اور نوجوان نے اپنی راہ لی۔

کبھی وہ بھی لاابالی ہوا کرتا تھا۔ اس میں بھی زندگی کی لگن تھی۔ وہ بھی شہر کے ایسے بازاروں میں گھوما کرتا تھا۔ جہاں پر رنگ برنگے ملبوسات کے جلوں میں بے پناہ حسن کے جلوے اس کی نگاہوں کا مرکز بنے رہتے تھے۔ احباب کے ساتھ تو وہ بس کبھی کبھار ہی گپ شپ لڑاتا تھا ورنہ بیشتر اوقات وہ تنہا رہتا تھا۔ تنہائی میں اس کو ایک آزادی کا احساس ہوتا تھا۔ اس وجہ سے گھومنا، پھرنا ہو یا پکچر دیکھنا یا کوئی اور سیر و تفریح، ہر پروگرام میں وہ تنہائی کو ترجیح دیتا تھا۔ کبھی شہر کے ہنگاموں سے دل اچاٹ ہو جاتا تو مضافات میں کھیتوں کی طرف نکل جاتا، رنگ برنگے پھول، تر و تازہ ہریالی، سرسبز گھنے درختوں

کی اوٹ میں غروب ہوتا ہوا سورج، گرد و پیش میں اڑتی، پھدکتی ہوئی چڑیوں کی چہکار — کچھ دیر کے لئے وہ اس ماحول میں جذب سا ہو جاتا۔

مگر اب تو کوئی خواہش تک نہ رہی ہو جیسے۔ کسی شے اور کسی بات میں کوئی کشش ہی نہ رہی تھی۔ سب کچھ بے معنی اور بے مقصد ہو کر رہ گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور معصوم مسرتوں کے جگنو کہاں روپوش ہو گئے تھے۔

ایک کار شور مچاتی ہوئی تیزی سے اس کے سامنے سے گزری تو اسے احساس ہوا کہ وہ بس اسٹینڈ پر کھڑا ہے

اس نے تیسرا سگریٹ سلگایا —— اور خالی ڈبیا ایک طرف پھینک دی۔

عورت ایک نوجوان کے اسکوٹر پر بیٹھ چکی تھی۔

اسکوٹر اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تو اس نے سگریٹ کے کئی لمبے لمبے کش لئے۔ پھر چند گز کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے خوانچے والے سے سگریٹ کی ڈبیا خریدی۔ اور اپنی جگہ آکر کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ٹیبل لیمپ اور پنکھے کے سوئچ آن کر دیئے اور پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک آنکھیں میچے خالی الذہن سا لیٹا رہا۔ پھر آنکھیں کھولیں تو میز پر پڑا ہوا رسالہ اس کی توجہ کا مرکز بنا۔ یہ رسالہ کئی دن ہوئے اس کے دوست نے پڑھنے کے لئے دیا تھا۔ وہ ابھی تک ایک بھی افسانہ پڑھ نہیں سکا تھا۔ حالانکہ مطالعہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کتنی بار اس نے یہ رسالہ اٹھایا تھا۔ بے ترتیبی سے چند سطور پڑھی تھیں، اور بے دلی کے ساتھ بند کر کے رکھ دیا تھا۔

سگریٹ سلگا کر اس نے ماچس اور سگریٹ کی ڈبیا تکیے کے قریب رکھ دی۔

جب سے اس کی یہ عجیب حالت ہوئی تھی اس کے سگریٹ پینے کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ آدھی آدھی رات تک جاگتا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہتا اس کو خود پتہ نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ دیر جاگنے کے لئے سگریٹ پی رہا ہے یا سگریٹ پینے کے لئے جاگ رہا ہے۔

بس آپ ہی آپ اس کی نیند اچاٹ ہو جاتی تھی اور وہ دیر تک کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔

یکایک روشنی بجھ گئی اور پنکھا بند ہو گیا وہ بدستور لیٹا رہا حالانکہ گرمی سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ ایسا تو بے حس وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔

پھر جلد ہی روشنی آگئی اور پنکھا چلنے لگا اور تب اسے پنکھے کی ہوا واقعی خوشگوار محسوس ہوئی۔ پہلے تو صرف ہوا تھی جو پنکھے سے آرہی تھی لیکن اب کتنی فرحت بخش ہو گئی تھی یہ ہوا۔ اس نے سوچا اور اس کے انگ انگ میں ایک تازگی سرایت کر گئی۔

پسینہ خشک ہوتے ہی اس کا ذہن ایک انوکھے خیال کی آماجگاہ بن گیا۔ کیوں نہ وہ سگریٹ نوشی ترک کر دے۔ یہ بات تو اس کے بس میں ہے۔ کتنا غیر متوقع اور عجیب تھا یہ خیال۔ اس کی طبیعت میں ایک ابال سا اٹھا اس خیال نے اس کے ذہن کے کینوس پر ایک نیا رنگ انڈیل دیا۔

دفعتاً وہ ایک جوش کے ساتھ اٹھا۔ جلتا ہوا سگریٹ اس نے جوتے سے مل کر سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی اور فرش پر پٹخ دی پھر اس نے داہنا پاؤں ڈبیا کو کچلنے کے لئے اوپر کو اٹھانا چاہا لیکن اسی لمحے اسے خیال آیا کہ اس میں ابھی نو سگریٹ موجود ہیں خاصے پیسوں کا نقصان ہوگا —— اور اگر چند دنوں کے بعد اسے پھر سگریٹ پینا پڑا تو — کتنا لطف آئے گا اس وقت اور تب پاؤں کے بجائے اس کا ہاتھ سگریٹ کی ڈبیا کی طرف بڑھا بڑی چاہ اور جذباتی انداز میں۔ اس نے سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی اور آنے والے دنوں میں سگریٹ نوشی کی لذت کے خیال سے وہ ایسا سرشار ہوا کہ بے ساختہ منہ سے سیٹی بجانے لگا۔

ایک دم سگریٹ کی ڈبیا اس نے الماری میں رکھی ہوئی اشیاء کے پیچھے چھپا دی پھر ٹیبل لیمپ اور پنکھے کی سوئچ آف کئے اور دروازہ کو مقفل کر کے سیٹی بجاتا ہوا اپنے ہوٹل کی جانب چل پڑا۔

آج بہت دنوں کے بعد اسے بھوک کا شدید احساس ہو رہا تھا —



غزل

مختار شمیم

زنگ کو آئینۂ رشکِ ہنر کرنا ہے
اے مری خوش نظری! یوں بھی بسر کرنا ہے

دھوپ کو سایہ تو صحرا کو شجر کرنا ہے
زندگی ہے تو سرابوں کا سفر کرنا ہے

نقش بھی وہم میں گم ہیں کہ ہنر کرنا ہے
حیرتِ آئینہ کو خود پہ نظر کرنا ہے

"بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل"
ایک ہی سمت میں ہم سب کو سفر کرنا ہے

تیری خاطر اے شبِ ہجر! تری عمر دراز
اپنی پیشانی پہ اک داغِ سحر کرنا ہے

اسی ویران خرابہ کو بسانا ہے شمیم
وحشتِ جاں کو اسی دشت میں گھر کرنا ہے

الف ۲۔ گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجویٹ کالج کیمپس اندور

شین کاف نظام



منزلوں کا نشان کب دے گا
آہ کو آسمان کب دے گا

عظمتوں کا نشان کب دے گا
میرے حق میں بیان کب دے گا

ظلم تو بے زبان ہے لیکن
زخم کو تو زبان کب دے گا

موت مایوس ہوتی جاتی ہے
دینے والے تو جان کب دے گا

ڈوبتا ہے سفینہ سینوں کا
نوح سا نگہبان کب دے گا

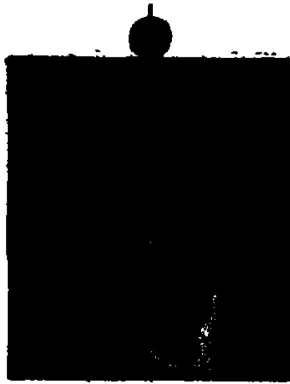
مجھ کو جنگل دیا ہے جینے کو
بزدلوں کو مچان کب دے گا

بس یہی پوچھنا ہے اس سے نظام
پر دیے ہیں تو اڑان کب دے گا

کلاسس اسٹریٹ، جودھپور - ۳۴۲۰۰۱

ثمینہ ابوالحسن

صدر شعبہ ... کستوربا گاندھی مارگ نئی دہلی



گیت

رات کی ڈومسٹک فلائیٹ سے تابش کو واپس آنا تھا۔ مگر وہ نہیں آیا نگینہ تھوڑی دیر تک فکرمند رہی پھر وہ پاس والی کوٹھی میں جاکر مہتم خانہ کی اجازت سے اس نے ایرپورٹ کے نمبر ڈائل کئے اور یہ معلوم ہو جانے پر کہ مطلوبہ فلائیٹ بخیر و خوبی اپنے صحیح وقت پر پہنچ چکی ہے مہتم خانہ کا شکریہ ادا کرکے واپس اپنے گھر پر آگئی۔

اس کے دونوں بچے کھانا کھا کر سو چکے تھے لہٰذا خود بھی بستر پر دراز ہو گئی۔ نگینہ نے سوچا تابش کے رک جانے کی یقیناً کوئی خاص وجہ رہی ہوگی۔ ورنہ حسب وعدہ وہ آج ضرور آجاتا۔ یقیناً اب اگلے روز کی کسی فلائیٹ سے آئے گا۔

بڑی خواہش تھی اس کی کہ وہ بھی کبھی ہوائی سفر کرے مگر اب تک نہیں کر سکی تھی کیونکہ تابش جب کبھی سرکاری ٹور پہ کہیں جاتا تھا تو سرکاری خرچے سے ہی جاتا تھا خود اپنی طرف سے اتنے دام خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے جی جان سے خواہشمند تھا۔ مگر اول تو اسے ملازمت کے بکھیڑوں سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی دوم اس کے پاس اتنا اثاثہ بھی نہیں تھا کہ جس کے بل بوتے پر وہ اپنا کوئی مختصر سا ہی ذاتی کاروبار شروع کر سکتا۔ اور اس کی نگرانی کے لئے وقت بھی نکال سکتا لہٰذا ان دونوں میاں بیوی نے اب اس بابت سوچنا ہی ترک کر دیا تھا کیونکہ محض سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا جتنا کچھ میسر ہوتا وہ دونوں ہی اپنے اپنے خوش کن منصوبوں کو تھپک تھپک کر سلا چکے تھے اور روزمرہ کی بندھی ٹکی یکسانیت بھری بے کیف زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔

تابش کا وقت تو دفتر میں جوں توں کٹ ہی جاتا تھا مگر نگینہ کے لئے وقت گذاری اچھا خاصا مسئلہ تھی دونوں بچوں کے اسکول چلے جانے اور تابش کے آفس روانہ ہو جانے کے بعد وہ گھر میں بالکل تنہا رہ جاتی تھی۔ گھریلو کام نمٹانے کی ماہر تھی اس لئے کم وقت میں تمام کام کر لیتی تھی چھوٹا سا تو کنبہ تھا ان کا لیکن کام کرنے کے بعد جو وقت بچ جاتا تھا وہ بڑا پریشان کن ہوتا تھا کیونکہ نہ نگینہ کو سنجیدہ مطالعے کا شوق تھا نہ کوئی اور خاص شوق۔ اڑوس پڑوس کی باتونی خواتین سے وہ اس لئے کتراتی تھی کہ اسے ان کے کسی بھی ٹاپک سے دلچسپی نہیں تھی۔ سوائے دوسروں کے عیوب ڈھونڈنے انہیں مشتہر کرنے دوسروں کی غیبت کرنے اور خود کو برتر سمجھنے کے ان سب کی ملاقاتوں اور گفتگو کا کوئی اور ماحصل یا مقصد نہیں ہوتا تھا۔ اور نگینہ کو غیبت سے سخت چڑھ تھی۔ ہیروں نگینوں سے البتہ نگینہ کو خاص شغف تھا۔ یاقوت، زمرد، پکھراج، مرجان، فیروزہ، عقیق وغیرہ کے خواص کے متعلق اس نے بہت کچھ پڑھا تھا لہٰذا اسے معلوم تھا کہ ہیرے کا خاص ہوتی جاپان کا کلچر موتی، کولمبیا کا پنا برما کا روبی اور کشمیر کا نیلم اپنی خاص شہرت رکھتے ہیں۔ اپنی خصوصی توجہ کی وجہ سے وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مشہور زمانہ کوہ نور ہیرے کا وزن ایک سو آٹھ رتی ہے اور ہندوستان، بلجیم اور اسرائیل ہیرے تراشنے والے ممالک ہیں۔ کاش کہ وہ کبھی قریب سے ہیروں نگینوں کو دیکھ سکتی چند منٹ کے لئے ہی سہی انہیں ان کی مخملی ریشمی سے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر سجانے کا فخر اور ان کا دل خوش کن لمس محسوس کر سکتی! اپنی آنکھوں میں ان کی حقیقی چکا چوند عملاً سما سکتی؟ مگر یہ بھی ایک خواب ناممکن تھا۔ شاید کبھی پورا نہ ہونے والا اسے تعلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ پھر بھی جبراً تعلیم کی تکمیل کرنا پڑی تھی۔ لہٰذا شادی کے بندھن میں بندھتے ہی سوائے تابش کے سوا وہ اور سب کچھ بھول بھال گئی۔ پھر دو دو سال کے وقفوں سے دو عدد بچوں کی پیدائش نے اسے دوسری تمام جزوی مصروفیات سے مزید بیگانہ بنا دیا۔ اور وہ صرف بچوں کے لئے وقف ہو کر رہ گئی۔

جب تک بچے پیدا نہ ہوئے تھے وہ اور تابش کافی بے فکر خوشگوار زندگی گزارتے رہے تھے مگر بچوں کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ضروریات بڑھے

بڑھتے ہوئے اخراجات نے انہیں رفتہ رفتہ معاشی پس ماندگی کا شکار کر دیا کیونکہ نہ وہ کسی امیر کبیر فیملی سے تعلق رکھتی تھی نہ ہی تابش بلکہ وہ سب متوسط طبقے کے ایسے افراد تھے جن کی سفید پوشی کا انحصار صرف اور صرف ان کی محنت اور کاوشوں پر منحصر تھا۔

تابش کا خاندان تو اب بھی اپنے آبائی گاؤں میں کھیت کھلیانوں کی دیکھ بھال اور حفاظت میں مصروف تھا تابش کو چونکہ دیہی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے پہلے حصول تعلیم کے لئے اور پھر ملازمت کے لئے وہ شہر میں ہی رہ گیا تھا شہر میں ہی اس نے تہمینہ سے شادی کر لی تھی۔ اور وہ دونوں ہی اگرچہ کہ بہت خوش نہال تھے مگر تابش کے والدین چونکہ ان کی شادی سے خوش نہ تھے اس لئے تابش سے ان کے مراسم بھی برائے نام رہ گئے تھے۔ تہمینہ کے والدین نے تہمینہ کی خوشی کی خاطر البتہ تابش کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا تھا ان کے بھائی بہن اکثر اس سے ملنے آجاتے تھے اور وہ خود بھی وقتاً فوقتاً اپنے والدین کے نیاز حاصل کرنے اپنے مائیکے چلی جاتی تھی مگر یہ ایسی باتیں نہیں تھیں۔ جن سے تہمینہ کی مستقل تنہائی بحال رہتی۔ چنانچہ مدت بعد جب بچے اسکول جانے لگے تو وہ گھر سنوارنے سجانے کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ اپنے گھر کو کوئی عشرت کدہ نہیں بنانا چاہتی تھی مگر ہر ذی بشر کی طرح بہتر زندگی کی آرزو ان کی بھی عین تمنا تھی۔ لہٰذا وہ ایسا ضرور بنانا چاہتی تھی جس کی ہر ایک چیز جاذب نظر جاذب توجہ ہو لیکن تابش کی کم آمدنی کی وجہ سے وہ اپنی یہ خواہش بھی پوری نہیں کر پا رہی تھی۔ لہٰذا ممکنہ رد و بدل کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہ گئی تھی۔ ایسے میں اسے اپنی زندگی کا صرف وہی عرصہ بھلا لگتا تھا جب تابش اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ کہ جس طرح سونے پر جما ہوا میل سہاگے سے صاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تہمینہ کا وجود بھی تابش کی رفاقت میں چمکنے دمکنے لو دینے لگتا تھا۔ مگر یہ عرصہ بڑا قلیل ہوتا تھا۔ تابش دفتری امور میں گلے گلے دھنسا رہتا تھا۔ اور اکثر و بیشتر سرکاری ٹور کے سلسلے میں ہفتہ ہفتہ بھر بیرون شہر بھی چلا جاتا تھا پھر تھک تھکا کر آتا تو خوش دلی اور فراغت کا مظاہرہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا تھا کیونکہ اگلی صبح اسے پھر مقررہ وقت پر آفس جانا ہوتا تھا۔ جی تو اس کا بھی یقیناً چاہتا ہو گا کہ اطمینان و فراغت سے لطف زندگی سے سیراب ہو لے مگر مشینی زندگی نے اسے اس قابل ہی نہیں رکھا تھا ہفتے بھر میں صرف چھٹی کے روز وہ سب باہم رہنے کا حسب توفیق جشن مناتے تھے۔ یا تو پکنک منانے کہیں چلے جاتے یا کسی فیملی فرینڈ کے یہاں وزٹ کر لیتے بشرطیکہ خود ان کے ہاں کوئی آنہ جاتا ورنہ ان کی تفریح کا چھوٹا موٹا پروگرام بھی چوپٹ ہو کر رہ جاتا تھا۔ اور یہی وہ وجوہ تھیں جن کے باعث تہمینہ شدید سی یکسانیت کا شکار تھی۔ وہ ایک اچھی بیوی اچھی ماں تھی مگر حالات کے ہاتھوں بری طرح ۔۔ بے بسی کی مٹھی میں بند جکڑی ہوئی تھی۔ جس سے نجات کا اس کے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ بہرحال اگلی صبح حسب عادت نماز فجر سے فارغ ہو کر وہ اپنے مقررہ کاموں میں مصروف ہو گئی اور بچوں کو ناشتہ کرا کے اسکول روانہ کر دینے کے بعد تابش کے انتظار میں بیرونی سیڑھیوں پر جا بیٹھی، آج تابش کو آ ہی جانا چاہیئے اس نے بوریت سے گھبرا کر سوچا اور دن کی دس بجے والی فلائیٹ سے تابش واقعی آ گیا گھر پہونچ کر سواری سے اترتے ہی سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ سیڑھیوں پر رکھ کر اس نے وہیں تہمینہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں

"سوری لائف پارٹنر کہ میں کل حسب وعدہ نہیں آسکا مگر آج بہرحال تمہارے آگے حاضر ہوں دیکھ لو" وہ چہکا تہمینہ نے اپنی ٹھنڈی سانس ہونٹوں تک آنے سے روکی کیونکہ وہ تابش کی خوش دلی کو متاثر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ خوش دلی جو کبھی کبھی اس کے حصے میں آتی تھی اس لئے خود بھی میٹھے لہجے میں بولی "خوش آمدید خوش آمدید" اب فوراً یہ بتا دو کیا آج بھی آفس جاؤ گے تم؟

"نو ڈیئر دتھو دی آفس" تابش مسکراتے ہوئے خلاف توقع بولا "اگرچہ کہ آفس جا کر اپنی واپسی اور حاضری ضرور درج کروانی ہے لیکن پھر بھی کم از کم آج میں آفس نہیں جاؤں گا ۔۔۔ لائف پارٹنر اور ضابطے کی یہ کاروائی اب کل ہی کروں گا۔ آج صرف تمہارے ساتھ رہوں گا۔ خوش! ہونا ٹھیک ٹھاک ہونا؟ بچے بھی بخیر ہیں نا؟

تہمینہ کھل گئی۔

ہاں ہاں ہم سب بخیر ہیں تابش بلکہ لمحہ لمحہ چشم براہ تھے تمہارے لئے۔ آؤ اب اندر چلیں کیا یہیں سیڑھیوں پر ہی تمام گفتگو ختم کر لو گے؟

تہمینہ نے ملائمت سے تابش کی باہیں خود سے الگ کیں اور تابش کا سفری سامان تھام کر گھر میں داخل ہو گئی۔ تابش بھی ان کے پہلو بہ پہلو اندر پہنچا۔ اندر پہنچ کر بے تابی سے ہینڈ بیگ کھولتے ہوئے بولا "یہ دیکھو کیا لایا ہوں میں تمہارے لئے" اور صندل کی لکڑی سے بندھی ہوئی ایک دیدہ زیب منقش صندوقچی نکال کر تہمینہ

کو تھاؤ۔

"وہ کیسی ہے! تم اسی میں اپنے زیورات رکھ سکتی ہونا!"

"بہت عمدہ بہت نفیس ہے تابش۔"

تہمینہ صندوقچی کے نقش و نگار پر نرمی سے انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی پھر ٹھٹک گئی۔ "زیورات؟"

تابش بھی اپنی بھول پر گڑبڑا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "ہنا ڈیر زیورات کو اگر کبھی زندگی نے موقع دیا تو زیورات سے لاد دوں گا تمہیں لیکن فی الحال تم اس میں اپنا آرائشی سامان تو رکھ ہی سکتی ہو نا؛"

اور تہمینہ کی توجہ زیورات سے ہٹانے کے لیے اس نے دوبارہ ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال کر چند مزید چیزیں برآمد کیں اور ہینڈ بیگ کی زپ بند کرکے وہ چیزیں بھی تہمینہ کے حوالے کر دیں۔ "دیکھو ذرا کیسے ہیں۔ یہ کھلونے! اپنے بچوں کو پسند تو آئیں گے نا تہمینہ!"

"بے شک:" تہمینہ نے اپنے ہاتھ میں دھرے کھلونوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا کیونکہ کھلونے واقعی بڑھیا تھے۔

"وہ جان ملٹن اندھا تھا۔ لائف پارٹنر مگر بے پناہ شاعر تھا:" تابش پھر چہکا۔ "اور اس کی بے پناہ شاعری کی طرح تم بھی ہمہ وقت میرے حواسوں پر چھائی رہتی ہو۔ خواہ میرے سامنے رہو نہ رہو۔"

وہ بستر پر بیٹھ کر جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے بولا تو ذرا دیر کے لئے تہمینہ اپنی ساری بوریت بھول گئی کھلے ہوئے پھول کی طرح اس کے لائے ہوئے تحفے سنبھال کر ایک طرف رکھتے اور کرتے ہوئے بولی "اچھا اچھا اب تم فوراً نہا کر فریش ہو لو۔ تب تک میں تمہاری کوئی پسندیدہ ڈش بنا لیتی ہوں۔"

"نہاؤں گا تو میں ضرور لائف پارٹنر۔ لیکن آج تم کچھ بنانے کے چکر میں مت پڑو۔ بچوں کے اسکول سے آجانے کے بعد آج ہم سب کسی ریسٹورنٹ میں لنچ کریں گے۔"

تہمینہ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ "کیا۔۔۔؟" اس نے غیر یقینی انداز میں تابش کی طرف دیکھا تو وہ ہنوز بشاشت سے بولا۔

"ہاں لائف پارٹنر۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں بلکہ دوران سفر روزمرہ خرچ کا جو الاؤنس ملتا ہے۔ مجھے اسے میں نے بچا رکھا ہے۔۔۔"

تہمینہ نے خوشی سے بوکھلاتے ہوئے ایک نظر پھر اپنے پرانے گھر پر ڈالی کرایے کا اجاڑ سا گھر۔ اس میں رکھا ہوا کافی سامان کثرت استعمال سے گھسے ہوئے کرسیوں کے کشن جو کبھی نئے تھے۔ رنگ اتری ہوئی بیڈ شیٹس اور پردے جو کبھی دل موہ لیتے تھے۔ پچکے ہوئے تکیے جو ابتدا میں پچکے ہوئے نہیں تھے۔

وارنش اتری ہوئی اولڈ اسٹائل لکڑی کی الماری اور ڈریسنگ کیبنٹ ننگی دیواریں مگر ان سب کو نیا پن اور جاذبیت دینے کی اس کی شدید تمنا اس وقت جیسے ایک دم اس کے دماغ سے محو ہو گئی۔

جلد جلد لباس تبدیل کرتے ہوئے اس نے سوچا اونہہ! گھر پرانا اور سامان خستہ حال ہو چکا ہے تو کیا ہوا تابش کا دل تو میری محبت سے بھرا ہوا لبالب بھرا ہے۔ ناگفتہ بہ حالات اور گزرتے ہوئے وقت نے اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی ہے۔

خوشی خوشی جینے کے لئے اس سے بڑا سہارا اور کون سا ہو سکتا ہے بھلا؟۔ دھن دولت مل جائے محبت نہ ملے تو یقیناً انسان تشنہ و محروم رہ جاتے ہیں لیکن محبت ملتی رہے تو مفلسی اندھیر دل میں بھی کتنے سلیقہ۔۔۔ چاند ستارے ہیں۔۔۔ کیا یہ میری خوش قسمتی نہیں کہ میں بھی ان ہی خوش نصیبوں میں شامل ہوں اجالے جنہیں سلام کریں نہ کریں لیکن محبت جن کا استقبال کرنا کبھی نہیں بھولتی۔۔۔۔

اس احساس کے تحت اسے اپنا معمولی گھر اور معمولی لباس بہت بھلا لگا خوابناک جوں بجھ پور۔ بھرپور۔

پھر بچوں کے اسکول سے آتے ہی جب وہ بچوں اور تابش کے ساتھ آٹو رکشہ میں سوار ہو کر اوپن ایئر ریسٹورانٹ کی طرف جا رہی تھی تو بلاشبہ اسکی ذات مسرتوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ ہر طرح کے افسوس اور فکر سے بے بہرہ بس یہی ایک احساس اپنی پوری سچائی سے قائم تھا کہ دو عدد بچوں کی ماں بن کر بھی وہ اب تک نفس نفس تابش کی سانسوں اور دھڑکنوں میں سمائی ہوئی ہے۔

کسی خوش الفاظ سی خوش الحان لازوال گیت کی طرح۔۔۔۔

گیت جو تھکن مٹا دیتے تھکے ماندوں کو نئی توانائی سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ انسان مرجاتے ہیں لیکن گیت کبھی نہیں مرتے۔۔۔

درد کے تمام چاند دفعتاً غروب ہوگئے۔ اور ایک فخریہ مسکراہٹ اس کے نارسا تشنہ وجود کو چکا چوند کر گئی۔ ❊



خالد سہیل

انسان، جانور اور درخت

جس دن
جنوبی افریقہ کے قبائل کے
ایک بشِ مین نے
ایک جنگلی بکری کو
اپنے تیر کا نشانہ بناتے ہوئے کہا تھا
"اے بکری مجھے افسوس ہے کہ
میں نے تیری جان لی
لیکن
میرے بڈھے ماں باپ بھوکے ہیں
اگر انھیں کھانا نہ ملا تو
وہ مر جائیں گے
امید ہے تم مجھے معاف کر دو گی"
اسی دن
سینکڑوں انسان
ہزاروں دنبوں کو ذبح کر رہے تھے
تاکہ
ان کے پیٹ سے وہ بچے نکال سکیں
جن کی کھالوں
وہ خوبصورت کوٹ بنانا چاہتے تھے

جس دن
شمالی امریکہ کے قبائل کے
ایک انڈین نے
ایک درخت کو کاٹتے ہوئے کہا تھا
"اے درخت مجھے بہت دکھ ہے
کہ میں نے تمہیں کاٹ ڈالا
لیکن
میرے چھوٹے چھوٹے بچے
سردی سے کانپ رہے ہیں
اگر انھیں آگ کی حرارت نہ ملی
تو وہ سردی سے ٹھٹھر کر مر جائیں گے
امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے"
اسی دن
ہزاروں ادیب
لاکھوں کاغذ
جن پہ
ان کی نظموں، غزلوں اور افسانوں کے
نامکمل ڈرافٹ رقم تھے
ردی کی ٹوکریوں میں پھینک رہے تھے

PENT HOUSE NO: 8 RT WHITBY
100 WHITE OAKS CRT WHITBY
ONTARIO CANADA L1P 1B7



خالد جاوید

وہی خون

وہی خون جو اس دن
میری پنڈلی سے رس کر
ایڑی تک جا رہا تھا!

وہی خون جس نے
کولتار کی سڑک پر جم کر
کالے رنگ کا ایک بڑا دھبہ بنالیا تھا!

وہی خون جسے میں
کل گندی نالیوں میں بہتے دیکھ کر
ڈر گیا تھا

آج سوچتا ہوں کیسا لگتا ہے
اسی خون کی ارزانی کو تکنا
جس سے کبھی
سنہری جلد والی کتاب پہ
میں نے تمہارا نام لکھا تھا

۵۸۵ ۔ صوفی ٹولہ، بریلی (یوپی)

انل ٹھکر

۳۰۸، آدرش نگر - بیل - ۵۰۵۵۳۲

آرائش

ایک بار پھر اندھا دھند کوشش شروع کر دی۔ ہر سو ڈھونڈا، پورے صحرا کو کھنگال ڈالا، سانسیں اکھڑ گئیں، میرے پاؤں تک مسامات میں گرم ریت کے ذرے بھر گئے، آنکھیں جھلس گئیں، مگر آبلہ دست میں پھسلتی ہوئی ریت کے سوا کچھ نہ آیا۔

وہ کیسے گرا!

کب گرا!

کہاں گرا!

میں کچھ نہیں جانتی۔

مجھے اس بات کا علم تب ہوا جب اس روز ممی، پتا نے بلا کر اپنا ارادہ، اپنی انا کو مجھ پر لادنا چاہا۔

—— نہیں ممی کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو سہمی ہوئی، خاموش بیٹھی سن رہی تھیں، جو پتا کہہ رہے تھے۔ شاید پتا نے انہیں پہلے ہی ڈانٹ پلا کر خاموش تماشائی بنا دیا تھا۔

پتا سمجھتے کیوں نہیں کہ ان کی انا میری انا کیسے بن سکتی ہے، ان کی سوچ میری سوچ کیسے ہو سکتی ہے! ان کی روح میرے جسم میں کیسے سما سکتی ہے!

ایسے کئی باغیانہ خیال ذہن کے پردے پر بادلوں کی طرح ابھرے اور بکھر گئے۔ میں احتراماً خاموش کھڑی سنتی رہی۔

عورت کی خاموشی کو ہر بار اس کی رضامندی کیوں قرار دیا جاتا ہے! میری خاموشی کا بھی یہی مطلب نکالا گیا۔

اداسی کے عالم میں "جب وہاں سے چلی" تو اتفاقاً میرا ہاتھ ناک کی کیل کو سہلانے کے لئے اٹھا۔ کیل کو چھوتے ہی میں چونکی۔ دوڑتے ہوئے فوراً آئینے کے سامنے پہنچ گئی۔ میرے چہرے کو منور کرنے والا وہ ہیرا ناک کی کیل میں نہیں تھا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

مجھے میرا چہرہ سیاہ نظر آنے لگا۔ گھر صحرا میں تبدیل ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ اور میں نے بدحواس ہو کر ریت کو اچھال اچھال کر ہیرے کی تلاش شروع کر دی۔

میں کسی حال کسی صورت، کسی قیمت پر اس ہیرے کو پھر سے حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس کے لئے کسی کی مدد بھی نہیں مانگ سکتی۔ پتا سے کوئی امید نہیں۔ ممی تماشا بین بنی بیٹھی ہیں۔ تعجب اس بات پر ہے کہ گھر میں کسی کو بھی میرے چہرے کا بدلا ہوا رنگ، ناک کی کیل کا سونا پن کیوں نظر نہیں آ رہا! ان کی نظروں کو کیا ہو گیا ہے؟

وہ ہیرا میری دادی نے چپکے سے مجھے دیا تھا۔ میں نہیں جانتی ان کو وہ ہیرا کہاں سے ملا تھا۔ کس نے دیا تھا۔ البتہ انہوں نے اسے بڑی حفاظت اور جتن سے سنبھالا ہو گا۔ اسی لئے ان کے چہرے پر ہر وقت نور پھیلا رہتا تھا۔

گرما کی رات تھی۔ نوکر نے شام کو ہی چھڑکاؤ کر کے کوٹھے پر کھاٹ بچھا دی تھی۔ میں دادی کی گود میں سر رکھ کر بے کنار آسمان میں یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے ان گنت ستاروں کے ہجوم کو تک رہی تھی۔ دادی اپنا ماضی مجھے سناتے ہوئے اپنے بیتے دنوں کو پھر سے جی رہی تھیں۔ میں دادی کی باتوں سے بے نیاز وہ میرے وجود سے بے خبر۔ ایک عجیب تنہائی کا سماں بندھا ہوا تھا۔

تھپکیاں دیتے ہوئے دادی کے ہاتھ نے یک بیک میرے سینے پر ہلکے سے ابھار کو محسوس کیا۔ ان کا ہاتھ رک گیا، انگلیوں نے نرمی سے ابھار کو ٹٹولا۔ اور شاید محسوس کیا کہ اب میری عمر بیتے دنوں کی قصے سننے کی نہیں رہی۔ انہوں نے گفتگو کا موضوع فوراً بدلا۔ وہ قصے سے کہانی پر آ گئیں۔

اس رات میں انہوں نے سیتا کی کہانی سنائی۔ دوسری رات

ساوتری کی، پھر دمینتی، دروپدی کی، اس طرح کبھی دلوں میں ڈھیر لگا دیا کہانیوں کا۔

ہر دادی اور نانی کی طرح ان کا بھی کہانی سنانے کا انداز بڑا خوب تھا۔ ان کے انداز نے مجھے ایسا لبھایا کہ میں ان کہانیوں کے ہر کردار کو اپنی سکھی، سہیلی سمجھنے لگی۔ ان کرداروں کے طرز زندگی سے میں اتنی متاثر ہوئی کہ بڑی ہو کر ان کے نقش قدم پر چلنے کے زندگی جینے کے خواب بننے لگی۔

تھوڑے ہی دن تو میں ان کے ساتھ رہی ہوں لیکن دادی نے کہانیاں سناتے ہوئے کب وہ ہیرا میرے دامن میں ڈال دیا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔

نہ پانے کا علم نہ کھونے کی خبر، حیرت ہوتی ہے۔ مجھے اپنی نادانی پر حیرت تو مجھے اس دن بھی ہوئی تھی۔ جب ممی نے مجھے سینے سے لگایا تھا۔ میری ممی جو — بہتے خون کی بات سن کر غش کھا جاتی ہیں۔ اس نے جب میرے جسم سے خون بہنے کی بات سنی، تو مجھے سینے سے لگا کر، بالوں کو سہلاتے ہوئے، میری پیشانی کو چوما تھا۔ جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔

ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ مگر میں نے ان کی آنکھوں میں ڈر کا ہلکا سا سایہ بھی دیکھا تھا۔ جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں دیواروں کے صرف کان ہی ہوتے، آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔ گھر کی دیواروں نے ممی کی آنکھوں میں چھپے ہلکے سے ڈر کو پڑھا۔ اور گھر کے بڑے بزرگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ جیسے دور سے آتے ہوئے فائر بریگیڈ کے گھنٹے کی آواز انہوں نے سن لی ہو۔

دوسری طرف ممی نے اپنی آنکھوں میں اترے ڈر کے سائے کو زمانے کی نظروں سے چھپانے کے لئے جیسے کمر کس لی۔ ساڑی کا پلو کمر میں ٹھونسا۔ مجھے غسل خانے میں لے گئیں اور میرے جسم سے بہتے خون کا راز منکشف کرتے ہوئے یوں سمجھانے لگیں، جیسے میرے کان میں منتر پھونک رہی ہوں کہ — بیٹی، مرد کے جسم سے بہنے والا خون جنگ اور نفرت کو پیدا کرتا ہے۔ عورت کے جسم کا بہتا خون انسان اور ممتا کو جنم دیتا ہے۔

منتر پھونکتے پھونکتے ممی نے کب دادی کے ہیرے کو کیل میں جڑ کر میری ناک میں نکیل ڈال دی، میں جان بھی نہ پائی۔

غسل خانے سے باہر آتے آتے میں نے اپنے آپ کو اپنی عمر سے بڑا محسوس کیا۔ میرے پاؤں کی تھرکن جیسے غائب ہو گئی۔ ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرنے والا میرا جسم سہمے ہوئے قدم رکھنے لگا۔ میری کھلی ہنسی میرے قہقہے، دبی دبی مسکراہٹ اور حیا میں تبدیل ہو گئے۔

اس بھونچال کو صرف میں نے ہی نہیں جھیلا پاپا اور ممی بھی اس کے شکار ہوئے۔

میرے ساتھ ان کا برتاؤ ہی بدل گیا۔ پاپا جو لاڈ سے مجھے اپنی گود میں بٹھا کر پیار سے چوما کرتے تھے۔ اب مجھے چھونے سے بھی جھجکنے لگے۔ پہلے کبھی کبھار ڈانٹ پھٹکار دیتے تھے۔ اب نرمی سے پیش آنے لگے۔ ان کی آواز میں پیار سے زیادہ رحم کی جھلک تھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر قبر میں پیر لٹکائے ہوئے مریض سے باتیں کر رہا ہے۔ ممی تو جیسے چوبیسوں گھنٹے مجھ پر نظروں کا پہرا لگائے بیٹھی رہتیں اور وقت بے وقت نصیحت کرنے لگ جاتیں — مجھے کیسے بیٹھنا چاہیئے۔ مجھے کیسے چلنا چاہیئے۔ کیسے بولنا چاہیئے۔ کیسے اوڑھنا چاہیئے پہننا چاہیئے....

میرے اطراف پابندیوں کا گھیرا کھڑا کر دیا۔ ممی اور پاپا کے اس روپ کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ذرا کی ذرا میں رشتے بدل گئے۔ لاڈ، پیار، ممتا کے چشمے ایسے سوکھ گئے جیسے دھوپ نکلتے ہی اوس کے قطرے خشک ہو جاتے ہیں۔

ان کے بدلے ہوئے سلوک سے مایوس ہو کر، میں نے رفتہ رفتہ گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ میری گوشہ نشینی سے نہ جانے گھر کے لوگوں نے کیا سوچا۔ گھر میں سرد جنگ چھڑ گئی۔ گھر دو پارٹیوں میں بٹ گیا۔ گھر کے سب لوگ ایک طرف، تو دوسری طرف پاپا اکیلے۔ سب چاہتے تھے کہ اچھا لڑکا ڈھونڈ کر میری شادی کر دی جائے پاپا اس بات کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا میں ابھی کم سن ہوں مجھے پڑھنے دیا جائے۔

میری تعلیم جاری رہی۔ مگر میرا جی اب پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ اسکول سے آتے ہی کتاب لے کر کسی کونے میں بیٹھ جاتی۔ کتاب میں منہ چھپائے کبھی سیتا سے باتیں کرتی۔ تو کبھی دروپدی سے، کبھی ساوتری کے سنگ گپ شپ ہوتی۔

گرتے سنبھلتے میں نے بی۔ اے کر لیا۔ ان برسوں میں میرا قد کاٹھ بھی اچھے نکل آئے تھے پاپا کے پاس بھی اب کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ ممی بھی ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑی تھیں۔ اس لئے

پاپا جٹ گئے، میرے لئے لڑکا ڈھونڈنے میں۔

لڑکوں کا کونسا قحط ہے۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ میرے لئے بھی مل گیا۔ سب کو پسند آیا۔ ہم نے بھی ایک دوسرے کو پسند کیا۔ عام آدمی جتنا شادی بیاہ پر خرچ کرتا ہے اتنا پاپا نے ہماری منگنی پر کیا۔ ممی بہت خوش تھیں۔ انھوں نے میری نکیل کی رسی ڈھیلی کردی۔ پہرے اٹھا لئے، پابندیاں ہٹالیں۔ میں قلانچیں بھرنے لگی۔ پہلے کی چوکڑی اور اب کے قلانچ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کبھی ہاتھ میں ہاتھ لئے، کبھی باہوں میں باہیں ڈالے، دو جسم مس ہوتے ہوئے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے۔

مگر سچ کہا ہے، کہنے والے نے۔

آسمان کی بلندیوں کو چھونے والے دھم سے زمین پر آگرتے ہیں۔

اس دن پاپا نے بلا کر اپنی انا کی چادر مجھ پر ڈالی تو میں دھم سے زمین پر آگری۔ مستقبل کا جو پیکر میں نے بنایا تھا، وہ چکنا چور ہوگیا۔ اپنے ساس سسر کی خدمت کے جو منصوبے بنائے تھے، وہ ریت کے محل کی مانند ڈھے گئے۔ زندگی کی جن راہوں پر ہم سفر کے شانہ بشانہ چلنے کا عہد کیا تھا، وہ راستے ہی میں انا کی باڑھ میں بہہ گیا۔

یہ سب صرف اس لئے ہوا کہ ان کے خاندان کے کسی شخص نے ہمارے خاندان کے کسی فرد سے کہہ دیا کہ، آپ نے منگنی کی رسم میں دکھاوے کے لئے خرچ تو کافی کیا۔ مگر لڑکے کو صرف آدھے تولے کی انگوٹھی پر ٹرخا دیا۔

بس پاپا بھڑک گئے۔ ان کی انا گرجنے لگی۔

دو سانڈ لڑا کرتے ہیں، تو بے چارے پودے کچلے جاتے ہیں۔

پاپا نے میرے لئے کئی حکم جاری کردیئے۔ اس سے ملنا جلنا بند۔ فون پر بات کرنا بند، خط و کتابت بند۔

ان پر سب دروازے بند کردیئے گئے۔

پاپا کے حکم میں اور ممی کی پابندیوں میں بہت فرق تھا۔ ممی کی ممتا کو لانگا جاسکتا تھا، پاپا کی انا سے مفر ممکن نہیں تھا۔

چند روز پہلے جس خاندان سے رشتہ جوڑ کر فخر محسوس کیا جارہا تھا۔ اب اس میں نقص اور عیب دیکھے جارہے تھے۔ گھر کا ہونے والا داماد برے القاب سے نوازا جانے لگا۔

لڑکی والوں کی اینٹھ دیکھ کر، لڑکے والے بھی اکڑ گئے۔

چند دن گذرے تو رشتہ مردہ جانور کے جسم کی طرح پھول کر سخت ہوگیا اور اس میں سے اٹھنے والی بدبو سے اس کے اطراف باتوں کے گدھ منڈلانے لگے۔

کچھ لوگوں نے پاپا کو سمجھایا۔ وہ نہیں مانے۔ ایک دن انہوں نے سمدھی سے ترک تعلق کا اعلان کردیا۔

میں خوب روئی۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ آنسوؤں سے تر رخسار کو پونچھا تو دوپٹے کی گرٹ ناک کی کیل میں پھنس گئی۔ درد کے مارے میں تڑپ اٹھی۔ مگر دوسرے لمحے ہی خوشی سے اچھلنے کو دل چاہا۔ میری باچھیں کھل گئیں۔ چہرے پر تبسم کے انار چھوٹ پڑے۔

مجھے پتہ چل گیا۔ معلوم ہوگیا۔ میں جان گئی۔ میرا آب دار ہیرا، دادی کے ارمانوں کا ہیرا بیٹا، ساوتری اور دروپدی کے دور کا وہ ہیرا کب، کہاں اور کیسے گم ہوا۔

اس روز ڈھلتی شام کو وہ آئے۔ صبح سے ہی میں محسوس کر رہی تھی کہ آج وہ ضرور آئیں گے۔ شام سے ہی میں گنگنانے لگی تھی۔ بننے سنورنے کے لئے آئینے کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ ان کو آتا ہوا دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔

ہمارے ساتھ چلو گی؟ میری جانب بڑھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ میں نے دوپٹہ اٹھا کر سینے پر پھیلا دیا۔ اور ان کے ساتھ جانے کے لئے آگے بڑھی۔ پوچھو گی نہیں؟ میں کہاں لے جانے آیا ہوں۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔ آپ جہاں چلنے کے لئے کہیں گے۔ میں پیچھے پیچھے چلی آؤں گی۔

چند لمحے وہ مجھے یوں دیکھا کئے جیسے میرے وجود کو اپنی آنکھوں میں سمو لیں گے۔ پھر میرے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں ایسے لیا، جیسے پوجا کے لئے ناریل کو لیا جاتا ہے۔

ان کی آنکھوں سے پیار برسنے لگا۔ اس میں شرابور ہوکر میں نے کپکپی محسوس کی۔ جسم حیا کی گٹھڑی کی طرح سکڑ گیا۔ ان کی گرم سانسیں میری پیشانی پر پھیل کر دھیرے دھیرے نیچے کی طرف اترنے لگیں۔ سانسوں کی نمی میرے ہونٹوں تک آگئی۔ تو میں نے آنکھیں موند لیں۔ دل ڈھولک کی تھاپ کی طرح بج اٹھا۔ شرم سے پانی پانی ہوکر میں نے اپنا چہرہ ان کے سینے میں چھپا لیا۔ سکون کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے ابھی چند لمحے ہی گذرے تھے کہ نیچے سے ممی نے آواز دی۔ میں نے ہڑبڑا کر سر ان کے

باقی صفحہ ۳۴ پر دیکھئے



بسمل نقشبندی

وہ بلاشک کورِ باطن ہے کوئی عابد نہیں
جو یہ کہتا ہے وہ مشہود ہے شاہد نہیں

اس طرح کی زندگی ہے باعثِ شرمندگی
سر جھکایا تو نے لیکن دل ترا ساجد نہیں

وہ تری فریاد سن کر تجھکو دے گا بھی مگر
وقت سے پہلے نہیں تقدیر سے زائد نہیں

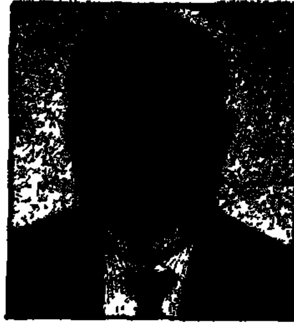
کون اس دم توڑتی انسانیت کو دے گا خون
دور تک حمزہؓ نہیں حیدرؓ نہیں خالدؓ نہیں

باخدا اس دور کے نفرت بھرے ماحول میں
لائقِ تعظیم ہے وہ شخص جو حاسد نہیں

ہے مرا محبوب میرے روبرو ہر حال میں
عشق میرا اس لئے منت کشِ قاصد نہیں

ہے ازل کے دن سے اے بسمل یہاں میرا قیام
میں تمناؤں کے اس زنداں میں نووارد نہیں

رحمت کدہ اتید دواج تالاب بانسواڑہ (راجستھان)



حنیف اخگر

محوِ کمالِ آرزو دل کو بنا کے رہ گئے
خرمنِ جاں میں شوق کی آگ لگا کے رہ گئے

ضبطِ فغاں نے زخمِ دل داغِ وفا بنا دیا
حوصلے میرے گریۂ رنگیں ادا کے رہ گئے

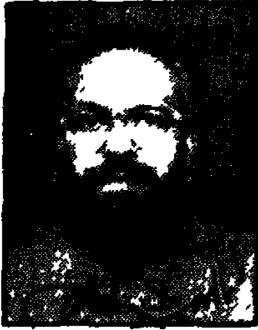
ظرفِ حجابِ عشق ہی وجہ نمودِ حسن تھا
جلوے تمام دیدہ و دل میں سما کے رہ گئے

پردۂ بے خودی میں تھے زائرِ کائنات ہم
پردۂ بے خودی اٹھا ہوش میں آ کے رہ گئے

جبر ہی اختیار تھا آپ کی بزمِ ناز میں
پی گئے آنسوؤں کو ہم دل کو دبا کے رہ گئے

اخگرِ نامراد کی جانِ حزیں نکل گئی
آپ دعا کے واسطے ہاتھ اٹھا کے رہ گئے

80-22 159TH STREET
JAMAICA
NEW YORK NY 11432



تابش مہدی

خطا میں نے کوئی بھاری نہیں کی
امیرِ شہر سے یاری نہیں کی

کسی منصب کسی عہدے کی خاطر
کوئی تدبیر بازاری نہیں کی

مرے عیبوں کو گنوایا تو سب نے
کسی نے میری غم خواری نہیں کی

بس اتنی بات پہ دنیا خفا ہے
کہ میں نے تجھ سے غداری نہیں کی

ہمیشہ سر اٹھا کر میں چلا ہوں
کسی سلطاں کی درباری نہیں کی

مرے شعروں میں کیا تاثیر ہوتی
سرِ محفل اداکاری نہیں کی

اے-۵-جی ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۲۵

شکیل جاوید

بادور شفقت پنہا، امروہہ - ۲۴۴۲۲۱



شطرنج کے مہرے

ایک لمبی اڑان کے مقابلے میں دونوں نوجوان گدھ اس خوفناک جنگل میں آپہنچے تھے۔ جہاں خوراک نام کی کوئی شے ان کے لئے نہ تھی وہ بھوک سے بے تاب تھے، پسینے میں تربتر، ہانپتے ہوئے تھکن سے نڈھال گویا ان کا برا حال تھا۔ یکایک موسم کی تبدیلی سے دن میں اندھیرا چھا گیا تھا ادھر اجنبی جنگل ہونے کے سبب وہ سمتوں کا تعین ہی کھو بیٹھے تھے اس الجھن و پریشانی کے ساتھ ساتھ یہ فکر بھی انہیں ستا رہی تھی کہ قبیلے کے دوسرے تمام ساتھی ان کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ اس مقابلے کی رو سے قبیلے کی سربراہی کا حق دار کون ہوگا؟ ——— یہ فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔

اُن کی پرواز کے سفر میں کہیں کوہسار تو کہیں بیابان، جنگل اور کہیں ریگزار اور ان کا لامتناہی سلسلہ تھا جسے اپنے پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اور شام کا دھندلکا چھا جانے تک وہ اس بھیانک جنگل میں آپہنچے تھے۔ یہ اڑان کا مقابلہ جذباتی طور پر کئے گئے کسی فیصلے کی بنیاد پر نہیں۔ ان کی دانشمندانہ مجلس کا مشترکہ فیصلہ تھا اس لئے انہیں اس اقدام پر کوئی پچھتاوا یا ندامت نہیں تھی۔

واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ ان کے قبیلے کا سردار جب کسی حادثے میں جاں بحق ہوا تو قبیلے کی سربراہی کا سوال تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سوال کے جواب میں تجربہ کار معمر گدھ تجسس کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کی عقل و فہم اور متفقہ رائے سے کس خوش بخت کے سر پر قبیلے کی سربراہی کا تاج رکھا جائے گا جس قبیلے میں کسی کی دل آزاری، کوئی بے چینی، اور مخالفت کی کوئی لہر نہ اٹھ کھڑی ہو، ہر طرف امن و امان اور خوشحالی کی فضائیں مہک اٹھیں اور ترقی کے راستے وا ہو جائیں۔

یوں تو ان کے قبیلے میں نوجوانوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ لیکن اس قبیلے کی ریت صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ کہ کسی نوجوان اور ناتجربہ کار اور سیاست سے تہی۔ رکھنے والے کو قبیلے کی سربراہی کا بار ابھی تک نہ سونپا گیا تھا اور نہ ہی یہ روایت بھی ان سے منسلک تھی کہ بزرگوں کے سامنے منہ کھولنے کی جرأت ان میں نہ تھی یہ بدلتے ہوئے نظام حکومت اور زمانے کے تغیر کا اثر تھا یا کچھ اور بہرحال صدیوں کے بعد یہ موقع ملا تھا کہ قبیلے کے دونوں جوانوں کے درمیان سربراہی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ تاہم بیداری دیکھ کر کم عمر نوجوان، جوان سال اور سن رسیدہ سبھی گدھ فکرمند اور پریشان ہو کر آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

بالآخر متفقہ طور پر یہ طے پایا گیا کہ قبیلے کی سربراہی کا دم بھرنے اور خود کو اس کا اہل سمجھنے والے دو نوجوانوں کے درمیان اڑان کا مقابلہ رکھا گیا۔ مقابلہ کی شرط کچھ اس طرح تھی کہ سورج طلوع ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں گدھ طے شدہ سمت میں پرواز کریں گے۔ اور سورج غروب ہونے تک اپنے علاقہ میں لوٹ آئیں گے۔ ان دونوں میں پہلے واپس آنے والے کو قبیلے کا سردار بنایا جائے گا۔ اس کے برخلاف مقابلے کی اڑان کے دوران اگر کوئی گدھ نیچے اتر کر کہیں تھک کر بیٹھ گیا تو وہ یہ مقابلہ ہار جائے گا۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ساتھ قبیلے کے بے شمار ساتھیوں نے خوشی خوشی عقیدت، دعاؤں اور آشیرواد کے ساتھ انہیں الوداع کہا مقابلے کی تعلیمی جانبدارانہ سیاست سے مبرا ایمانداری سے ہوتا تو انجام تک پہنچانے کے چار تندرست و توانا نوجوان گدھ ان کی نگرانی کیلئے پیچھے پیچھے اڑے۔

اس طرح دن چڑھے تک تو چاروں نگراں گدھ اس پرواز میں شامل رہے۔ اس کے بعد ان کا حوصلہ ٹوٹنے لگا۔ بازو شل ہو گئے پسینے میں تربتر بری طرح ہانپنے لگے۔ نتیجہ یہ کہ چاروں نگراں گدھ یکے بعد دیگرے ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔

اڑان کے دوران جب ان دونوں نے دیکھا کہ ان کی نگرانی کرنے والے چاروں نگراں اس پرواز میں ان کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔

تو انہوں نے بھی آپس میں صلاح کر کے خود کو اس بھیانک جنگل میں اتار لیا۔ جو ان کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر کے لئے یہاں سستا بھی لیں گے۔ اور ان کے کھانے کے لئے بھی یہاں کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ لیکن ان کا سوچا پورا نہ ہوا۔

چند سال پہلے یہ دونوں نوجوان گروہ اس خوبصورت وادی میں سرحدی پہاڑیوں کے اس پار سے آکر اس قبیلے میں شامل ہوگئے تھے۔ یوں تو دیکھنے میں وہ ان جیسے ہی تھے لیکن بہت سی خصوصیات ان میں ایسی بھی تھیں جن کے ظہور پر وہ حیران رہ جاتے تھے۔ اگر کوئی چیز ان میں قدرے مختلف تھی۔ تو ان کی لمبی گردنوں پر بھورے رنگ کا رواں تھا۔ اپنی اس انفرادیت کی وجہ سے ہزاروں کے غول میں بھی وہ دور ہی سے پہچانے جاسکتے تھے۔

ابتدا میں وہ طرح طرح کی پریشانیوں اور آزمائشوں سے دوچار رہے۔ قبیلے کے ہر چھوٹے بڑے نے انہیں شک کی نظروں سے دیکھا۔ لیکن انہوں نے بڑی لگن سے قبیلے کے فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایک دوسرے کے کام میں آتے اس طرح جلد ہی انہوں نے قبیلے والوں کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اور وہ ان میں اس طرح گھل مل گئے۔ جیسے جنم سے یہیں رہتے تھے۔

جب قبیلے کی سربراہی کا معاملہ اٹھا تو مقابلے کی اختراع بھی انہی کے ذہن سے نکل کر ایک تحریک کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔ جہاں وہ اپنے اس فلسفے کو بروئے کار لائے کہ جس قوم یا قبیلے کے پرانے رسمی رواجوں کو اگر بدلنا ہو تو نوجوانوں کو اپنا ہم خیال بنا لو! قبیلے کے ڈرپوک احساس کمتری کے مریضوں پر گویا یہ ان کا پہلا انکشاف تھا۔

وہ بھیانک اندھیری رات تو جیسے تیسے انہوں نے کاٹ ہی لی۔ تھی۔ اور سورج طلوع ہونے پر انہیں سمتوں کا تعین بھی ہونے لگا تھا اس طرح اپنی واپسی پر وہ راستوں میں کھاتے پیتے سہ پہر تک اپنے قبیلے میں لوٹ آئے۔ جہاں ان کے تمام ساتھی بے چینی سے ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔

یہ بات بھی انہوں نے خود طے کر لی تھی کہ ان دونوں میں قبیلے کا سردار کسے بننا ہے۔ اول آنے والوں کو قبیلے کا سردار مان لیا گیا۔ نئے سردار نے قبیلے کے لئے خوراک کا بندوبست کرنے اور ان کو دوسری سہولیات فراہم کرنے کا عہد کیا۔

صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سردار نے اڑان کے مقابلے میں شریک ہونے والے کو اپنا صلاح کار خاص مقرر کیا۔ اس کی اس فراخدلی پر قبیلے والوں کو اچنبھے کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ سردار نے اپنے صلاح کار کے تعاون سے آہستہ آہستہ اس قبیلے کے پرانے رسمی رواجوں کو جدید تقاضوں کے ساتھ بدلنا شروع کر دیا۔ جہاں تبدیلی تکلیف دہ ہوتی ہے وہیں اس میں نئی نسل کو نئے انداز کی باتیں بھی بھلی لگیں۔ جنہیں بنا کسی مخالفت اور رد و بدل کا نہ صرف قبول کیا بلکہ ان پر عمل کرنے کی کوششیں بھی کرتے

قبیلے کا نظام باضابطہ طور پر چلانے کے لئے سردار نے اپنے صلاح کار کے ذریعے کچھ اور ساتھیوں کو بھی یہاں بلوا لیا۔ تاکہ مستقبل میں انہیں پیش آنے والی مشکلات سے نہ جوجھنا پڑے۔

اس دن تو جیسے قبیلہ میں دھماکہ ہی ہوگیا۔

سبھی قبیلے والے حیران رہ گئے سردار نے جب انہیں ایک وسیع میدان میں اکٹھا کر کے قبیلے کی فلاح و بہبود کے لئے نت نئے پروگرام ان کے سامنے رکھتے ہوئے یہ انکشاف بھی کیا کہ ہمارے قبیلے والے سرحدی پہاڑیوں کے اس پار وادی والے علاقے میں جانے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ وہ علاقہ تو بڑا زرخیز ہے خوبصورتی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا وہ خطہ تو خدا کی نعمتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر ہم اسے اپنے علاقہ میں شامل کریں تو ہماری ساری مشکلیں آسان ہوجائیں گی۔ جیسے ہماری بڑھتی ہوئی آبادی، خوراک کا مسئلہ، جگہ کی تنگی وغیرہ وغیرہ۔

سردار کے اس نئے عزم پر ایک بزرگ نے کہا تھا۔

وہ علاقہ تو سردار دوسرے قبیلہ والوں کا ہے۔ اور ان سے ہماری پرانی دشمنی ہے۔ ایسی صورت میں ہمارا وہاں جانا کس طرح ممکن ہوگا تاریخ شاہد ہے۔ کبھی ہمارے اجداد وہاں حکمراں تھے۔ اور ہم آپس میں مالا کے موتیوں کی طرح اکٹھے تھے کوئی بھید بھاؤ نہ تھا ہم سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شامل رہتے تھے۔ لیکن افسوس ہمارے درمیان آج ایک خلیج ہے جسے پاٹنا آسان نہیں۔ ہواؤں کا رخ آج بدلا ہوا ہے۔ اور نئی نسل کے خیالات بھی۔

سردار نے محسوس کیا جیسے ان کے اندر کوئی آتش فشاں چھپا ہوا ہے۔ سردار نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا تھا جس علاقہ پر تم دوسرے قبیلے والوں کا قبضہ بتا رہے ہو اصلیت یہ ہے کہ وہاں کسی کا بھی قبضہ نہیں اور جہاں کسی کا قبضہ نہ ہو اس سے پہلے کہ اس کا کوئی دعویدار بنے وہاں اپنا قبضہ کر لو یا قبضہ سچا۔ دعویٰ جھوٹا۔

اپنے قبیلے والوں کے تحفظات سے سردار اچھی طرح واقف ہو گیا تھا جب اس قبیلے کے بزرگوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی اس خوبصورت سرزمین پر امن و امان بھائی چارے کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ انہیں دوسرے قبیلے کی اکثریت کا خوف تھا نہ اپنی اقلیت کی پروا۔ وہ تو بس جیو اور جینے دو کے حق میں امن سے رہنا چاہتے تھے۔

دوسرے قبیلے والوں نے جب انہیں اپنے علاقے میں دیکھا تو وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ وہ بھلا کس طرح انہیں اپنے علاقے میں برداشت کرتے۔ غم و غصہ اور نفرت کے آتشیں بادل ہر سو منڈلانے لگے۔ چھوٹے بڑے کا امتیاز ایک نفرت بن کر فضاؤں میں پھیل گیا۔ دونوں قبیلوں میں ٹھن گئی۔

آخر سردار کی حکمت عملی رنگ لائی۔ اس نے دونوں قبیلوں والوں کو نہ صرف خون خرابے سے بچا لیا۔ بلکہ دوسرے قبیلے کا بھی سردار بن گیا۔ یہ اس کی ہر دلعزیزی تھی۔ یا کوئی سیاسی چال؟ بہر حال قبیلے کے بزرگ اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکے لیکن اس غیر معمولی تبدیلی پر ان کے ذہنوں میں ایک سوالیہ نشان ضرور ابھر گیا تھا۔ اور شاید سیاسی کا ردِ عمل تھا کہ دونوں ہی قبیلوں میں اب بھی ایک ڈر اور خوف و ہراس سا دل و دماغ پر چھایا رہتا۔ ایک قبیلہ سوچتا کہ وہ تعداد میں ہم سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ کہ ان میں جو ہمت کی کمی ہے ان کا یہ خیال محض انہیں تسلی تو دے سکتا تھا لیکن اس بات کو نہیں جھٹلا سکتا تھا جو کسی ننگی تلوار بن کر ہر وقت ان کی گردنوں پر لٹکی رہتی جس سے وہ ہر وقت خوف زدہ رہنے لگے تھے۔

دوسرے قبیلے والوں کا خیال تھا۔ انہوں نے ماضی میں ہمیں ذلیل و خوار کیا ہے۔ اپنی طاقت کے بوتے پر انہیں دبایا ہے۔ ہمارے قبیلے والوں پر ظلم کر کے اپنے قبیلے میں شامل کیا ہے۔

لیکن اب اس پورے علاقے پر ہم چھائے ہوئے ہیں۔ جہاں جب بھی موقع ملے گا ہم انہیں دبائیں گے۔ اپنے پرانے زخموں کا گن گن کر بدلہ لیں گے۔ کسی طرح بھی انہیں ابھرنے نہیں دیں گے۔ لیکن نفرت سے نہیں محبت سے۔

پورے چاند کی رات تھی ہر طرف چاندنی بکھری ہوئی۔

کہسار اور وادیاں سوئی ہوئی تھیں موسم بہار کی آمد تھی۔ انواع و اقسام کے میوہ دار درختوں پر مختلف رنگ و بو کی کلیاں اور پھول کھل اٹھے تھے جن کی مہک فضاؤں کے دوش پر سوار ہو کر پوری فضا کو معطر و خوشبودار بنائے ہوئے تھی۔ سبھی قبیلے والے عالم بے خودی میں خواب غفلت کے مزے لے رہے تھے۔ ان کی زندگی بڑے امن و امان کے ساتھ گزر رہی تھی۔

وہ خوش نما درّہ جو دونوں قبیلوں کے درمیان کسی سرحد کی طرح تھا۔ وہاں سردار کی خواب گاہ تھی۔ اس کے دروازے پر دو جوان گارڈ بطور محافظ تعینات رہتے تھے۔ جب سردار اپنی خواب گاہ میں ہوتا تو وہ اس کی خواب گاہ کے سامنے ٹھہرے رہتے ورنہ وہ ہر گھڑی ایک ذمہ دار محافظ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ خواب گاہ کے چاروں طرف بہت سے پہریدار تعینات تھے۔ جن کا شمار سردار کے جان نثاروں میں کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سردار نے ایک ایسا دستہ بھی تشکیل کیا تھا۔ جو دونوں قبیلوں کی ایک ایک پل کی خبر گیری رکھتا تھا۔ اسے سردار کی جانب سے بہت سے خصوصی اختیارات بھی حاصل تھے۔

اچانک سوئی ہوئی وادیاں اور کہسار جاگ پڑے۔

ہر طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں گونج اٹھیں۔ معاملے کی نوعیت کا پتہ اس وقت چلا جب دونوں محافظوں میں سے ایک محافظ زخمی حالت میں اپنے ساتھی کو بتا رہا تھا کہ ہمارے قبیلے پر دوسرے قبیلے والوں نے شب خون مارا ہے۔ اس حملے میں ہمارے کافی ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔ پھر بھی وہ بڑی بہادری کے ساتھ ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ تم فوراً جاؤ! اور سردار کو اس خطرے سے آگاہ کر دو!"

اور وہ محافظ اپنے زخموں کی تاب نہ لا کر سانسوں کی ڈور توڑ بیٹھا یہ دیکھ کر دوسرا محافظ غصے میں بھر گیا۔ وہ تیزی کے ساتھ سردار کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اور اس خطرے سے اسے خبردار کیا۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ سردار اپنے صلاح کار کے ساتھ بیٹھا ہوا اطمینان سے گفتگو کر رہا تھا۔ یہ خبر سننے کے بعد بھی جب اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تب محافظ نے اپنی بات کو دوہرایا۔ لیکن سردار اب بھی محو گفتگو تھا جیسے اس نے محافظ کی بات ہی نہ سنی ہو۔

محافظ نے جب تیسری بار سخت لہجے میں اپنی بات کو کہا تو سردار نے غصے میں آ کر اس کی گردن اڑا دی دیکھتے ہی دیکھتے محافظ ٹھنڈا پڑ گیا۔

دونوں قبیلوں میں زوروں کی جنگ جاری تھی چیخ و پکار کی آوازیں وادیوں میں گونج رہی تھیں۔

" معاملہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے، آؤ۔ باہر نکل کر دیکھیں۔؟"

سردار بڑے اطمینان سے صلاح کار کے ساتھ خواب گاہ سے باہر نکلا۔

اس کے قبیلے والوں کے ساتھ جنگ جاری تھی۔ اس حملے میں اس کے بہت سارے بوڑھے، بچے، مرد، عورتیں، اور نوجوان مارے گئے تھے جگہ جگہ لاشیں

[باقی صفحہ ۳۲ پر دیکھئے]



انعام الحق جاوید

مجھ پہ اُترا تھا جو اک شخص صحیفے کی طرح
ذہن میں پھر سے سمایا ہے ارادے کی طرح

کون آواز کی مانند قلم میں آ کر
بولتا ہے مری تحریر میں لہجے کی طرح

جب بھی جذبات کی لہروں میں تموّج اُٹھے
روک لیتا ہے کوئی بڑھ کے کنارے کی طرح

جس نے رد کر دیا بے جان دلیلوں سے مجھے
میرا حق بنتا تھا اس شخص پہ دعوے کی طرح

اس کی ہمراہی پہ اب کیسے بھروسہ کر لوں
حوصلہ دیتا ہے جو مجھ کو ڈراوے کی طرح

● ۷۹۶۔ اسٹریٹ ۹۲، جی ۹/۱، اسلام آباد ۔ پاکستان



اثر غوری

وہ کون ہے ! مرے اندر سفر میں رہتا ہے
لہو کے نام پہ نمائشوں کے گھر میں رہتا ہے

مجھے تو لگتا ہے پاگل ہے گھر کا سنّاٹا
تمام رات جو دیوار و در میں رہتا ہے

عجیب غیر یقینی ہے شہر کا منظر
ہر ایک اپنے ہی سائے کے ڈر میں رہتا ہے

عجیب بات ہے گھبرا کر کے پتوں کا
ہوا کا زور بڑے کرّ و فر میں رہتا ہے

ہم اپنی ناؤ کا رُخ کس طرف کو موڑیں آخر
ہوا گھٹن میں ہے ساحل بھنور میں رہتا ہے

● ۱۶۹/لے/۱۹۸۰-۷-۱۸ نیو مغل پورہ ۔ حیدر آباد



اکرام تبسّم

سلگ رہا ہوں بہت آفتاب کی صورت
ہوا مٹا دے مجھے تو حباب کی صورت

میں تیرے واسطے ہر سانس ہو گیا پت جھڑ
مہک رہا ہے مگر تو گلاب کی صورت

عجیب لوگ ہیں اپنی غرض سے ملتے ہیں
یہ شہر اب تو ہوا ہے عذاب کی صورت

پیا ہے آنکھ کے پیالوں سے گھونٹ گھونٹ تجھے
بدن میں آ گیا ہے تو، تو شراب کی صورت

کسی کی یاد تبسم لبھائے جاتی ہے
جوان جسم کے رنگین خواب کی صورت

● بی ۲۔ ۱۷۷، غالب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن
لاہور ۔ ۱۸



ترجمہ :- سعید انجم
NEBBEJORDET 15
1266 OSLO12 NORWAY

نارویجن :- شیل اسکلسن

تصادم

شیل آسکلسن کو ہم عصر نارویجین ادب میں بہ حیثیت افسانہ نگار بہت اہمیت حاصل ہے۔ انہیں عالمی ادب میں نارویجین آواز بھی سمجھا جاتا ہے۔ ایک نقاد کے مطابق اس مصنف نے ثابت کیا ہے کہ معیار اور مقبولیت ایک دوسرے کی ضد کے بجائے لازم و ملزوم ہیں۔ شیل آسکلسن ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے تھے ان دنوں اوسلو میں رہائش پذیر ہیں۔ اب تک ان کی گیارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ۵ ناول اور افسانوں کے ۶ مجموعے شامل ہیں۔ ان کا آخری ناول ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک ۴ مجموعے افسانوں کے شائع ہو چکے ہیں۔ کہانی تصادم ان کے آخری مجموعے "ایک بہت بڑا اجاڑ بیابان۔" ET STORT ODE LANDSKAP سے منتخب کی گئی ہے [س - الف]

تھوڑی دیر تک وہ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس کھڑا نیچے دیکھتا رہا۔ فٹ پاتھ خالی تھا اتوار کے دن دوپہر کے فوراً بعد کا وقت تھا۔ اسے اپنا اندر بھی خالی سا لگا جیسے فٹ پاتھ کا خالی پن اس کے اندر چلا آیا ہو۔ کمرے کے اندر دوسری طرف کرسی پر بیٹھی اس کی بیوی نے کچھ پوچھا تو وہ چپ ہی رہا حالاں کہ جواب میں صرف ہاں یا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ ایک مکمل طور پر خالی فٹ پاتھ تھا بغیر اس کی طرف دیکھے وہ کمرے سے باہر چل دیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے سنا وہ کہہ رہی تھی اللہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ داخلے کے ہال میں سے گزرتے ہوئے وہ سیڑھیاں اتر گیا۔ اتنا ایسی تھکی ٹھہری دوپہر کے باوجود اس نے انتظار میں باہر نکل آیا اس نے سوچا۔ سورج کی روشنی میں اسے گرمی کا احساس ہوا۔ سڑک پار کر کے وہ دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر سائے میں چلا گیا۔ وہاں رک کر اس نے اوپر کھڑکی کی طرف دیکھا وہ اسے نظر نہیں آئی چار منزلہ عمارت کے سائے میں وہ چل پڑا۔ چند سو میٹر کے بعد وہ چوک کے پاس ایک سفید کار کے گزر جانے کے انتظار میں رک گیا۔ مخالف سمت سے ایک سلیٹی رنگ کی کار آگئی۔ اس کے علاوہ وہاں پر کوئی دوسرا ٹریفک نہیں تھا۔ دونوں کاریں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں اس کی وجہ اتوار کا دن ہوگا

اور یہ شدید گرمی۔ اس نے سوچا۔ دونوں کاریں جب چوک میں پہنچیں تو وہ ٹکرا گئیں۔ سلیٹی رنگ کی کار دائیں طرف کو مڑ گئی۔ اور سفید کار بائیں طرف۔ سفید کار دوسری کار کے الٹے ہاتھ والے پچھلے دروازے سے جا کر ٹکرائی تھی۔ اس مضحکہ خیز منظر میں سلیٹی رنگ کی کار کے ڈرائیور نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے جو منہ میں آیا وہ کہنا شروع کیا۔

لعنت ہے تم پر۔ جہنمی آدمی۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟

میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔

مجھے نہیں دیکھا۔؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم مجھے...... مجھے تم کیسے نہیں دیکھ سکے۔؟

معلوم نہیں۔ میں نے بس آپ کو نوٹس نہیں کیا۔ کیا آپ دروازہ نہیں کھول سکتے

نہیں!... تمہاری میں.... یہ مڑ چکا ہے دوسرا دروازہ ٹرائی کریں

او خدایا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں احمق ہوں۔ تمہارے خیال میں یہاں پر دو احمق اکٹھے ہو گئے ہیں؟

میں کہہ رہا ہوں جناب کہ آپ کو میں نے نہیں دیکھا یعنی

تو بریک تک نہیں لگائے ۔آئیں اور خود دیکھ لیں ۔ بریکوں کے نشان تک نہیں ہیں صاف ظاہر ہے کہ غلطی میری ہے ۔لیکن میں کچھ کر نہیں سکا ۔

کچھ کر نہیں سکا، کچھ کر نہیں سکا۔لعنت ۔کچھ کر بھی سکتے ہو؟

پھلانگتے ہوئے وہ بغلی سیٹ پر پہونچا پھر کار سے باہر آگیا گھوم کر اس نے کار کے نقصانات کا جائزہ لیا۔ دانت بھینچتے ہوئے اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ دوسری گاڑی کا ڈرائیور اس کے پاس آگیا۔ مزید انہوں نے کیا کہا، یہ انطون کو پتہ نہیں چلا جس راستے سے وہ آیا تھا اسی پر وہ واپس چل دیا۔ اسے پسینہ آگیا تھا۔ اسے اپنا چہرہ گرد آلود محسوس ہوا۔ اس کا نہانے کو جی چاہا ۔ اسے اپنی بیوی کھڑکی میں آگے جھکی دکھائی دی اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے دیکھا نہ ہو۔ اس کا کیا قصور ؟ اس نے سوچا اب کہیں پکارنے نہ لگ جائے ۔ اپنی نظریں اس نے فٹ پاتھ پر جما دیں ۔ وہ کر بھی کیا سکتی ہے ۔بس میرے نہانے سے پہلے کچھ نہ بولے نہیں ۔اس نے سڑک پار کی اور دوسری طرف آگیا ۔ پہلے ڈیوڑھی میں داخل ہوا اور پھر سیڑھیاں چڑھ گیا ۔ وہ داخلے کے ہال میں کھڑی تھی ۔

کیا بات ہے انطون ؟

کوئی بات نہیں

کچھ تو ہے انطون ۔ میں نے بات کی تم نے جواب نہیں دیا ۔ الٹا تم اٹھ کر باہر چلے گئے بتاؤ کیا ہے؟ پلیز!

کچھ بھی نہیں ۔میں ذرا نہا لوں ۔

بھلے آدمی بنو انطون ۔تم مجھ سے اس طرح لاپرواہ ہو جاتے ہو کہ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ میں کیا سمجھوں ۔

تم کچھ بھی مت سمجھو ۔میں چل کے نہاتا ہوں

وہ غسل خانے میں چلا گیا ۔اس نے کپڑے اتارے سمجھنے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں ۔اس نے سوچا وہ نہیں سمجھے گی ۔ اس میں اتنی سمجھ کہاں ۔ اس نے پانی کھولا ۔ ٹونٹیوں کو اس طرح گھمایا پھرایا کہ ٹھنڈا یخ پانی آنے لگا وہ دھار کے نیچے اس طرح جم گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے اس کے ذہن میں کچھ دیر اور غسل کر لینے کے علاوہ کوئی خیال نہیں آیا ۔ پھر اس نے زیادہ دیر تک ایسے نہیں کیا پانی بند کیا اور کموڈ کے ڈھکن پر بیٹھ گیا ۔ شاید سب قصور اتوار کے دن کا ہے ۔اس نے سوچا۔ کئی منٹ تک وہ سکون کے ساتھ وہاں بیٹھا رہا ۔ پھر بالوں کو خشک کرنے کے بعد اس نے کپڑے پہن لئے ۔ کافی بنا کر وہ بالوں میں کنگھی لگائے بیٹھی تھی اسے دیکھ کر وہ اداسی سے مسکرائی اس نے ہمت سمیٹی ۔

مزہ آگیا ۔ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گیا ۔

وہ کافی انڈیلتے ہوئے بولی : کیا مجھ سے جی بھر چکا ہے ؟

ویرا ۔ تم ہر بات کو اپنی طرف لے جاتی ہو ۔ اس کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے ۔

کیا تم کسی اور کے ساتھ ......

نہیں اگر ایسا ہوتا تو بات کا تعلق تمہارے ساتھ بھی ہوتا

تعلق میرے ساتھ تو ہے ۔تم نے میری بات کا دو دفعہ جواب نہیں دیا اور یہ میں تھی جس کے پاس سے تم اٹھ کر چلے گئے ۔ بغیر کچھ کہے

وہ اس بات کا تعلق صرف میرے ساتھ ہے ۔ میں اور یہ لعنتی اتوار ۔

لعن طعن نہ کرو پلیز ۔

تم تو جانتی ہو کہ اتوار کے دن مجھے کیا کچھ ہو سکتا ہے ۔

یہی تو ایک دن ہے جو صرف ہمارے لئے ہوتا ہے ۔

اس نے جواب نہیں دیا ۔ ہاں اس کی طرف دیکھا ضرور وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی ۔

تم نے جواب نہیں دیا ۔ وہ بولی ۔

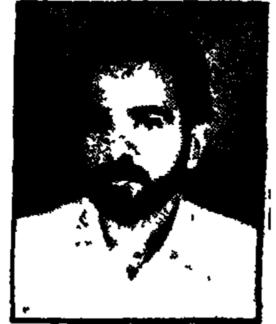
کوئی جواب ہے ہی نہیں ۔کافی کے لئے شکریہ ۔ وہ کھڑا ہو گیا ۔

تم نے تو یہ پی ہی نہیں ۔ اس نے کہا ۔

پی ہے ۔ وہ بولا

انطون بچے نہ بنو ۔ تم نے نہیں پی ۔

پی ہے ۔ میں نے پی لی ہے ۔ *



ارشد کمال

ذمّہ داری

حصارِ خوف و ہراس توڑو
تم اپنے شہپر نیوں سمیٹو
زمیں سے اٹھو، فلک پہ پہنچو
پھر اِس جہاں پر نگاہ ڈالو
خدارا اپنا مقام سمجھو!

شعورِ مخصوص جو ودیعت ہوا ہے تم کو
ذرا تم اس سے جو کام لے لو،
تو شورِ شب خوں جو ہر طرف ہے
یہ خود بخود ہی خموش ہوگا۔

یہ العطش کی صدا جو ہر سمت اٹھ رہی ہے
تم اس پہ لبیک کہہ کر اپنی
فراست کا در خدارا کھولو!

خزاں کی محفل میں رنگ و بو کے
مذاکرے کی سبیل تم ہو،
تمہارے شانوں پہ ذمّہ داری ہے کتنی سمجھو
کہ منحصر ہے بقائے عالم
فقط تمہیں پہ!

۳۲۲، بٹلہ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵



ترجمہ: ریحان ثروت

نوحہ

ناقابلِ سراغ بادل
رنگ برنگے پھول
لہراتے ہوئے آبشار
جھلملاتے ہوئے ستارے
مافوق الفطری دلکشی کا رنگ لیے
ایک غیر ارضی حسن کی تصویر کرتے نظر آتے ہیں
لیکن جب میں انھیں قریب سے دیکھتا ہوں
تو یہ بالکل بے رونق معلوم ہوتے ہیں
جو کہ احمقانہ خون ریزیاں
نیز عہد تا بہ عہد ناقابلِ بیان اذیتوں
کے بین ثبوت ہیں۔
میں اپنی نصف حیات اس شخص کو بخش دوں گا
جو ایک روتے ہوئے بچّے کے لبوں پر تبسّم بکھیر سکے
اور بقیہ آدھی زندگی اس فرد کو دے دوں گا
جو ایک گلِ شگفتہ کو زمانے کے دست برد سے محفوظ رکھ سکے
میں ایک نغمۂ جاں فزا کی خاطر ہزاروں سال چلتا رہوں گا
اور گلِ بکاؤلی کی خوشبو کے ہمراہ
سارے پر شور سمندروں کو عبور کر لوں گا
میں جو کہ انسانیت کی تمام تر ذمہ داریوں کے ساتھ ایک انسان ہوں
آخر کس طرح انسانوں کو بھٹکتے ہوئے خون کے دریا میں سکون پا سکتا ہوں؟

کاغذی محلہ - بہار شریف (نالندہ) بہار



حنیف ترین

سوچ

لہو ترا پئے گی
سفیدی سر کو اک دن بخش دے گی
پسینہ بن کے ماتھے پر اُگے گی
تجھے برباد کر کے بھی ہنسے گی
یہ آنکھوں کی نمی پی کر بڑھے گی
ارادوں میں پلے گی
تری آنکھوں کی نیندیں چھین لے گی
چلن پلکوں کو دے گی
کبھی محفل میں تنہا چھوڑ دے گی
کبھی اک بوجھ خود تجھ پر بنے گی
یوں ہی تا عمر تیرے ساتھ جب ہنس کر چلے گی
تو گونجی سوچ یہ کندن بنے گی
حیاتِ نو کے ہر اک زاویے کو
کسی دن خود ہی روشن کرے گی!

DIRECTOR
MUSTOSAF AL JUDEEDAH
ARAR-NORTH (K.S.A)

مکتوبات

رام لعل:۔ ڈی ۲۲۹ اندرا نگر لکھنؤ۔۱۶

شاعر شمارہ نمبر دس میں انور خان کا افسانہ نمبر ہو سکے تو بسر کیجے' قابل توجہ ہے۔ انہوں نے بظاہر تو گزشتہ برس کے بیت ناک مرض طاعون کو اس کا موضوع بنایا ہے لیکن در اصل ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ضعیف الاعتقادی اور عصری سیاست پر بہت گہرا تبصرہ ہے۔ اس میں پروفیسر علیحدہ 'انگلی ہوش' ایک نئی شناخت کا حامل ہے۔ جو ہر جہ واحد متکلم کی سیز پر چھوڑا جاتا ہے 'اس میں درج ساری باتیں بھی فکر انگیز ہیں لیکن اس پرچے کے محرک کا نام حسین الحق لکھا گیا ہے یا غالباً اس کی وضاحت بہر حال حسین الحق کے ناول 'فرات کے آخری حصے کے حوالے سے بھی کی جا سکتی ہے۔ انور خان کی زبان بہت ہی خوبصورت' جاندار اور حقیقت افروز ہے۔ انہیں بیانیہ پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔ اور نئی نسل کے معتبر افسانہ نگاروں میں ان کا نام یقیناً محفوظ ہے۔ اس شمارے میں پروفیسر سید محمد عقیل کی تصنیف مرثیے کی سماجیات پر نامی انصاری کا تبصراتی مضمون بھی قابل ذکر ہے۔ انہوں نے عقیل صاحب کی تصنیف کے اہم ترین گوشوں پر بہت عالمانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

بلراج کومل۔ ای۔ ۲۹ کالکاجی۔ نئی دہلی

شاعر کا تازہ شمارہ ملا حسن ترتیب' مضامین نظم و نثر کے معیار اور تراجم نے اس شمارے کو بہت بہت بنا دیا ہے۔ آپ نے غیر متوقع طور پر میری دو نظمیں شامل اشاعت کی ہیں اس توجہ اور محبت کے لئے ممنون ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ نے حروف ریڈنگ کی بے احتیاطی کے باعث مجھ پر ایک ستم بھی کیا ہے۔ نظم 'دھوپ' کی ڈرافٹنگ RUN ON LINE کی صورت میں ہے لہٰذا ہر مصرعہ آنے والے مصرعے میں ضم ہو کر اپنی تکمیل اور پیش قدمی کا امکان تلاش کرتا ہے۔ پہلے کالم کا آخری مصرعہ "ہیں۔ شام تک" اسی RUN ON LINE کا نقطۂ اختتام ہے جو دھوپ کل تک سے شروع ہوتی تھی۔ یہ نقطۂ اختتام چونکہ مکمل رکن کی مدد سے وجود میں آیا ہے لہٰذا دوسرے بند کے پہلے مصرعے کی صورت یہ "تھی" "یہ وہی دھوپ تھی" اس صحیح صورت کو "تھی وہ دھوپ تھی" میں بدل کر آپ نے یا کاتب نے ناموزوں کر دیا۔ نظم 'دھوپ' کے دوسرے کالم کے پہلے مصرعے کو یوں پڑھا جائے "یہ وہی دھوپ تھی۔"

شمیم صبائی متھراوی ۳۳۲ ڈی۔ اسٹریٹ ۳۸۔ ایف۔ سکس۔ ون' اسلام آباد

اکتوبر ۱۹۹۴ کا شمارہ پیش نظر ہے۔ آپ کی سعی مشکور ہے کہ آپ اپنے دادا علامہ سیماب اکبر آبادی اور اپنے والد اعجاز صدیقی صاحب کے ورثے کو خوبی کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ "شاعر" کے معیار کو قائم کیے ہوئے ہیں۔

اکتوبر کے شمارے کا سرورق بے حد پسند آیا۔ غلام ابندی کی "حسرت دیدار" کا عکس بہت خوب ہے۔ آج سے ۴۰ سال پہلے صرف "شاعر" سرورق پر لکھا ہوتا تھا اور وہ بھی سادہ لفظوں میں۔

آپ کے شمارے میں نظم کا حصہ تو جاندار ہے مگر مقالے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ نامی انصاری کی مرثیے کی سماجیات پر ایک نظر خوب ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی نے پہلی مرتبہ مرثیوں کی سماجی صورت حال پر غور کیا ہے۔ جو خوب ہے۔ محسن بھوپالی صاحب کی نظمیں بھی خوب ہیں۔ مظفر حنفی' ظفر گورکھپوری اور شارق جمال کا کلام پسند آیا۔ مہندی ٹونکی کا "پتاجی پلیز" آج کل کے معاشی حالات پر ایک طنز ہے۔

محسن اللہ' ظفر صہبائی اور رشید ترابی کی غزلیں بھی عمدہ ہیں۔ صحیح بلراج کومل کا ایک خط — "باتیں ہزار" بھی پڑھا وہ صحیح کہتے ہیں کہ "جدیدیوں نے مغربی اصطلاحیں اور موضوعات تو وافر مقدار میں درآمد کئے لیکن احساسات مستعار نہیں لئے جا سکے۔ نصب میں سے نامانوس ترین اور کریہہ الصورت الفاظ تلاش کر کے کیا اور تاریک مضامین کی ادائیگی کو جدیدیت کی معراج تصور کیا گیا ہے"۔ اس شاعری کا کیا جواب کہ

مکری میں میں کرتی ہے — تکرار و رنگتا ہے

کارنی جامیوس کی شعری کتاب سے احمد سہیل نے جو ترجمے پیش کئے ہیں اس کے بارے میں اس وقت تک کچھ نہیں کہا جا سکتا جب تک اصل۔ دیکھ لی جائے۔

شہناز کنول اور آصفہ نشاط کے کمال چکر' اور 'رنگ' بھی پسند آئے۔ ان خواتین نے اپنی تخلیقات میں زمانہ نقطۂ نظر خوب پیش کیا ہے۔ آصف فرخی کے "لارا کنگھن" کے ترجمے بھی اچھے ہیں۔ ایسا سلسلہ برقرار رکھئے تاکہ اردو کا دامن دوسری زبانوں کے ادب سے مالا مال ہو۔

تنقیدی مضامین کی تعداد بڑھایئے ہندوستانی کتابوں اور رسائل پر تبصرے کرایئے۔ تاکہ پڑوسی ملک پاکستان کو معلوم ہو سکے کہ ہندوستان میں رفتارِ ادب کیا ہے۔

علی امام نقوی۔ ۳۰۳/۵۲ 'نیا نگر' میرا روڈ۔ تھانے

رثائی ادب جس تحقیق و تنقید کا مستحق ہے۔ اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اردو ادب کے اس قیمتی سرمایہ پر صحیح ڈھنگ سے کام کیا جائے تو دنیا کے ادب میں اس کا جواب مشکل سے ملے گا مگر اس کا کیا کیا جائے شبلی انیس و دبیر کے موازنہ سے آگے نہ بڑھے اور ترقی پسند نقادوں میں سید اعجاز حسین "ادب و ثقافت اور فنون لطیفہ پر حسینی اثرات" اور احتشام حسین نے "شہادت حسینؑ کا نفسیاتی پہلو" کے ذیل میں بس اتنا ہی تحریر کیا ہے کہ "دنیا اس واقعہ سے کسی نہ کسی عنوان سے واقف ہے کہ فلسفیوں کے دماغ نے شاعروں کے قلم نے اور بڑے بڑے ادیبوں نے اس واقعہ کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے"۔

رثائی ادب سے بے اعتنائی کے کچھ خارجی و داخلی اسباب بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسے خالص مذہبی چیز سمجھ کر قابل توجہ نہ سمجھا گیا۔ دوسرے یہ کہ اس پر تنقید کرنے سے مذہبی منافقات پیدا ہونے کا خدشہ بھی تھا۔ سلیم احمد غالباً وہ پہلے ناقد ہیں جنہوں نے میر انیس پر اپنے ایک مختصر سے مضمون میں وہ بنیادی سوال قائم کیا تھا جس پر ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کی کتاب "مرثیے کی سماجیات پر ایک نظر" کی پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ عقیل صاحب نے تجزیے کے ذیل میں جو ضمنی سوالات اٹھائے ہیں' ان کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے کیونکہ مرثیہ نگاری کو اگر ادب تسلیم کیا جائے گا تب مرثیے کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے حسن و قبح سے بھی بحث ہوگی (اس طرف نامی انصاری نے بھی اپنے تبصراتی مضمون میں اشارہ کیا ہے) عقیل صاحب کی کتاب ان حضرات کو یقیناً پسند نہیں آئے گی۔ جنہوں نے مرثیہ کو محض رونے کا ذریعہ تسلیم کر رکھا ہے خود عقیل صاحب نے "کچھ باتیں" کے تحت اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن یہ طے شدہ امر ہے کہ موصوف نے رثائی ادب پر سماجی حوالے سے بحث کرنے کی جرأت کی ہے۔ کتاب میں کچھ باتیں ایسی بھی در آئی ہیں جن سے فاضل مصنف کی اپنی ترجیحات اور ان کے مخصوص فریم ورک کا پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً انیس مرثیوں میں شرفا کے مسئلہ پر جو بحث عسکری نے کی ہے اس کا سیاق و سباق ہرگز وہ نہیں جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے بیان کیا ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر موصوف سے ایک تسامح بھی ہوا۔ دعوت ذوالعشیرہ کی جو تعریف (غرض و غایت) آپ نے بیان فرمائی وہ بھی درست نہیں ہے۔ جوش کے مسدس کو ڈاکٹر صاحب نے کئی جگہ مرثیہ تحریر کیا ہے۔ جبکہ سید قدرت نقوی "اردو مرثیہ پر ایک نظر" میں لکھتے ہیں۔

"حکیم احمد ایک مرثیہ گو شاعر گزرا ہے اس نے مسدس میں مرثیے لکھے ہیں"۔

سلیم احمد اور عقیل صاحبان کے بنیادی سوال کی مسلمہ حقیقت سے قطع نظر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمام مرثیہ گو شعرا مرثیے ہندوستانی سماجیات' کے علاوہ واقعہ کے اصل پس و پیش منظر میں تحریر کرتے تو کیا ہم ہندوستانی ان مرثیوں سے اپنائیت محسوس کرتے؟ اور کیا اس صورت میں مرثیہ وہ چھاپ چھوڑ پاتا جو آج تک دل و دماغ پر قائم ہے؟ سید محمد عقیل صاحب کی اس رائے سے شاید ہی کوئی اتفاق کرے کہ "امام حسینؑ کی شہادت کے بعد برسرِ عام جلسوں اور مجلسوں میں واقعات کربلا کا بیان کرنا بنو امیہ کے خلاف ایک احتجاجی تحریک تھی"۔ یہ نتیجہ تاریخی حقائق سے صرف نظر کرتے ہوئے اخذ کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ باطل کے پردے ہٹانے اور حق کو آشکار کرنے کا فرض بنتِ علیؑ نبیرا حضرت زینبؑ کے ان خطبوں

لے اڑا گیا جو جنتی سمیر کی زندگی کے دوران آپ سے کوفہ و شام کے بازاروں اور خود مدینہ کے دربار میں دیتے تھے۔ مجلس کی بنا تو بہت بعد کو ڈالی گئی تھی اور ان مجالس کا مزاج یقیناً وہ نہ تھا جو برصغیر میں رائج رہا ہے۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ شکیل صاحب نے کامل مرتبہ کا ادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔

یعقوب مرزا۔ 19-HARRIMONTON DRIVE LENTON SANDNOTTINGHAM

شمارہ نمبر دس میں آپ کا اداریہ "منشیں سے یہاں کا حکمی" پڑھا۔ میرے تاثرات حاضر ہیں۔

پورے دور میں دنیا کے تمام مذاہب نے داخلی اور خارجی جنگیں لڑی ہیں۔ میں قائل ہوں کہ "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ اتحاد یا تو مذاہب میں کون سی کشش رہ جائے گی کہ انسان اس سے منسلک رہے۔

دنیا میں سائنس کی ترقی سے مذہبی نے اری پیدا نہیں ہوئی۔ یوں تو سب سے شدید اس دور کے لوگ بھی لادینیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن چند سال پہلے ایک نوبل پرائز حاصل کرنے والے سائنس داں نے بیان دیا تھا کہ جب بھی اس نے کوئی نئی چیز دریافت کی تو اسے اس میں خدا کی شان نظر آئی۔

انسان کی زندگی پر سیاست دانوں کا راج ہے اور سائنس سیاست کی لونڈی بنی ہوئی ہے۔ یوں انسان قیامت کو قریب سے قریب تر لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لہٰذا "منشیں سے یہاں کا حکمی" قیامت کے بعد ہی ہوگا جب کوئی مندر رہے گا نہ مسجد۔ کوئی کلیسا نہ حرم۔

★ سلطان محی الدین انجم ——— اے وساتی پارٹ اندھیری (ایسٹ) بمبئی ۳

فکر امروز میں حضرت سیماب اکبر آبادی کے افکار شائع کر کے آپ ہم پر بہت احسان کر رہے ہیں۔ ہر بات پر فکر ان کی وسیع دلیل ہے۔ مستقبل میں ان کے افکار پر ریسرچ کیا جانا چاہیئے۔ ان افکار کو کتابی شکل میں شائع ہونا چاہیئے۔ سرورق خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طرح سے "شاعر" اب معتبروں کی نشوونما بھی کرنے لگا ہے۔ یہ قابل تعریف عمل ہے۔

★ محمد اسلم ——— پوسٹ بکس نمبر ۱۶۹۶۲ اندھیری بمبئی ۵۸

خبرنامہ نے متوجہ کیا۔ اردو زبان کے تعلق سے آپ نے جو کچھ اب لکھا اور جو کچھ لکھتے رہے ہیں اگر اس پر صدق دل سے عمل کیا جائے اور چند لوگوں کے مفادات کو نظر انداز کر کے کام کیا جائے تو اردو کے مستقبل کی توقعات بہتر ہو سکتی ہے۔ دراصل ملک کی تقسیم سے پہلے ہی اردو زبان کو متنازعہ بنا دیا گیا تھا اور بتدریج موجودہ صورت حال تک پہنچا دیا گیا جس کا تعارف آپ نے اپنے خبرنامہ میں کھینچا ہے۔ دور درشن کے ہندی سیریل، ہندی فلمیں اور بعض ہندی اخبارات میں اردو الفاظ کا استعمال، اردو مخالفین کی ایک سوچی سمجھی منصوبہ بند سازش ہے جسے اردو والے اب تک سمجھ نہیں پائے ہیں۔ ہم اردو والے یہ سوچ کر خوش ہوتے ہیں کہ اردو لفظوں کا چلن فلموں، ٹی وی سیریلوں اور ہندی اخبارات میں بڑھ رہا ہے بھلے ہی وہ ہندی کے نام سے ہو۔ اردو بہر حال زندہ ہے۔ لیکن اردو کے کٹر مخالفین اردو سے نفرت کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کا عوامی اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا ہے۔ ہم بھلے ہی رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم سے لے کر موجودہ زمانے کے سریندر پرکاش، کملیشور، جوگندر پال کا نام لے دیں وہ اردو کو مسلمانوں کی زبان ہی سمجھتے رہیں گے اور عوام کو بھی کھاتے رہیں گے۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ہندوؤں نے بھی اسے روزگار زبان کہا تھا اور شہرت کے حصول کا ایک ذریعہ۔ اگر وہ اردو کو واقعی اپنی زبان سمجھتے تو اپنی عورتوں کو بھی اردو زبان کی تعلیم دلاتے اور ایسا ہوتا تو آج شاید یہ صورت حال ہی پیدا نہ ہوتی۔

◆ بقیہ صفحہ ۲۶ شطرنج کے مہرے ◆

بکھری پڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر سردار کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ صلاح کار سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اب ہمارا ایک پل بھی یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔"

"لیکن سردار! ——— ہماری بچھائی ہوئی اس سیاسی بساط کا کیا ہوگا جس کا یہ آغاز ہے۔" صلاح کار سراپا حیرت بنا ہوا تھا۔

"وہ اسی طرح برقرار رہے گی کیونکہ انہی میں ہم اپنے جان نثار چھوڑے جا رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر سردار نے اپنے پنکھ پھڑپھڑائے جیسے وہ کسی لمبی اڑان کا ارادہ کر رہا ہو۔

سرفلک کہسار، سرسبز خوشنما وادیوں کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے سردار نے نیچے دیکھا۔ اور اپنے صلاح کار سے کہنے لگا ——— "تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ لڑائی ختم ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں، تم دیکھنا یہ اسی طرح آپس میں لڑتے رہیں گے ———!"

"پھر اس لڑائی سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا سردار ———؟"

"نادان! اگر یہ اسی طرح لڑتے رہے تو وہ دن دور نہیں کہ ہم جہاں قابض ہو جائیں گے۔ اور یہ سارا زرخیز علاقہ ایک دن ہماری مٹھی میں ہوگا۔"

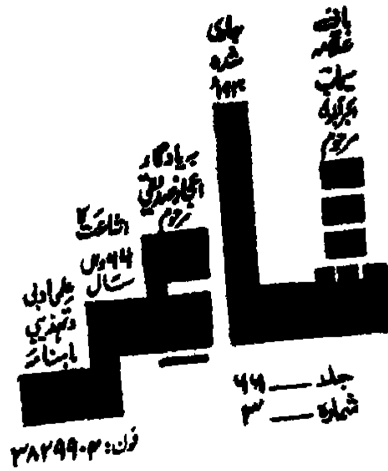
◆ بقیہ صفحہ ۲۲ - آرائش

سینے سے ہٹایا تو نوک کی کیل ان کے سویٹر کے تاگے میں اٹک گئی۔ مارے درد کے میں تڑپ اٹھی۔

مجھے یقین ہے اس وقت میرا وہ آبدار ہیرا، کیل سے گر کر ان کے سویٹر کی ادنیٰ کشیدہ کاری میں کہیں اٹک گیا تھا۔

میں فوراً ہیرا لانے ان کے گھر جانے کے لئے مڑی۔ مڑتے ہی میں حیران رہ گئی جیسے میرے پیر زمین سے چپک گئے ہوں۔ دروازے میں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا دروازے میں بپا چٹان کی طرح باہر سے آتی ہوئی روشنی کو روکے ٹھہرے تھے۔

قبل اس کے کہ دل میں حوصلہ پا کر میں قدم آگے بڑھاؤں بپا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "تم تیار ہو جاؤ۔ تمہیں دیکھنے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔" میرے پیروں کی طاقت جاتی رہی۔ ہاتھ جواب دے گئے۔ آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔ میں گرتی دیوار کی طرح ڈھیر ہو گئی۔ میرے اندر کی عورت آرائش کی چیز کے لئے رونے لگی۔



مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۵ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

فکرِ امروز





ہماری شاعری ماحولی خصوصیات کی حامل ہونی چاہئیے اور زیادہ سے زیادہ فطری۔ ہمارا ہر شعر اپنی جامعیت، اکملیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل نظم ہونا چاہئیے۔ ہماری ہر نظم ضروریاتِ زمانہ کے مطابق، اہلِ ملک اور فرزندانِ وطن کے لئے مستقبل کا ایک پیغام ہونی چاہئیے۔ اور ہماری ہر غزل حقائق و معارف اور جذباتِ عالیہ کا ایک ایسا آئینہ ہونا چاہئیے جس میں ہمارے نوجوان ماضی، حال اور مستقبل کا صحیح ادراک کر سکیں۔ جو ہمیں تدبیرِ منزل اور شاہراہِ ترقی بتا سکے اور بلند و لطیف محاکات سے ہماری روح میں کیف و تسکین کی موجیں پیدا کر سکے۔

[۲۹ نومبر ۱۹۳۰ء]

— سیماب اکبرآبادی

حیرت شملوی بنام دور آفریدی

[illegible handwriting]

पोस्ट कार्ड
POST CARD

केवल पता
ADDRESS ONLY

INDIA

[illegible handwriting]

کمرہ نمبر ۳۸ — چوتھی منزل

وزیر مینشن —

۲۵۹، ابراہیم رحمت اللہ روڈ

بمبئی ۳ Bombay, 3

عبدالمجید حیرت شملوی [پ: ۳-۴-۱۹۰۴، شملہ - م: ۹، ستمبر ۱۹۶۲، کراچی] نے نظم ونثر میں خاصہ کچھ لکھا تھا۔ مرحوم عمر بھر پریشان حال رہے۔ شملہ، دہلی، ٹونک (راجستھان) رامپور، لاہور، سکھر اور پھر کراچی۔ معروف محقق اور ادیب انیس شاہ جیلانی [محمد آباد، تحصیل صادق آباد، پاکستان] حیرت مرحوم کی تمام تحریروں کی یکجائی میں جنون کی حد تک مصروف ہیں۔ اور تعاون کے خواہش مند۔ [[illegible]]

فن پارہ — کیا ہے، کیا نہیں؟

میرے خیال میں شاعری کی تعریف کرنا ایسا ہی ہے جیسے خدا کی تعریف۔ شاعری ایک پیچیدہ ترین عمل ہے۔ پھر جب شاعری کی کوئی معینہ تعریف ہو ہی نہیں سکتی تو یہ طے ہے کہ آپ اپنی ذہانت و مطالعے کی اساس پر ترجیحات و توضیحات کے ذریعے کسی شاعر کو اچھا، برا، چھوٹا، بڑا۔ ابتر و کمتر ہو بنانا چاہیں گے، وہ دلیلوں اور حوالوں سے ثابت کر دیں گے (افکار (کراچی) اور ساقی (کراچی) کے جوش نمبر، ایک اہم مثال) لیکن فن پارہ اور فن کار اپنی جگہ دھرے رہ جائیں گے۔ شاعری کی تنقید کے ساتھ بیشتر یہی ہوا ہے کہ کسی فن پارے میں اترنے کے بجائے اس کے اطراف و اکناف کی باتیں کرنا اور اپنے مبلغ علم کا مظاہرہ کرنا۔ اپنی پسند ناپسند کے اظہار میں انتہا پسند ہو جانا جب کہ کسی بھی فن پارے کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنا زاویۂ نگاہ درست رکھیں فن پارے کو بالکل انفرادی حیثیت سے دیکھیں۔ شعور کی آنکھ اور فن پارے کے درمیان کے مناظر بالکل صاف اور واضح ہوں یعنی بلا واسطہ ہمیں اس عمل سے گزرنا ہوگا۔ زاویۂ نگاہ اور فن پارے کے درمیان جو کچھ ہے، وہ اور فن پارہ دو علاحدہ چیزیں ہیں۔ شعری شخصیت کو سمجھنا اس کی ذہنی ساخت کا اندازہ کرنا فن کار کے اندرون میں جو جہاں آباد ہے اس تک رسائی اور فن پارے کی تہہ میں اتر کر ان پیکروں کی تشکیل کرنا جو حرفوں اور لفظوں میں کہیں گم ہیں۔ پہلے سے طے شدہ مفروضوں اور کلیوں سے مدد تو لی جا سکتی ہے لیکن صرف انھیں پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے بلکہ اچھی اور سچی شاعری کا وصف یہ ہے کہ وہ قاری اور سامع کے ساتھ مکالمہ کرتی ہے قاری، سامع اور شاعری کے درمیان ہر طرح کا مکالمہ ضروری ہے لیکن یہ مکالمہ ان لوگوں کے لئے نہیں جن کی ذہنی تربیت ہی نہ ہوئی ہو یا ہو بھی تو اکثری شاعری کی عادی ہو جیسا کہ شعری متن میں لفظ و معنی روشن ہوئے بغیر سامع قاری بس ایک ہلکی واہ کے ساتھ آگے بڑھ جائے۔ اور اسی کو شاعری سمجھ لینے کی غلطی کرتا رہے۔

شاعری یا افسانے میں معاشرے کے نفسیات داں ہونے کا گمان بہت سے قلمکاروں کو ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کا ذہنی مرض ہے۔ یہی مرض آج کی شاعری کا غالب رجحان ہے۔ عمیق مشاہدوں اور تجربوں سے گزرے بغیر، اوڑھے ہوئے خیال چبائے ہوئے جملے معنوی تراکیب و استعارے، پیچ دار کاہل، اور ایک طرح کا سجا سجایا اوپری پن یہ سب کچھ شاعرین حضرات کو آسانیاں تو فراہم کرتا ہے لیکن کسی اچھی، سچی اور بڑی شاعری کے امکانات روشن نہیں کرتا، اگر شاعر تقلید کا ہے، تو یہی خصوصیت کسی شاعر کو امکانات سے قریب کرتی۔ میرے خیال میں اپنی شاعری سے دنیا کی تفسیر و تعبیر کرانے کسی فلسفے کی تشکیل و تعمیر کے لئے مروجہ فقہ کی کتابوں اور سیاسی ادارے ضروری نہیں۔ تخلیقی عمل کی ایک تعریف یوں بھی ہو سکتی ہے کہ پہلے سے موجود کسی فن پارے سے مختلف کوئی فن پارہ ہو۔ (جاری)

منصور سبزواری

اندر اندر راکھ ہوا ہوں باہر سے تابندہ ہوں
کب سے دو متضاد تماشوں پر میں زندہ ہوں
ہانپ رہا ہوں گلی گلی پہچان کا بوجھ اٹھائے
میرے شناساؤ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں
صبح کی صورت کھڑکی میں چاندی کا ہاتھ رکھوں
میں جلسا تی دوپہروں میں خواب دہندہ ہوں
کون ہو تم ؟ یہ پوچھ رہی ہیں میری جڑیں مجھ سے
حسب نسب کے ملبے تھا میں اک کارندہ ہوں
پڑا ہوں اک گیراج میں ٹوٹے ٹائر کی مانند
قیمِ منفر پہ شہری صدیوں کا باشندہ ہوں
ڈھلتی عمریں بدل دیتی ہیں رتبے اور منصب
کل تک نغمۂ ساز تھا آج فقط سازندہ ہوں
میرے تیرے بیچ سمجھ کا بل ہی ہیں کوئی
گجر تو پچھلے وقت کا ہیں ؟ دو آئندہ ہوں

(۲)

اطراف ہیں نئے نئے آفاق کیا کریں ؟
ہم منظرِ قدیم کے مشتاق کیا کریں ؟
مشکوں رگوں میں دل کی لہو ہے نہ آب ہے
مفلس ہیں جسم و جان سے رزاق کیا کریں
ہر سو بکھر رہا ہے دریدہ بدن کتاب
جن پر ہے تیرا نام وہ اوراق کیا کریں
گیان جنگلوں میں ہے جو دھونی رما کے رات
اب جگنوؤں کے دیکھنے چقماق کیا کریں
بے تربیت ہیں مکتب مکر و ریا سے دور
ہم وحشی لوگ صورتِ اخلاق کیا کریں
اس دھندل روشنی کا نہیں کوئی بھی علاج
بوڑھے چراغ ہوں تو نئے طاق کیا کریں

(پرسم آفتی فرنج - ضلع گوجرانوالہ (پنجاب))

نسیم اعجاز

من بھٹکاؤ کا بھید ہے، دھوپ چھاؤں کا جال
سیدھی سچی راہ پر ، ٹیڑھی میڑھی چال

منگتے کا کیا مانگنا ، کیا داتا کا دان !
دکھ کی جھولی منہ لگی ، سکھ کی بے ایمان

اک ہانڈی کا شوربہ ، الگ الگ تقدیر
میں جا گھروں باسی کڑھی ، تو چاکھے تو کھیر

مالو کی تابت چھپی ، چبھ سُرت کا سنگ
بہناوے سے ڈھب دیکھے لوبل بچن سے ڈھنگ

ورشش دیکھو تو ورشش لکھو ، لکھو سترہ لاسین
ہر جنگل میں سانپ ہیں ہر من بن میں بین !

من چنگاری دم بڑی دھریں دھریں کی جیت
اونگھے تو بس کلپنا جاگ پڑے تو پیت

آتے جاتے دوست ہی اپنی ڈاک نیال
ہم گھر بیٹھے آپنے ، جانیں شہر کا حال !

نیند سفر کی دھار پر دے گئے رستے جل
من سیتر باقی رہا ، ٹوٹے ذہنی پل !

(فہ) دبلا ہاتھی جان کرے گھبرا گھبرا جائے !
روز مہاوت خوف سے ، اپنا وزن کرائے

اپنی اپنی سوچ ہے ، سوچ سوچ کی دھار
دنیا ناپے چال کو ، ہم ناپیں رفتار



مرزا حامد بیگ
گورنمنٹ کالج، اٹک (پاکستان)

فرانز کافکا کا جہان

تخلیق کار کا رزق اس کے ذہن اور یادوں کے پٹارے میں ہے۔

اس قدیم کہاوت کے معنی فرانز کافکا کے زندگی کرنے کے چلن اور تحریری سرمائے کو دیکھ کر کھلتے ہیں۔ کافکا جو ۲۰ ویں صدی عیسوی کی اولین دو دہائیوں کے جرمن ادب کا ایک منفرد نام ہے، اور اس کی شخصیت کی ہر پرت ایک لاینحل مسئلہ۔

کافکا کی تحریروں اور اس کی زندگی کے چلن کو الگ دو حصے سے جدا کر کے دیکھنا اور پرکھنا بجائے خود ایک بڑا ابہام پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ جب کہ ابہام اور لایعنیت کی ایک مثال اس کی اپنی زندگی تھی۔ اور دوسری مثال کافکا کی نزول واردات، جو اس کے افسانوں، ناولوں، حکایتوں، خاکوں، روزنامچوں، تنقیدی محاکموں، اور خطوط کی صورت میں بکھری ہوئی ہے۔ کچھ یہی سبب ہے کہ کافکا کے بن جیوتے نزول شطحے کو اپنانے کے لئے یہ یک وقت وجودی، تاثریت پسند، مارکسی اور نفسی کیفیات کے ماہرین۔ یہاں تک کہ یہودیت اور عیسائیت کے علم بردار آگے بڑھے اور کافکا اس کے باوجود کچھ نہ کچھ رہا۔ یہی بچا کھچا کافکا، خود اسے کسی ایک حد بندی، تفسیر یا تعبیر کا پابند نہیں رہنے دیتا۔ اور اسی کا نام "کافکائیت" ہے۔ اور یہ جو کچھ بھی ہے اس کی ایک سے زائد جائز تعبیریں ممکن ہیں۔

کافکا کی شدید دروں بینی، خود اذیتی اور تنہائی کے انوکھے تال میل نے دھند، اجاڑ پن اور تاریکی کا ایک ایسا تاثر ابھارا ہے جس نے جرمن ادب سے اوپر اٹھ کر چیک Czech اور بالآخر انگریزی زبان کی معرفت عالمی ادبی منظر نامے پر اپنے گہرے اثرات مرتسم کئے۔

کافکا نے ۱۹۲۰ء میں جرمن ادیب گستاؤ جانوک سے مکالمے کی ابتدا کی اور یہ سلسلہ ۱۹۲۱ء تک جاری رہا۔ گستاؤ جانوک کی معرفت کافکا کے تنقیدی افکار لگ بھگ ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آئے۔ بودلیئر سے متعلق بات کرتے ہوئے کافکا نے کہا:

"شاعری ایک مرض ہے۔ لیکن بخار کو دبانے سے کوئی صحت مند نہیں ہو جاتا۔ اس کے برخلاف، بخار کی حرارت سے تطہیر اور تنویر ہوتی ہے۔"

اس نے تخلیق کاروں سے متعلق کہا تھا: "فن کار کے لئے فن محض کرب ہے اور اس کرب کی معرفت وہ خود کو مزید کرب انگیزی کے لئے تیار کرتا ہے۔ تخلیق کار کوئی دیو نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے وجود کے قفس میں ایک طائر ہے۔ جو دیگر لوگوں کے مقابلے میں کم و بیش رنگین ہوتا ہے۔"

گستاؤ جانوک نے فیودر دوستوفسکی سے متعلق کسی تخلیق کار کا یہ قول کافکا کو سنایا کہ: "دوستوفسکی کے ناول جنوں اور پریوں کی کہانیاں ہیں، مگر خون میں تر۔"

کافکا نے جواب میں کہا: "جنوں اور پریوں کی کوئی کہانی ایسی نہیں ہوتی جو خون میں تر نہ ہو۔ ایسی جملہ کہانیاں خون اور دہشت کی گہرائیوں سے جنم لیتی ہیں۔"

خود کافکا کی کہانی نے خون اور دہشت کی گہرائیوں سے جنم لیا۔

فرانز کافکا ۳ جولائی ۱۸۸۳ء کو پراگ (چیکوسلواکیہ) میں ایک چیک یہودی تاجر ہرمن کافکا کے ہاں پیدا ہوا۔ میکس براڈ اور ایڈمنڈ ولسن کے مطابق فرانز کافکا نے ہمیشہ اپنے جسیم اور قد سے درشت مزاج والد کے سامنے خود کو ہیچ اور کمزور پایا۔ کافکا کے لئے باپ ہی کی شکل میں

سب سے زیادہ بااختیار شخصیت FATHER FIGURE کا وجود ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے اپنے والد کے نام ایک خط میں لکھا:

"اگر میں آپ کے اثر سے کلی طور پر آزاد پروان چڑھا ہوتا۔ تو بھی میں آپ کی منشا کا انسان نہ بن پاتا۔ میں شاید پھر بھی قدرے مریض سا، بزدل، ہچکچاہٹ کا شکار رہنے والا بے چین سا شخص بنتا۔ بات صرف یہ ہے کہ آپ جیسے ہیں۔ یعنی میرے باپ کی حیثیت سے۔ آپ میرے لئے کچھ زیادہ ہی قوت مند ثابت ہوئے ہیں۔"

کافکا کو اپنے بچپن اور لڑکپن کے اس احساس کمتری سے ساری زندگی چھٹکارا نہ ملا۔ تپِ دق میں مبتلا ہو کر یہ احساس مزید بڑھا، نتیجتاً سرد اور تاریک کمرے اس کی آخری پناہ گاہ بنے۔ ابتدا میں ادب اور طب سے رغبت رہی۔

کافکا کی پہلی تخلیق THE JUDGMENT ۲۲ ستمبر ۱۹۱۲ کی رات ظہور پذیر ہوئی جب تنہائی اس کے لئے ناقابلِ برداشت بن گئی تھی۔ روزنامچہ لکھنے کی عادت اسے لڑکپن سے تھی۔ اور یوں کافکا نے اس بھید بھری کائنات کو اس کے سارے اسراریت سمیت قرطاس پہ اتارنے کا جتن کیا۔ اسے اس بات کا پورا شعور حاصل تھا کہ زندگانی مختصر ہے۔ سو اس نے جیتے جی جتنے خواب دیکھے انہیں جملہ جزئیات کے ساتھ اپنے روزنامچوں میں قلم بند کر دیا۔

جی۔ جانوچ G. JANOUCH کے نام اس نے ایک خط میں لکھا تھا۔ "جب میں لکھ نہیں پاتا تو تنہائی کا خوف بستہ احساس مجھے خوفزدہ کرنے آجاتا ہے۔"

ایسا کیوں تھا! یہ جاننے کے لئے اتوار ۱۹ جولائی (سنہ نامعلوم) کے روزنامچے سے رجوع کیا چاہئے۔ کافکا نے لکھا ہے۔

"۔۔ میری تعلیم نے کئی معاملات میں مجھے سخت ضرر پہنچایا۔ میرا یہ دعویٰ لوگوں کے انبوہِ کثیر کے خلاف جاتا ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ میرے والدین، متعدد رشتہ دار، ہمارے گھر میں آنے والے بعض ملاقاتی۔ کئی قلمکار، ایک مخصوص خانساماں، جو مجھے سال بھر اسکول لے جاتا، اساتذہ کا ایک ہجوم (جنہیں اپنے حافظے میں باہم سختی سے بھینچے رکھنے کی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ بصورت دیگر ان میں سے کبھی کوئی کچھ ذہن یاد سے محو ہو جاتے لیکن اگر میں ان کو اس طرح باہم یکجا بھینچ کر رکھتا ہوں۔ تو سارا انبوہ بہر صورت رفتہ رفتہ کرچی کرچی ہو کر گڈ مڈ ہو جاتا ہے۔) ایک اسکول انسپکٹر، آہستہ خرام راہ گیر۔۔۔ غرضیکہ دعویٰ ایک خنجر کی طرح پورے معاشرے پر شست باندھتا ہے۔ میں اس بات کا اعادہ کروں گا۔ کہ بدقسمتی سے کوئی شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس خنجر کی نوک اچانک اس کے سینے، پشت یا پہلو پر نہیں آٹکے گی۔"

کافکا کو جوانی میں تپِ دق کا عارضہ لاحق ہوا۔ قانون میں ڈاکٹریٹ کی سند پائی لیکن اسے بطور پیشہ نہ اپنا سکا۔ اور ایک نیم سرکاری ورکرز انشورنس آفس میں کلرک ہو گیا۔ ازاں بعد گشتی بیمہ ایجنٹ کے طور پر خون تھوکتے ہوئے اس نے مختلف شہروں کے دورے کئے اور ہانپ کر بیٹھ رہا۔

ملینا MILENA اس کی اجاڑ اور تاریک زندگی میں واحد روشن ستارہ تھی جس سے قلبی تعلق کی مدت (۱۹۲۰ تا ۱۹۲۴) بھی خود اس کی اپنی زندگی کی طرح مختصر ہی رہی۔ ۱۹۲۰ء میں کافکا اڑتیس برس کا تھا جب پراگ PRAGUE میں ملینا (پ: ۱۸۹۶ء) سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ان دنوں ملینا اس کی ابتدائی نثری تخلیقات کو جرمن سے چیک زبان میں منتقل کر رہی تھی اور کافکا کی زندگی کے صرف چار برس باقی تھے۔ کافکا نے ملینا کو ٹوٹ کر چاہا۔ اس کے روزنامچوں اور خطوط میں ملینا کے پورے نام کی بجائے صرف "M" کا حرف برتا گیا ہے۔ اور اس نوع کی احتیاط یورپ میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

ملینا کو ان دنوں ویانا VIENNA میں اپنی شادی شدہ زندگی کی ژولیدگی کا سامنا تھا۔ اور کافکا، پراگ میں "F.B" نامی لڑکی سے دو بار منسوب رہنے اور منگنی ٹوٹ جانے کے بعد اس جذباتی رفاقت کا منتظر، جو ملینا سے میل ہو جانے پر اسے میسر آسکتی تھی۔ اس ضمن میں اس نے اپنے روزنامچے میں لکھا:

"میں جو کچھ حاصل کر سکا۔ وہ میرے تنہا رہنے کا نتیجہ ہے۔ اور پھر اس کے بعد (منگنی ٹوٹ جانے کے بعد) میں کبھی اکیلا نہیں رہا، مگر کبھی نہیں۔"

بعدازاں وہ برلن (جرمنی) منتقل ہوگیا جہاں وہ کراس نے محض قلم کاری کی یا محبت کے عبرتناک انجام کو محسوس کیا۔ اس کے روزنامچوں اور خطوط کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملینا کو دن میں اکثر دو تین خطوط ضرور لکھتا اور شادی کو ہمیشہ وعدۂ فردا پر ٹالتا رہا۔ کافکا نے خطوط لکھتے وقت کبھی دن اور تاریخ کو درج کرنا ضروری خیال نہ کیا اس لئے اس کے مکاتیب کو مرتب کرتے وقت، ولی ہاس WILLI HAAS نے خطوط کی ترتیب میں کافکا کے روزنامچوں سے مدد لی۔ اور یوں اس خون اور دہشت کی داستان کو زمانی ترتیب ملی۔

وہ ان دنوں مسلسل خون تھوک رہا تھا۔ اور ازدواجی زندگی کے بوجھ کو اٹھانے سے قاصر۔ ایک خط میں اس نے ملینا کو لکھا:

"میں تمہیں ہر سمت سے اپنے قبضے میں کر لینے کا خواہاں ہوں۔ اور ان سمتوں میں حسد بھی شامل ہے۔ کاش میں تمہارے خواب گاہ کا وارڈروب ہوتا جو ہر وقت تمہیں گوناگوں انداز میں دیکھ سکتا ہے"

ملینا کے نام ایک خط میں اس نے لکھا تھا:

"اگر کوئی شخص خوشی کے سبب مر سکتا ہے۔ تو میری آرزو ہے کہ یہ سعادت میرے حصے میں آئے، اور اگر کسی شخص کو موت کے لئے منتخب کر لیا گیا ہو اور وہ خوشی کے سبب زندہ رہ سکتا ہو۔ تو میں یقیناً زندہ رہنے کو تیار ہوں"

یکم دسمبر ۱۹۲۱ء کو کافکا نے اپنے روزنامچے میں ملینا سے اپنی چار روزہ رفاقت سے متعلق لکھا:

"طوفانی شب و روز میں، چار پرسکون دن۔ اب اس کی جدائی کبھی نہ ختم ہونے والے غمناک احساسات کا باعث بن جائے گی"

اس سے اگلے روز وہ پھر تنہا تھا اور روزنامچہ لکھتے وقت ملینا کو یاد کر رہا تھا: "M" ہمیشہ رہے یا نہ رہے — مگر ایک تابناک اصول، تاریکی میں ابھرتی ہوئی ایک روشنی —"

ملینا کے نام لکھے گئے آخری خطوط میں سے ایک میں کافکا نے لکھا: "تمہاری موجودگی تمہاری رفاقت اور تمہاری محبت کے بغیر میں زندگی کی کرب انگیز کلفتوں کا مقابلہ نہ کر سکتا اور نہ دیگر لوگوں کے وجود کو برداشت کرنے کے قابل ہوتا"

لیکن کافکا اس قابل کب ہوا! یاس کا ایک دائمہ تھا اس کے روزنامچے اور خطوط کرب مسلسل، بیچارگی، اکتاہٹ، اور خود رحمی کی مثال ہیں۔ ملینا سے ملنے کی جتنی بڑی خوشی تھی۔ اس سے بچھڑ جانے کا غم اس سے کہیں بڑا تھا۔ یہاں تک کہ ۳ جون ۱۹۲۴ء میں تپ دق نے اس کی جان لے لی۔ کافکا کی موت کے بعد ملینا پورے بیس برس زندہ رہی اور کافکا پر کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۷ مئی ۱۹۴۴ء کو (شاید) اس سے جا ملی۔

موت کی پناہ میں جانے سے قبل کافکا نے اپنے سوانح نگار، ناقد اور قریبی دوست میکس براڈ کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔

عزیز ترین میکس!

"میری آخری فرمائش! میرے مانده روزنامچے، مسودات، خطوط خاکے وغیرہ، جو میری کتابوں کے صندوق میں، کپڑوں کی الماری میں، گھر اور دفتر کے ڈھلوان میز میں ملیں یا کہیں بھی کوئی تحریر پڑی رہ گئی ہو۔ اور تمہیں دکھائی دے جائے۔ اور وہ جملہ تحریریں اور خاکے بھی جو تمہارے پاس ہوں یا دوسروں سے میرے نام پر مل سکیں، سب کو بنا پڑھے جلا دیا جائے۔" تمہارا — فرانز۔

فرانز کافکا کو پراگ (چیکوسلواکیہ) کے یہودیوں کے لئے مخصوص قبرستان میں دفناتے وقت میکس براڈ نے اپنے مرحوم دوست کی آخری فرمائش کو پورا کرنے سے معذوری ظاہر کی اور یوں کافکا کے گزر جانے کے بعد اس کے دوستوں اور محققین کو اس کی تخلیق کردہ نامکمل اور مسترد شدہ تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا جن میں لاتعداد حکایتیں، تمثیل کہانیاں اور افسانے ایسے بھی تھے جو چند سطور سے آگے نہ بڑھ سکے اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ زندگی نے کافکا کو بڑی تیزی سے تھکا دیا۔ اور وقت کا مسلسل گریزاں دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔

کافکا کے اندر کے جس نقاد سے اس کی تحریروں میں جھلک دکھائی ہے۔ اس سے کہیں بڑھ کر وہ اچھا ناقد تھا۔ اس نے ۱۹ جنوری ۱۹۱۴ء کو اپنے لازوال افسانے "قلب ماہیئت" THE METAMORPHOSIS سے متعلق لکھا۔

"مجھے یہ پسند نہیں ـــــ شاید اسے لکھتے وقت میں کہیں کھو گیا تھا۔ مجھے اس سے واقعی نفرت ہے۔ اس کا انجام غیر دلچسپ اور پڑھے جانے کے قابل نہیں۔ بہر لحاظ سے غیر مکمل۔ اگر ملازمت کے سلسلے میں مجھے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ تو بہت ممکن ہے کہ میں اسے بہتر انداز سے لکھتا۔"
کافکا چیک تھا لیکن اس نے اپنے بیشتر کام کے لئے جرمن زبان کو بطور میڈیم چنا۔ اس کی بیشتر حکایتوں، تمثیلی کہانیوں اور افسانچوں کی طرح اس کے دو نمایاں ناولوں "قلعہ" اور "مقدمہ" میں بھی نامکملیت کا احساس پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے افسانوں کے مجموعے "تذکرہ ایک جدوجہد کا BESCHREIBUNG EINES KAMPFES نیز "قلب ماہیت" METAMORPHOSIS AND OTHER STORIES میں شامل متعدد افسانے کافکا کی گزران زندگی اور مسلسل جلاوطنی کی کیفیت کے عکاس ہیں۔ ناولوں میں "عظیم دیوارِ چین" اور "امریکا" جیسی قدرے مکمل تخلیقات میں بھی منتشر تلازمات کا ایک پہاڑ ہے۔ اور ہیئت کے مروجہ اصولوں سے انحراف کی صورتیں جو قارئین کو تخیل کی ایک ایسی دنیا سے دوچار کردیتی ہیں کہ کرب، ناآسودگی اور تشنگی کی موجودگی کے باوجود اس کا احساس مٹ جاتا ہے اس مقصد کے حصول کے لئے کافکا نے اکثر ڈرامہ (؟) ہی مدد لی ہے۔ یوں ناآسودگی اور بے زاری کا احساس جب جب نفسی خودحرکیت AUTOMATIC PSYCHICISM کا موجب بنا ہے تو کافکا نے دونوں میں اپنی اور قارئین کی آرزوؤں کی تکمیل کا سامان کیا ہے۔
کافکا کی عالمگیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے۔ کہ قاری بعض انہیں واقعات میں دلچسپی نہیں لیتا جن میں علت اور معلول کا رشتہ واضح ہو۔ کافکا کے افسانے "قلب ماہیت" اور "ڈولچی سوار" DER KÜBELREITER میں علت سرے سے موجود ہی نہیں۔ معلول ہی سب کچھ ہے۔ لیکن یہ سب کچھ تو انسانی نفسیات کی سطح پر ہوا! کافکا نے تو بلجیم کے ڈرامہ نگار مارس میترلنک اور کیوبا کی افسانہ نگار ڈورا الونسو کی طرح جانوروں کی نفسیات سے بھی رجوع کیا اور یہ ایک افسانہ بعنوان "ایک کتے کی تفتیش و تحقیق" ایسا بھی لکھا جس میں مرکزی کردار ایک کتا ہے؛ جو اپنی اور دیگر کتوں کی حسیت اور فطرت کی روشنی میں انسانی کردار و افعال کا تجزیہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔
کافکا کے ہاں سوالات کی کثرت اور ممکنہ جوابات کی فراوانی کا عنصر اس کی تحریروں کی ایک الگ نمایاں پہچان ہے اور تمثیلی کہانی PARABLE کی روایات سے جڑے رہنا، اس کے فن کی ایک اور جہت۔
ہمارے ہاں اردو ادب میں کافکا سے اثر پذیری کی اولین مثال سید رفیق حسین کا افسانہ "کلوا" ہے۔ اس افسانے پر مارس میترلنک اور ڈورا الونسو کے حوالے سے بھی بات کرنا ممکن ہے لیکن کافکا کا افسانہ "ایک کتے کی تفتیش و تحقیق" اس سے قریب تر ہے۔ خود سید رفیق حسین نے اپنے افسانے "کلوا" (نکمیل مگ بک ۳۸–۱۹۳۷ء) کو اپنا پہلا افسانہ قرار دیا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ سید رفیق حسین کے افسانوی مجموعے "آئینۂ حیرت" کے جانوروں سے متعلق دیگر سات افسانوں کی تہ میں کافکا کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور رہا ہے جبکہ انتظار حسین کا افسانہ "کایا کلپ" اپنی بنت اور اختتامیہ میں کافکا کے "قلب ماہیت" سے بہت قریب ہے۔ یہی صورت انتظار حسین ہی کے افسانے "آخری آدمی" کی ہے۔ جس پر آئنسکو IONESCO کے شہرۂ آفاق ڈرامے "گینڈے" RHINOCEROS اور کافکا کے "قلب ماہیت" کے اثرات نہایت واضح ہیں۔ اس لئے انتظار حسین کے دفاع میں یہ کہنا کہ ان کے افسانوں ("کایا کلپ" اور "آخری آدمی") میں بالترتیب داستانوی عنصر کی شمولیت اور الہامی، یہود کے اساطیری سلسلے کا ابھار لے کافکا سے بچ بچانے میں کامیاب ثابت کرتا ہے، درست نہیں۔
کافکا کے افسانے "قلب ماہیت" کا مرکزی کردار گریگر سامسا ایک صبح اچانک خود کو کاکروچ کی تبدیل شدہ حالت میں پاتا ہے:
"ایک صبح جب گریگر سامسا پریشان کن خواب دیکھنے کے بعد جاگا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر ایک گراں ڈیل کیڑے میں تبدیل ہوچکا ہے۔ وہ زرہ بکتر جیسی سخت پیٹھ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اور جب اس نے اپنا سر تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ تو اسے اپنا گنبد نما کتھئی رنگ کا پیٹ دکھائی دیا۔ جو سخت کمان نما حصوں میں بٹا ہوا تھا اور جس پر رضائی بڑی مشکل سے ٹکی ہوئی تھی۔ اور یوں لگتا تھا جیسے پھسل کر گر پڑے گی اس کے متعدد پاؤں جو اس کے وجود کے مقابلے میں بے حد نحیف تھے اس کی آنکھوں کے سامنے بے بسی کے عالم میں ہل رہے تھے۔"

[illegible] انتظار حسین کے "کایا کلپ" میں شہزادے کا مکھی اور "آخری آدمی" کا بندر بننا
۱ دیکھیے "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ قیصر تمکین (؟)، مطبوعہ: اردو محل، لاہور۔ طبع اول: س۔ن [یا صفحہ ۳۹ پر دیکھیے]



عزیز پریہار

دائروں کا اسیر

وہ اک جنونی
چھوڑ کر چھاؤں گلِ ترکی
کود پڑا
دھوپ کے بے کراں سمندر میں
گھومنے لگا دائروں میں
شب و روز
گرداب کے مرکز کا متلاشی
ایک ہی جست میں کر گیا قصہ تمام!

[یہ خبر پڑھ کر ہمارے دور کا جینئس بشٹ نارائن سنگھ ذہنی توازن کھو بیٹھا]

کئی دنوں تک
اس کا کوئی سراغ ہی نہ ملا
اور ایک صبح —
بال بکھرائے
کاسۂ گدائی لئے
دل کے نہاں خانوں میں
ایک ننھی سی خواہش لئے
اپنے سابقہ سسرال کا طواف کرتا
فلسفی نارائن —
بڑھاپے ساختہ
خوشبوؤں کے تعاقب میں
چلا ڈھونڈنے
مادرِ مہرباں کے شفیق سائے
ٹوٹے رشتے استوار کرنے

سلگ رہی تھی شاید کوئی چنگاری
دھڑکنوں میں ابھی سنگیت تھا
ستار کے تار
سب کے سب نہ سہی
کچھ تو محفوظ تھے
آباد تھے!

● ایچ بی ۷۱، ہاؤسنگ بورڈ کالونی، فیروز پور روڈ، لدھیانہ - ۱۴۱۰۰۱



راشد جمال فاروقی

یوجین آئینکو کی ہمنوائی میں

بزعم خود
ہم اپنی عظمتوں کی آخری معراج تک ہو کر چلے آئے
کسی نے بھی نہیں روکا ہمیں
اور اس تسخیر کے پیہم سفر میں
خدا جیسی کوئی شے ہم نے تو دیکھی نہیں
کیسا خدا!
کیا بات کرتے ہو —
ہم اپنی عظمتوں کی آخری معراج تک ہو کر
زمیں پر آئے تو دیکھا
لغت رشتوں کے سب الفاظ سے عاری ملی ہم کو
اور اس پرواز سے پہلے
زباں جو بولتے تھے ہم
پرانی ہو چکی تھی
کوئی کچھ بولتا تھا اور کوئی کچھ سمجھتا تھا
ہم اپنے اس سفر میں
آسماں تو کھو ہی آئے تھے
زمیں بھی دلدلی پائی۔

● اے-۱۵۲۸، آئی ڈی پی ایل، ٹاؤن شپ، ویر بھدرا (رشی کیش) یوپی



ہرچرن چاؤلہ

سنگی ساتھی

"میں تو سور کا بچہ ہوں ماتا۔۔ اس نے گندگی کے ڈھیر کی طرف بڑھتی گائے کی طرف اپنی تھوتھنی اٹھائی جس میں بچپن کی وجہ سے ابھی وہ سختی نہیں آئی تھی جس سے اس کے بزرگ اچھے اچھوں کو پچھاڑ لیتے یا میدان سے دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیتے ہیں "ہوش سنبھالتے ہی میری ماں مجھے گندگی کے اس ڈھیر پہ لے آئی تھی اور کہا تھا، اب تو دودھ پیتا بچہ نہیں رہا۔ یہاں امیر گھروں کے پھینکے قسم قسم کے لوازمات کھانے کو ملیں گے بیٹا عیش کر اور وہ وہ نعمتیں اڑا جن کے لئے حضرت آدم کے لاکھوں بیٹے اب بھی ترستے ہیں۔ ماتا تجھے کیا کمی ہے تو تو انسانوں میں دیوی کی طرح پوجی جاتی ہے۔ کتنی خوش قسمت ہے تو، تو کیوں ہم سوروں کے پیٹ پر لات مارنے یہاں آگئی ہے۔۔"

"رہنے دے عزیز۔ منہ مت کھلوا۔ آج آدم کا بیٹا اپنی جنمی ماں تک کو تو پہچانتا نہیں۔ مجھے کہاں سے کچھ کھلائے گا۔ جس گھر میں میں رہتی ہوں۔ اس کا مالک روز اپنی بیوی کے کہنے پر اپنی ماں کو جھڑکتا رہتا ہے اور کبھی کبھی ہاتھ بھی اٹھا بیٹھتا ہے مجھے تو بس وہ ذرا سے دودھ اور مر جانے پر میری کھال کے پیسے وصول کرنے تک پال رہا ہے۔ صبح ہوتے ہی میرے گلے سے رسی نکال کر اور میرے تھنوں سے دودھ کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر مجھے باہر دھکیل دیتا ہے۔ سارا دن ادھر ادھر منہ مار کر پیٹ کا دوزخ بھرنا پڑتا ہے کہیں کسی پھل والے نے کیلے کے چھلکے یا جوس والے نے گنے یا پھلوں کے چھلکے پھینک دیے تو تھوڑی سی عیاشی ہو جاتی ہے یا کسی پھل والے کی نظر چوکی تو ایک آدھ سنگترہ، مالٹا، سیب یا کیلا منہ میں دبا کر سرپٹ دوڑنا پڑتا ہے مگر ہم کوئی گھوڑیاں تو ہیں نہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو جائیں۔ کھسکتے کھسکتے پھل والے کی لاٹھی کی دو چار ضربیں سہنی ہی پڑ جاتی ہیں۔ پرسوں ایک ظالم قصائی، پھل والے نے لاٹھیوں سے اس بے دردی سے پیٹا تھا کہ ابھی تک پیٹھ درد کر رہی ہے۔ ذرا ڈھیری پر چڑھ کر دیکھو تو میری کمر پر ابھی لاسوں کے نشان موجود ہیں۔ حرام خور۔ خود گلے سڑے پھل بھی گاہکوں کے لفافے میں نیچے رکھ کر اپنے پیسے کھرے کر لیتا ہے۔۔"

"لو ماتا۔ کوے میاں بھی تشریف لے آئے۔ بڑا حرامی جانور ہے دیکھ نا، تیرے کندھے پر آ بیٹھا ہے۔ اب چونچیں مار مار کر تیرے زخموں کو کریدے گا۔۔"

"نہیں بیٹا۔ اس بھرے بھنڈار میں کس چیز کی کمی ہے۔ کم از کم یہاں وہ میرا خون نہیں پیتا۔ اوپر بیٹھا ہر چیز کو تاڑتا رہتا ہے بڑی تیز نظر ہے اس کی اور بڑا بھائی چارہ ہے اس میں۔ کائیں کائیں کر کے ہمیں اور اپنے سب بھائیوں کو بتا دیتا ہے کہ کون سی نعمت کہاں چھپی پڑی ہے۔ اسے اکیلے کھانے کی عادت نہیں چھوٹی سی چیز بھی پالے تو سب کو بلا کر مل جل کر کھاتا ہے۔"

"ہاں ماں۔ تم ٹھیک کہتی ہو جس چیز کی طرف میری تھوتھنی اٹھ جاتی ہے، میرے لئے چھوڑ کر ایک طرف ہو جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتا ہے تو دل دہل جاتا ہے کہ ظالم کہیں آنکھ ہی نہ نکال لے۔۔"

"نہیں بیٹا۔ یہاں ہماری پارلیمنٹ میں ہر کوئی اپنی بری عادتوں کی نمائش مجبوراً تو کرتا ہے مگر اسے استعمال نہیں کرتا آخر رہنا تو ہمیں پھر ان ہی دشٹ انسانوں کے ساتھ ہی ہے نا سانپ کی طرح ہم انہیں ڈس نہیں سکتے مگر پھر بھی تو ٹا دکھاوے

کا بھوتا رعب تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے ان عادتوں کی پریکٹس کرتے رہنا چاہئے۔"

"یہ لو چاچا کتا بھی تشریف لے آئے۔ اب ایک آدھ بھونک مجھے ماریں گے، تمہاری طرف لپکیں گے۔ جو بھی کوئی اچھی چیز نظر آجائے گی فوراً جھپٹ کر ایک طرف جا بیٹھیں گے جیسے اس ساری سلطنت کے وہ ہی اکیلے بادشاہ ہوں اور ہر اچھی چیز پر پہلا حق ان کا ہو۔ جب ابا جان یا امی حضور میرے ساتھ ہوتی ہیں تو میاں جی نے ذرا ایں آں کی اور ابا حضور نے تھوتھنی دکھائی بس پھر تو ان کی سٹی گم ہو جاتی ہے اور دم دبا معصوم صورت بنا ایک طرف ہو جاتے ہیں۔"

"بیٹا۔ تم ابھی نادان ہو۔ تم کیا جانو، اس کے ساتھ کیا بیتتا ہے۔ بیچارا سارا سارا دن ایک ایک ٹکڑے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ جگہ جگہ انسانوں سے دھتکارا جاتا ہے بچوں کے پتھر کھاتا ہے۔ یہاں شہر میں تو یہ اونچی آواز سے بھونک بھی نہیں سکتا۔ ہاں رات کو ذرا گلا صاف کرنے کو تھوڑی بہت بھونک مار لیتا ہے۔ وہ بھی دراصل بھگوان کے بھرے دربار سے بھوکا رہنے کی شکایت ہوتی ہے۔ دیکھتے نہیں، رات کو اس کی بھونک کس طرح منہ آسمان کی طرف کر کے اوپر والے سے شکایت کرتی محسوس ہوتی ہے۔ بیچارا ہماری طرح سوکھی سڑی گھاس سے بھی تو پیٹ نہیں بھر سکتا ایک بار شیر بادشاہ کو آنکھ دکھائی تھی تب سے جنگل سے دیس نکالا مل گیا۔ اب بیچارا انسان کے جنگل میں آپھنسا ہے اس کے تلوے چاٹ چاٹ کر ایک آدھ ٹکڑا حاصل کر لیتا یا بھوکی نظروں سے آس لگائے اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔

بھوں بھوں بھوں۔ نمسکار ماتا۔ کیا بات ہے آج تو عزیزم سور سے بڑی گہری باتیں ہو رہی ہیں۔"

"تیری ہی بات ہو رہی تھی بیٹا۔"

"مجھ سے میرا ذکر اچھا ہے جو اس محفل میں ہے۔ بھوں بھوں بھوں"

"آج تو بڑے شعر اتر رہے ہیں میرے لاڈلے پر۔"

"وہ ماں، دراصل آج کل محلے میں ایک شاعر آیا ہوا ہے اس نے ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لیا ہے۔ وہ ہی کبھی کبھی پاس بٹھا کر ایک آدھ شعر سنا ڈالتا ہے اور اس کے شعر سننے کے بدلے ایک آدھ ٹکڑا مجھے بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ اکثر تو وہ خود ہی بھوکا رہتا ہے مجھے کیا دے۔ ہاں اس کی میٹھی میٹھی باتوں اور پیار سے گالوں پر ہاتھ پھیرنے سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ لگتا ہے بیچارہ بہت دکھی ہے۔ مگر کبھی کبھی اس کے ہاتھوں کے لمس میں بھی بھوک کی جھلک بھی نظر آنے لگتی ہے۔ تو میں وہاں سے دم دبا کے کھسک لیتا ہوں۔"

"اور رہنے دے بیٹا حضرت انسان کی بات۔ جس دن چاہے بھاگ آگئے تو سب سے پہلے اپنے ہی کسی بھائی کی پیٹھ میں چھرا گھونپے گا۔"

"اچھا تم باتیں کرو۔ میں ذرا کچھ کھانے کی چیز تلاش کر لوں۔ بھوں، بھوں بھوں۔ کل سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

"یہ میرے آگے سے تو ٹکڑا کیوں اٹھا رہا ہے، ننھا سور چیں چیں چیں چیخ اٹھا۔ "دیکھ دیکھ ماں، آگیا نا یہ اپنی کتی عادتوں پر۔

آنے دے ابا میاں کو، ابھی تیری خبر لیتا ہوں

"کیا بات ہے بیٹے"، سور کی انٹری ہوتی ہے

"چاچا دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔ دیکھو تو میرا پیٹ کمر سے جا لگا ہے۔ بھوں بھوں بھوں۔ ایک ذرا سا ٹکڑا کیا اٹھایا ہے کہ تیرے بیٹے کا دل گھبرانے لگا ہے۔

"معاف کر دے یار۔ بچہ ہے"، پھر سور اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہوا۔ "دیکھ بیٹے۔ یہاں مل جل کر رہنا ہے۔ بھرا ٹھنڈا ہے اور پھر تو تو سور کی اولاد ہے۔ تیرے لئے کھانے پینے کی کیا کمی ہے۔ ہم لوگ کیچڑ اور گندگی بھی چاٹ کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ یہ راجہ لوگ ہیں، نعمتیں کھانے کی عادت ہے۔"

"چاچا تو بھی طنز کر رہا ہے۔ کیا ملتا ہے یہاں۔ بس پیٹ کا دوزخ کسی طرح بھر لیتا ہوں۔ بھوں بھوں بھوں۔"

کتے نے کائیں کائیں کر کے سور کے بچے کی توجہ دوسری طرف مبذول کی۔ جہاں کوئی سفید لمبوترا سا ڈھیلا ڈھالا غبارہ سا کسی نرم نرم سفید ملائی قسم کی چیز سے بھرا ہوا پڑا تھا۔ سور نے تھوتھنی ادھر موڑی ہی تھی کہ مرغی نے جھپٹ کر غبارہ اپنی طرف کھینچ لیا

"کڑ کڑ کڑ۔" وہ بولی۔ "یہ تیرے مطلب کی چیز نہیں اس میں حضرت انسان کا بچہ قید ہے جسے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس گندگی کے ڈھیر کی نذر کر دیا گیا ہے وہ میرے آدھے کچے بچوں کو بھون تل کر چٹ کر جاتا ہے میں اسے قطرہ قطرہ چوس لوں گی۔"

اس سے مجھے تھوڑی سی تسلی ملے گی کہ میں نے بھی اپنے

دشمن جاں سے کسی طرح بدلہ لے لیا۔"

سور کا بچہ روہانسی آواز میں بولا "ابا جان "

"رہنے دیجیے۔ ماں مرغی ٹھیک کہتی ہے۔

"چھوڑو کچو۔ اپنے دکھوں کا رونا بہت ہو چکا۔ آؤ ذرا ادھر ادھر کی حضرت انسان کی باتیں کریں۔ یہ اوپرے چمکتے دمکتے کپڑوں والے اور بڑے بڑے محلوں میں رہنے والے انسان اندر سے بہت دکھی اور کھوکھلے ہیں اور یہ دکھ انہوں نے خود ایک دوسرے کو بانٹے ہیں ورنہ بھگوان نے تو بہت خوبصورت دنیا بنا کر انہیں بخشی تھی۔

اچھا چھوڑو، ایک لطیفہ سنو۔

اس دن جب تم سب لوگ ابھی یہاں نہیں آئے تھے اور میں اکیلی کھڑی تھی۔ یہاں سے دو دوست گزر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ایک کو مذاق سوجھا۔ بولا گائے ہماری ماتا ہے، بیل ہمارا پتا ہے۔۔ تبھی ادھر سے ایک بوڑھے میاں بیوی کا گزر ہوا۔ ایک طرف میں اور یہ لبالب بھرا ہوا گندگی کا ڈھیر۔ دوسری طرف پھونپھڑی دوکان والے نے اپنے الم غلم سامانوں سے آدھا فٹ پاتھ تک گھیرا ہوا اور سڑک پر ایک ٹرک کہ بے تحاشا دوڑا چلا آ رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی اس کی زد میں آنے ہی والے تھے کہ مذاق کرنے والے چھوکرے نے بڑھیا کو کندھوں سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچ کر ٹرک سے ٹکرانے سے بچا لیا۔ بولا۔ ماں دیکھ کر چلا کرو۔ ابھی کچل جاتیں تو۔ دوسرے نے ہنس کر کہا۔ ماں کا بہت خیال کرتے ہو ادھر اپنے باپ کو بھی دیکھ لینے۔ بچارا مرتے مرتے بچا ہے۔

لطیفے پر سب کھل کر ہنسے مگر ہنستے ہوئے کتے کی کائیں کائیں کیں کیں بن گئی۔ اس کے پیٹ میں کئی بل پڑ گئے جس سے اس نے خود کو گائے کی پیٹھ سے گرنے سے بچانے کے لئے پنجے دراور مضبوطی سے گاڑ دیئے۔ اس کے پنجوں کی چبھن جب گائے کو اپنی زخمی کھال پر محسوس ہوئی۔

تو بولی "اب نیچے اتر۔ میری تو کھال چھیل ڈالی ہے تو نے لگتا ہے آج تو نے کہیں سے اچھا داؤ مارا ہے۔ پیٹ بھرا ہوا ہے تیرا، جو نیچے اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔"

"سوری ماتا، آئی ایم ویری ساری۔ کائیں کائیں کائیں۔"

کتا اڑ کر ڈھیر کو چھپانے والی الیکشن کے دنوں میں علاقہ کونسلر کی بنوائی چوکور دیواروں میں سے ایک کی منڈیر پر جا بیٹھا

"آج کل وہ سیٹھ کانا شاہ کی بلڈنگ بن رہی ہے نا۔ وہاں بیٹھا تھا سردار ٹھیکیدار مرغے کی ٹانگ چوس رہا تھا ساتھ ساتھ ہیڈ مستری سے بولے بھی جا رہا تھا۔ منہ میں ہڈی، داڑھی مونچھوں کا گھنا غبار۔ اس کی بات پھنس پھنس کر چھن چھن کر باہر نکل پاتی تھی "مستری جی۔ اینٹوں میں تولا کو ایک کا گھپلا کر ہی دیا ہے۔ سیمنٹ میں ریت کی مقدار ذرا زیادہ کر دو تو تھوڑا ادھر سے بھی۔۔۔۔ میں غریبوں کا حق نہیں مارتا، تمہارا حصہ برابر ملے گا فکر مت کرنا"، میری نظریں تو بوٹی پر لگی تھیں، دماغ دوسری طرف لگا تھا، اس کی باتوں کا ساتھ کیا دیتا ورنہ باتیں تو اس کی ہیرا پھیریوں کی اور بھی بہت سی ہو رہی تھیں۔ جو وہ اپنے منشی سے کر رہا تھا۔ جوں ہی وہ کوئی کاغذ نکالنے کو اپنے بریف کیس کی طرف مڑا اور میں نے مارا جھپٹا، اچھی موٹی سی بوٹی اڑا کر اوپر چھت پر جا بیٹھا۔ بڑی شاہانہ دعوت اڑائی۔ بس آپ سب سے دو باتیں کرنے چلا آیا۔"

"ہنس تو ایسے رہے تھے جیسے کوئی بہت بڑا لطیفہ سنانے جا رہے تھے۔ کھودا پہاڑ، نکلا چوہا۔ ارے ایسی باتیں تو یہاں راجدھانی میں راجہ لوگوں کی ناک تلے ہر روز سننے کو ملتی ہے۔" کتا بولا۔ "لے میں سناتا ہوں لطیفہ۔ اس دن سیٹھ بھوجو مل کے ہاں دعوت تھی۔ باہر بڑا شاہانہ رنگ برنگا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ قریب ہی کچھ غریب لوگ بھی باہر ایک آدھ ٹکڑا پھینکے جانے کے انتظار میں کھڑے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ آس لگائے کھڑا تھا۔ وہ رالیں بہاتے، ہاتھ جوڑ جوڑ کر بھوکا ننگا پیٹ دکھاتے آگے بڑھتے تو میں بھی ساتھ کھسک لیتا اس دن میں، وہ جو باہر ادھر باغ کے سامنے کئی منزلہ بلڈنگ بن رہی ہے نا۔ وہاں مزدوروں کے لئے پانی کی ٹونٹی لگی ہوئی ہے۔ اسے خالی دیکھ کر ذرا اشنان کرنے کو دل کر آیا تھا اور میں خوب جی بھر کر نہایا تھا۔ جسم کو جھٹک جھٹک کر صاف کیا تھا۔ کھال تو تم دیکھو نا میری، کتنی سندر اور سنہری ہے۔ بس میں چمک ہی تو اٹھا تھا مگر پیٹ کی چمکی ہوئی بھوک تو کچھ اور مانگتی ہے۔ ادھر دعوت کی اشتہا آور خوشبوئیں بھی بے چین کئے دے رہی تھیں۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ میں ایک پانچ چھ سالہ لڑکے کو ایسا بھایا کہ وہ مجھے عین سیٹھوں کی محفل کے درمیان لے گیا۔"

"بہت لمبی کھتا ہے۔" سور بولا۔ "وہ تیرا لطیفہ کہاں گیا"

"یار تو بیچ میں اپنی تھوتھنی مت اٹکایا کر۔ بھوں بھوں بھوں

"وہ کتا اس کی طرف غرّایا۔ وہ سیٹھوں میں ٹیکس چرانے، ہیر پھیر کرنے ملاوٹ کرنے، سرکاری سامان خورد برد کرنے، رشوتیں دے کر اور عورتیں سپلائی کر کے کام کروانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ان میں سے ایک بولا۔ یار تھو۔ آج کی تیری دعوت بڑی شاندار ہے۔ شراب بھی تو آج اصلی ولائتی چلا رہا ہے۔ لگتا ہے کہیں سے تگڑا داؤ مارا ہے ہاں یار۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔ سیٹھ بولا۔ مگر اب تم تفصیل مت پوچھنا دوسرا دوست بولا۔ یار ہم تو اپنا سب کچھ تجھے بتا بیٹھے ہیں اور تو چھپا رہا ہے اپنی کرتوتوں کو۔ وہ بولا۔ یار تو موج اڑا، کیوں مجھے گندگی میں گھسیٹتا ہے۔ پھر بھی تو کچھ بھنک ملے۔ تو کباڑی ہے تمہاری ہماری لائنیں ہی جدا ہیں۔ تجھے فکر کس بات کی ہے۔ کباڑ خانے میں یہ پریاں؟" دوست نے ہیرے کی پلیٹ میں سونے کے پانی جیسی وہسکی سے بھرے جاموں کی طرف اشارہ کیا۔ یار سچ سچ بتا معاملہ کیا ہے۔"

"بس کباڑ کا ہی مال سمجھ لے۔" کباڑیا سیٹھ بولا۔

"کمال ہے کباڑ میں سے سونا تلاش کرنے والے تجھ پر لاکھوں سلام۔ پھر بھی...؟" ایک اور نے سوال کیا۔

"کچھ تو پتہ چلنا چاہئے۔" سب بضد ہو گئے۔ "تم فکر مت کرو ہم میں سے کسی کا کباڑیا بننے کا کوئی ارادہ نہیں۔" اس پر سب خوب ہنسے۔ "تو سنو بھائی۔" کباڑی بولا۔ "یہ جو تم سب کچھ کھا پی رہے ہو یہ سب مٹی کی کمائی ہے۔" یہ سن کر سب کے منہ پھیکے پڑ گئے جیسے قے کرنے سے پہلے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے مگر وہ بنا رکے کہتا گیا۔ "میں نے ایک جھگی جھونپڑی علاقے میں ایسا بندوبست کیا ہے کہ سب پاخانوں کا تازہ تازہ مال میری فیکٹری میں آجاتا ہے۔ علاقہ کونسلر خوش ہے کہ میں نے سب گندگی سنبھال کر اور اس کا کام ہلکا کر کے کالونی کے سب مکینوں کے دو ووٹ اُسکے نئے کھاتے کر دیئے ہیں اور میں خوش ہوں کہ فیکٹری کی کھاد میرے لئے سونا رولنے لگی ہے۔

"ہاں۔ سنا ہے کچھ کباڑی اب ادھر دھیان دینے لگے ہیں۔ سالے ہمارے پیٹ پر لات مارنے چلے ہیں۔" سور کو غصہ آ رہا تھا۔ "کبھی کبھی ٹٹیوں میں منہ مار لیتے ہیں تو حضرت انسان کے رات بھر کے کھانے پینے کا مزہ آجاتا ہے۔ اب اس سے بھی جائیں گے۔ ڈرتا ہوں کل خلاف گندگی کی اس ڈھیری سے بھی ہاتھ نہ دھونے پڑ جائیں۔

اتنے میں دور سے ایک آدمی سائیکل پر ادھر اُدھر بڑے بڑے بوری کے جھولے لٹکائے آہستہ آہستہ ان کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

"لو شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر۔" اسے ڈھیری کے قریب آتے دیکھ کر سور بولا۔ "سالے کو ڈال دوں لمبا غوطہ کے ایک ہی وار سے۔"

کتے نے تو اس کی طرف باقاعدہ منہ کر کے بھونکنا بھی شروع کر دیا۔ "بھوں بھوں بھوں۔ نکال لاؤں اس کی ٹانگ سے ایک موٹی سی گوشت کی بوٹی۔"

مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حملے کی تدبیر سوچتے۔ وہ خود ان سے چند قدم دور سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑی کر کے پاؤں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ سب کی ناراض نظروں کو سمجھتا منہ ہی منہ میں بولے جا رہا تھا۔ "بھائیو۔ میں تمہارا حق مارنے نہیں آیا۔ تم کھاؤ پیو موج کرو۔ میں انتظار کر لوں گا۔ کاغذ تو تم کھا نہیں سکتے میں انہیں بعد میں چن لوں گا۔ تمہاری میری روٹی روزی کا تو کہیں ٹکراؤ ہی نہیں۔" اور وہ ٹھنڈے ٹھنڈے ایک کونے میں بیٹھ کر بیڑی پینے اور پھر سے بڑبڑانے لگا۔

"بڑا حرامی ہے سیٹھ جگومل۔ ریٹ میں بھی مارتا ہے اور وزن میں بھی۔ دس کلو کاغذ ہوں تو سالا ایسی ڈنڈی مارے گا کہ آٹھ کلو بن جائیں گے۔ ایک بار اس کے تول پر اعتراض کرتے ہوئے میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا کہ وزن تو زیادہ ہے۔ دوسری جگہ سے تلوا کر لایا ہوں تو بولا۔ پھر اسی جگہ ہی دے دیا کرو حرام زادے۔ میرے دھرم کانٹے پر شک کرتا ہے۔ اس دن اس نے میرے کاغذ نہیں لئے تھے۔ مجبوراً مجھے ایک دوسرے کباڑیئے کے پاس جانا پڑ گیا۔ ایک حرامی تو دوسرا مہا حرامی۔ وہ بولا تھا ہم اپنے کسی کباڑیئے بھائی کا دھندہ خراب نہیں کرتے آج میں تمہارا مال خرید لوں تو وہ کل میرے گاہک توڑنے لگے گا خیر تم بڑی آس لگا کر آئے ہو تو لئے لیتا ہوں مگر اب واپس بھی اس کے ہاں مت جانا۔ ورنہ تمہاری وجہ سے ہمارا جھگڑا ہو جائے گا۔ وہ اس سے بھی بڑھ کر کمینہ نکلا۔ بھلا روپے میں اٹھنی پیسے تو دے رہا تھا یہ سالا ساٹھ پیسے دینے لگا۔ میں کیا کرتا، واپس

توجا نہیں سکتا تھا۔ ادھر بیوی ہے کہ پانچ سال سے چارپائی سے لگی پڑی ہے۔ ساری دوائیاں اس کے اندر سے بے اثر گزر جاتی ہیں۔ ٹھیک تو کیا خاک ہوگی بس زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ مرتی بھی نہیں، دکھ پا رہی ہے، دکھ دے رہی ہے"

بڑبڑاہٹ میں اپنے ہی اندر کی دنیا میں گم وہ بیڑی کو کش لگانا بھول جاتا اور جب آگ اس کی انگلیوں کو چھونے لگتی تو وہ دوسری بیڑی سلگا لیتا۔ "میں کروں بھی تو کیا۔ اس نے دکھ سکھ میں میرا بہت ساتھ نبھایا ہے۔ جب میں بیمار پڑا تھا اور جب اس کے ہاتھوں سے ابھی شادی کی مہندی بھی نہیں اتری تھی، وہ ایک سیٹھ کے گھر برتن بھانڈہ اور جھاڑو پونچھ کا کام کرنے لگی تھی۔ میرے منہ سے تو اس کی موت کی بات نکل جاتی ہے۔ مجال ہے جو اس بیچاری نے میری موت کے بارے میں سوچا بھی ہو بلکہ جب کبھی بیماری سے تنگ آکر میں مرنے کی بات کر بیٹھتا تو میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی تھیں۔ وہ اپنی خوبصورت جوانی میرے لئے گلا رہی تھی۔ آخر اس کی جوانی اور خوبصورتی ہی اس کی مصیبت کا کارن بن گئی۔ ایک بار وہ سیٹھ کے یہاں کام کرنے گئی تو سیٹھانی کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ اس نے کچن میں برتن دھونے شروع کئے ہی تھی کہ سیٹھ نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے عزت بچا کر وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ جب وہ جھونپڑی میں پہنچی تھی تو اس کی چھاتی دھونکنی بنی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا تھا۔ کیا ہوا تو بولی تھی۔ حرامی سیٹھ میری عزت لوٹنا چاہتا تھا بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ آئی ہوں۔ اور وہ زار و قطار رونے لگ گئی تھی۔ مجھے اتنا غصہ آیا تھا کہ لکڑیاں چیرنے والی کلہاڑی اٹھائی تھی۔ غصے سے پاگل ہو کر میں باہر کی طرف لپکا ہی تھا کہ اس نے میرا پاؤں پکڑ کر روک لیا تھا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ تم بیمار ہو، جھگڑا مول مت لو۔ جھگی بھی تو ہم نے اس کے بھائی کے پلاٹ پر ڈال رکھی ہے۔ بھائی کی ہمدردی میں وہ ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح باہر نکال کر پھینک دے گا۔ بس دو تین سال صبر کر لو تو یہاں سے اٹھتے اٹھتے سیٹھ سے دو تین ہزار روپئے لے مریں گے اور دو تین ہزار روپیوں کے لالچ نے میرے تمام غصے کو سوڈے کے ابال کی طرح واپس اپنے ہی قدموں میں بٹھا دیا تھا۔ واہ ری غریبی۔ تیرا غصہ بھی سوچ کے ماتحت ہے۔ ہم تو سنتے تھے، غصہ آتا ہے تو آدمی اندھا ہو جاتا ہے، مگر غریب کا غصہ الٹا اس کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔"

وہ صبر سے بیٹھا بڑبڑائے جا رہا تھا۔ اس کے دکھ کی کہانی سن سن کر گائے کی ممتا جاگ اٹھی تھی۔ "وہ بچارا ہماری طرح آدم زاد کا ستایا ہوا لگتا ہے۔" وہ بولی تھی۔

"بھوں بھوں بھوں۔ اپنا ہی بھائی لگتا ہے۔" کتا بولا اور ساتھ ہی اٹھ کر اس کے پاس دم ہلاتے ہوئے آبیٹھا۔ آدمی نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"موتی، میرے بچے" وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا رہا۔ کتے کو اسے اپنا بچہ کہنا بہت اچھا لگا۔ وہ دم ہلاتا اس کے پاؤں چاٹنے لگا پھر اٹھ کر اٹھ کے آگے آگے چلا اور مڑ مڑ کر دیکھتا اسے اپنے ساتھیوں کے درمیان لے آیا۔ گائے نے پیار سے اپنی تھوتھنی سے اس کی بانہہ کو چوما۔ پیار کی زبان سمجھتا وہ اور آگے بڑھ آیا۔ سور نے ایک طرف ہٹ کر اسے ڈھیری میں آنے کی دعوت دی۔ مرغی کڑ کڑ کر کے ایک طرف کونے میں چلی گئی۔ اب وہ ان کے ساتھ گندگی کی ڈھیری سے اپنا رزق تلاش کر رہا تھا۔ ❋

کہ ادب نے فنا کے تصور سے ہمیشہ زندگی کی حرارت حاصل کی ہے اور فنونِ لطیفہ کے تمام اثباتی رویوں نے اسی سے جنم لیا ہے لیکن اول و آخر فنا کا تصور، زندگی سے فرار کا نام نہیں، زندہ رہنے کو شدت سے محسوس کرنے کا نام ہے۔ اس وقت دنیا کے عظیم ذہن ساری دنیا میں موت کا ڈھول بجا بجا کر اپنی دانشوری کا لوہا منوانے میں معروف ہیں کیا ہمارا ادب اور تخلیق کار اس سلسلے میں کوئی نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔؟ مخالف ہوا کے سامنے چراغ روشن رکھ سکتے ہیں۔؟ ادب کو فیشن پرستی اور تقلیدی رویوں کے بجائے ایک نئی جہت عطا کر سکتے ہیں۔؟ امن عالم کے لئے انسانی دوستی کے لئے، قومی یکجہتی کے لئے، مساوات کے لئے، سفید خون کو سرخی عطا کرنے کے لئے۔؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ادب پر تنقیدی مکالمے ہوں۔ ہر ایک دہائی کے ادب کا محاسبہ ہو، اکیسویں صدی سیماب صفت تخلیق کاروں کی صدی ہے۔ ہم اپنی زبان، اپنے ادب، اپنے ذہن اور اپنے وجود کو سیماب صفت بنائیں اگر لوگ اس سے ناراض ہوں تو صبر کیجیے مگر مکالمہ جاری رکھیے۔

زندگی عبارت ہے خود نئے اجالوں سے　　یوں بھی ڈوب جانا تھا ڈوبتے ستاروں کو ❋



رشید امکان

کیوں کوئی اپنا ہم سفر بھولے
بھول سکتے تھے جس قدر بھولے

اب تو کچھ یاد ہی نہیں آتا
ہاتھ کس جا کہاں پہ سر بھولے

ایڑیوں میں چھپی ہوئی کلیاں
یاد رکھنا تھیں ہم مگر بھولے

اُس کی آنکھیں اُتر گئیں دل میں
کچھ بتانے سے پیشتر بھولے

وہ جگہ خشک رہ نہیں سکتی
ہم جہاں اپنی چشمِ تر بھولے

● ۶/۱۲ توپ خانہ روڈ - اُجین (ایم-پی)



محسن جلگانوی

گھر سے نکل بھی آئیں مگر یار بھی تو ہو
جی کو لگے کہیں کوئی کردار بھی تو ہو

یہ کیا کہ برگِ زرد سا ٹوٹے بکھر گئے
آندھی چلے، ہواؤں کی یلغار بھی تو ہو

سر کو عبث ہے، سنگِ تواتر کا سامنا
صحنِ مکاں میں شاخِ ثمر بار بھی تو ہو

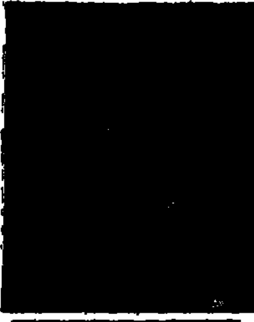
انمول ہم گہر ہیں، مگر تیرے واسطے
بک جائیں تیرے ایسا خریدار بھی تو ہو

کاغذ کی کشتیوں میں سمندر لپیٹ لیں
پہلو میں تیرے قرب کی دیوار بھی تو ہو

ہم کو نہ جینے دیگی تری لب خموشیاں
اقرار بن نہ پائے تو، انکار بھی تو ہو

سب کو کسی کے لہجہ کی تو قینچی چاہیئے
محسن کسی کو میرے سا آزار بھی تو ہو

● ۱/۵/۴۵ ریلوے کوارٹرس، لالہ گوڑہ سکندر آباد ۵۰۰۰۱۷ .



معصوم انصاری

سبز موسم میں کہاں سے آ گئی پیلی ہوا
ڈس گئی ہنستے ہوئے پھولوں کو زہریلی ہوا

ڈھونڈنے نکلے ہو تم فردوسِ گم گشتہ کہاں
کر نہ دے اندھا کہیں صحرا کی ریتیلی ہوا

خوں بہتا ہے، نہ کوئی زخم کھلتا ہے کہیں
کاٹتی ہے اس طرح جسموں کو برفیلی ہوا

راکھ ہو سکتا ہے سارا شہر، میرا گھر ہی کیا
ہے بہت اس کے لئے ماچس کی اک تیلی ہوا

دشتِ شب میں کون میرا ہم سفر ہے دیکھ لوں
کاش اک پل کے لئے ہو جائے چمکیلی ہوا

ایسا لگتا ہے قیامت اب بہت نزدیک ہے
رقص کرتی پھر رہی ہے ہر طرف نیلی ہوا

گھر سے جب رخصت ہوئے معصوم آنکھیں خشک تھیں
وادیٔ احساس میں چلتی رہی گیلی ہوا

● ۴۹/۴ مہار واڑہ، قلعہ نظام پورہ. بھیونڈی

محسن عثمان
۱-۱۰ آئی ۲۲۲۔ اسلام آباد (پاکستان)

کابوس

کتنی مدت سے سب کچھ ایک جیسا تھا، کہیں سیم و زر کے انبار میں چھپے کسی دریدہ چادر کے تار ۔۔۔ کہیں جاہ و حشم کی صاف دامنی پر خونِ ناحق کے چھینٹے، کہیں جبہ و دستار کے آگے خفتہ نصیبی کی سرنگونی، کہیں کسی دریچے سے جھلکتی چاندنی، کہیں فضا میں بہر فریاد اٹھے ہوئے عرق آلود ہاتھ کہیں بھوک کی برہنہ پائی، کہیں مجبوری کی بے لباسی ...

ماحول کی یک رنگی کو سہہ سہہ کر وہ سرتاپا چھلنی ہو چکا تھا۔ ہر صبح پرانی جبروں کے ساتھ طلوع ہوتی پھر دن بھر برس ہا برس کے دیکھے ہوئے منظر اس کے آگے سے گزرتے رہتے لیکن ان کی شدت کبھی کم نہیں ہوتی تھی۔ اکثر اوقات ایسے ہوتے کہ ان کے دیکھنے سے دل میں درد کی ایک ہر اٹھتی جو آنکھوں تک آتی ہوئی پلکیں بھگو جاتی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا۔ لیکن یہی تو مشکل تھی کہ اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ جذبوں کی سرکشی۔ ناطاقتی کے بوجھ تلے دب کر بے دم ہو گئی تھی اور ارادوں کی صلابیت کو بیزاری کی دیمک چاٹ رہی تھی۔

پھر بھی ایک کسک تھی، ایک ہمک تھی۔ وہ دن چڑھتے ہی گھر سے نکل جاتا پھر وہ ہوتا اور شہر کے کوچہ و بازار۔ دھوپ کی کومتا، تمازتیں بدلتی اور دھیرے دھیرے مضمحل ہو کر شفق کی سرخی میں ڈھل جاتی۔ دن بھر وہ گھومتا رہتا.... گھومتا رہتا ... اور شام گئے زخمی آنکھوں شکستہ قدموں کے ساتھ اپنی تنہائیوں میں لوٹ آتا۔

اس روز بھی وہ حسبِ معمول پھرتا پھراتا ایک بس میں سوار ہو گیا۔ ایک نشست خالی تھی وہ اس پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھ والی نشست ایک لڑکے نے آ کر پُر کر دی۔

ایک اسٹاپ پر بس رکی تو پچھلے دروازے سے ایک نوخیز لڑکی بس میں سوار ہوئی قدرے میلا لباس، گرد آلود جوتیاں لیکن اس کے نین نقش پکار پکار کر اپنی طرف توجہ کر رہے تھے۔ گول چہرہ اس پر گالوں میں ڈمپل۔ تھوڑی میں ڈمپل، گہری گہری چیر دینے والی آنکھیں، بھنور کی طرح کھینچتی ہوئی، جو غور سے دیکھے بس ڈوبتا جائے سانولے رنگ پر ناک کے چمکدار کوکے کی عجب ہی بہار تھی ایک لمحے کے لئے تو وہ مبہوت ہو گیا۔

لڑکی کے ہاتھ میں بہت سے کارڈ تھے۔ جو اس نے مسافروں میں بانٹنے شروع کر دیئے پھر اسی طرح کارڈ واپس لیتی ہوئی اس کے پاس آگئی وہ پیشہ ور بھکاریوں کو کچھ نہیں دیتا تھا لیکن اس لڑکی کے لئے اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنی جیب میں گیا اس نے ایک روپیہ نکال کر کارڈ پر رکھ دیا۔

مگر ساتھ والے لڑکے نے عجیب حرکت کی۔ اس نے کارڈ واپس کرنے کے بجائے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لڑکی نے کارڈ ہلکے سے جھٹکا پھر چھوڑ دیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے لڑکے کے ہاتھ کو دیکھا۔ کارڈ کے نیچے سے سرخ رنگ کی جھلک لگ رہی تھی۔ یقیناً سو کا نوٹ تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ لڑکی نے کچھ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے بڑے یقین کے ساتھ خواہش کی۔

" یہ پیش کش مسترد ہو جانی چاہئے "

لڑکی شاید کسی فیصلے پر پہنچ رہی تھی۔ اچانک اسٹاپ آگیا۔ بس رکی تو لڑکی نے اظہار رضامندی کے لئے ہلکا سا اشارہ دیا اور جلدی سے اتر گئی۔ لڑکا زیر لب مسکرایا اور اس کے پیچھے پیچھے اتر گیا۔

درد کی ایک لہر دل سے اٹھی ہوئی آنکھوں تک آئی اور پل بھر میں پلکیں بھگو گئی۔ وہ بہت دور تک انہیں دیکھتا رہا " کیا مجبوری تھی اس لڑکی کی.... شاید ... لیکن..... جواز ..... جواز .... ہر جگہ یہ کمبخت جواز.....

اس نے زور سے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ ساتھ میں سے نے بیٹھنے والے

نے چونک کر اسے دیکھا، "کیا ہوا جناب؟" "کچھ نہیں"

اتھل پتھل سانسوں کے ساتھ وہ گھر پہنچا، "کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ بس اب آخری فیصلہ..... لیکن آخری فیصلہ کب ہوگا؟ آنکھوں کے چشمے کب تک رواں رہیں گے؟

جذبوں کی سرکشی کب تک ناطاقتی کے بوجھ تلے دبی رہے گی؟ ارادوں کی صلابت کو بیزاری کی دیمک کب تک چاٹتی رہے گی؟ کب تک؟ کب تک؟

اپنے آپ سے لڑتے لڑتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کیا دیکھا کہ وہ افق پر سرتاسر پھیل گیا ہے اور اس کی جگمگاہٹ سے ماہ و انجم کی تابانی ماند پڑ گئی ہے۔ خوف، حیرت اور انجانی مسرت کے ساتھ اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں خود کلامی کی، "یہاں بھی میں اور وہاں بھی میں؟

افق پر سرتاسر پھیلی جگمگاہٹ میں مسکراہٹ کا نور چمکا۔

"اگر ہر طرف میں ہی میں ہوں تو پھر میں ہوں کیا؟"

"تم اس سے کمتر ہو جو نظر آتے ہو لیکن اس سے زیادہ ہو جو نظر نہیں آتے۔ تم نہ ازل ہو نہ ابد لیکن یہ دونوں تمہارے ایک پر کے نیچے ہیں۔ تم لاحاصل بھی ہو اور کائنات کی تمنا کا حاصل بھی تم بے ثبات بھی ہو اور ارض و سما کے لئے وجہ ثبات بھی۔ تبھی تو ہو جو اس بے کرانی میں سر اٹھا کر چل سکتے ہو....

رفتہ رفتہ اس کا ہیولا سمٹ گیا اور اس کی جگہ ٹمٹماتے ستاروں نے لے لی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں دھندلا اجالا تھا اور ٹائم پیس کی ٹک ٹک ماحول کی خواب گونی کو تار کئے دے رہی تھی۔

اس دن وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھا، "میں سب کچھ بدل ڈالوں گا۔ اب کوئی آنکھ نم ہوگی نہ کوئی لب صرف فغاں۔ اب کسی دل میں درد کی لہریں نہ اٹھیں گی.... میں سب کچھ بدل ڈالوں گا....

وہ گھر سے نکلا تو سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی ہجوم روزگار، بھرے بازار، گاڑیوں سے اٹی سڑکیں، کارڈوں پر بھیک مانگتی دوشیزہ کوڑے کی ڈھیر میں رزق ڈھونڈنے والا نوجوان، انجیں ڈھونڈنے والا پیر مرد، ریسٹورنٹ، ورکشاپ، بوٹ پالش والا چھوٹا، سب کچھ ہمیشہ جیسا تھا۔ لیکن آج تو وہ ایک نئے عزم کے ساتھ نکلا تھا اس لئے کوئی کچوکا لگا نہ سانسیں اتھل پتھل ہوئیں.... کیونکہ وہ ایک اپنے اردگرد پھیلے دوزخ کو بہشت بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنی مٹی کو سونا بنا کر سنگریزوں کو جواہر بنالیا اور چپ چاپ اپنی جنت کو نہانے سنوارنے میں مگن ہو گیا۔

اس بات کو بہت مدت نہیں گزری تھی کہ اخباروں کی سرخیاں درد کی منادی بننے لگیں۔ واقعہ یہ تھا کہ لوگوں کے منہ کو خون لگ گیا تھا وہ ایک دوسرے کا قد شہر کے مکانوں سے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے اندر کا خوف آتش و آہن کی صورت ہاتھوں میں نمودار ہوتا اور ایک، دوسرے کا گریبان پکڑ کر اپنا خوف دوسرے کے سینے میں منتقل کر دیتا۔

سوال و جواب کے سب سلسلوں سے قطع نظر اب فضا میں ایک ہی بو تھی اور وہ خون کی بو تھی۔ زمین اب باران آب کے بجائے لہو کے دھاروں سے سیراب ہوتی۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ وقت کی گردش نے کہاں لاکر کھڑا کیا ہے یہ کونسا موسم اس شہر میں اترا ہے کہ آنکھیں ساکت ہو گئی ہیں۔ ہاتھ پاؤں بے دم اور زبانیں خاموش۔ یہ قاتل لمحہ جواب پھیل کر ماہ و سال کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے کیونکہ ہمارے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے۔

اس کے غور و فکر کا سلسلہ جو پہلے ہی حل کی تگ و دو میں پھیلا ہوا تھا اب اور بھی پھیلتا جا رہا تھا۔ لیکن اپنی تمام تر دردمندی کے باوجود کبھی کبھی اسے یوں لگتا جیسے وہ بھیڑیوں کے ہجوم میں گھر گیا ہے جہاں ہر طرف تھوتھنیاں نکالے، ایک دوسرے کی بو لیتے ایک دوسرے پر غراتے بھیڑیے گھوم رہے ہیں اور وہ ان کے درمیان یکہ و تنہا اپنی جنت بچائے کھڑا ہے ایسی حالت میں کہ اس کا قد آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔

اب تو کچھ دنوں سے یہ ہونے لگا تھا کہ اخبار پڑھتے پڑھتے یا ریڈیو، ٹی وی پر خبریں سنتے سنتے درد کی ایک لہر اٹھتی جو آنکھوں تک آتی ہوئی پلکوں کو بھگو جاتی.... لیکن اس کا قد جو آسمان سے باتیں کر رہا تھا.... ایک معمولی صبح کو وہ غیر معمولی طور پر اخباروں کی زینت بن گیا۔

"سماجی کارکن کا پراسرار قتل۔ نامعلوم قاتل فرار۔ پولس نے رپورٹ درج کر کے تفتیش شروع کر دی....

*



شاہد عزیز

سیاہ سورج

اور کچھ دیر میں، دن نکل آئے گا
پھر یہ اندھی گلی
زرد سایوں سے بھر جائے گی
اور میں!
کارخانوں میں تبدیل ہو جاؤں گا
فائلوں میں بکھر جاؤں گا
ہزاروں طرح کی
صداؤں میں کھو جاؤں گا۔

پھر یہ سورج کی کرنوں میں
لرزتے ہوئے رنگ
مرجھائیں گے۔

● ۱۲۹ - ملاح تلائی، اودے پور (راجستھان)



انور مینائی

انتشار

موجود و معروض کا
اک اک مرکزاب
وقت کی سنگین زد میں
آکر
یوں بکھرا ہے
جیسے دوشِ ہوا پہ
پھوس۔
خواہش
سایہ بن کر
لامرکزی کی سرحد میں
رقص کناں ہے اب
سمتیں سب مخدوش ہیں
اور مشکوک نظر آتی ہیں مجھکو۔
چاروں جانب
سمتیں ہی سمتیں ہیں
جن کی کوئی منزل ہے
اور نہ حدِّ فاصل۔!

● الامین کالج، کولار ۵۶۳۱۰۱ (کرناٹک)

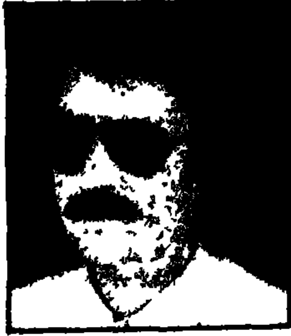


معراج رعنا

نسلی خلیج

اُس طرف شہرِ درخشاں اِس طرف دشتِ سیاہ
درمیاں دونوں کے اک کوہِ عظیم
اُس طرف صحنِ چمن
صحنِ چمن کی نرم بھیگی گھاس پر
شبنمی ملبوس میں دہکے بدن
آرزوؤں کے دھندلکے میں
چراغوں کی لوؤں کا تھرتھرانا ڈوبنا پھر سے اُبھرنا
ہر گلی ہر موڑ پر سرگوشیاں
مستیاں ہی مستیاں
دستکیں اُنگلی سے لپٹیں
بند دروازوں کی جانب گامزن
اس طرف تیرہ شبی
تیرہ شبی کے دامنِ پُرخار میں
بوڑھی آوازوں کا لشکر خیمہ زن
زرد چہرے پر
ہراس و خوف کی ٹیڑھی لکیر
خواب سے عاری ہر اک چشمِ جنوں
خانقاہِ دل سے ارماں منحرف
دُور تک حدِّ نظر
اُجڑی ہوئی اک شاہرہ
شاہرہ پہ سوکھے پتوں کا ہجوم۔

● جھگھنڈی۔ سہسرام (بہار) ۸۲۱۱۱۵



رفعت اختر

کالی پلٹن - ٹونک - ۳۰۴۰۰۱ (راجستھان)

ادب پر تنقیدی مکالمہ

تنقید، ادب کا ایک ایسا بادپیما ہے جو ادب کے بدلتے ہوئے موسموں کی نشان دہی کرتا ہے۔ بشرطیکہ دیکھنے والے کی نظر نہ صرف اس میکنزم سے واقف ہو بلکہ پارے کے اتار چڑھاؤ کا بھی ساتھ دے سکے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم میر کے نکات الشعرا، اور حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کو تنقید کی ابتدا وانتہا تصور کرتے تھے اور ادب برائے فن اور ادب برائے زندگی۔ جیسے ادبی نظریات کو جھولی میں سجا کر نئے ادب کی نمائش کرتے رہتے تھے۔ پھر ایک دور ایسا آیا جب مقصدی ادب کے پھول دامن ادب پر سجائے جانے لگے لیکن حلقۂ ارباب ذوق نے ان پھولوں کی خوشبو کو کاغذی پھولوں کی خوشبو سے تعبیر کیا چنانچہ ادب میں ہیئت و مواد کی بحث چھڑ گئی۔ اس بحث کا ادب کو ایک فوری فائدہ یہ ہوا کہ ہیئت کے نئے نئے تجربے ہونے لگے ترقی پسند تحریک نے غزل کی گردن دبانا چاہی لیکن جدیدیت نے گلا گھونٹنے والی رسّی کو ڈھیلا کر دیا تو جدیدیوں کو معتوب کیا گیا۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات! ۱۹۶۰ء کے بعد ادب میں نئے رجحانات نے راہ پائی لیکن صرف فیشن کی حد تک۔ ٹھیک اس طرح جیسے فلم انڈسٹری کے کامیڈین محمود نے کسی فلم میں انگریزی کوٹ کو الٹا پہن کر فیشن کا مذاق اڑایا تھا۔ انسانی تہذیب و تمدن کا آغاز برہنگی کو ختم کرنے کے لئے ہوا لیکن ارتقار کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ہم جس نقطے سے سفر شروع کرتے ہیں گھوم پھر کر اسی نقطے پر آجاتے ہیں اس معکوسی سفر کے دوران کہیں ہم مسئلہ بقا سے دوچار ہوتے ہیں تو کہیں ڈارون کی تھیوری کو ترجمان بنالیتے ہیں، اور کہیں وجودیت، عدم مرکزیت، لاسمیت، ماڈرنزم، کیمونزم، فیوچرزم کو قصۂ پارینہ سمجھ کر ادب کے ہر رجحان کے ساتھ لفظ پوسٹ یا مابعد کا سابقہ لگا کر پوسٹ ماڈرنزم، پوسٹ کریٹیسزم، پوسٹ مارکسزم، پوسٹ فرائڈزم، غرض سب کو پوسٹ کر چکے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا تمام ادبی لوگ بے ادب ہوگئے ہیں۔؟ ہر مکتبۂ فکر سے اس سوال کے جواب جدا جدا ملتے ہیں۔ مذہب پسند ذہن، دنیا و کائنات کو اپنے طور پر تفہیم کرتے ہیں وہ مادیت پسندی کے غلو کے خلاف ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو مذہب میں روحانی آسودگی کی تلاش میں ہیں اور اچاریہ رجنیش جیسے لوگوں کو ذریعہ بناتے ہیں۔ ایک طبقہ گلیمر کی پیروی کو مقصد حیات سمجھ رہا ہے تو دوسری جانب دیہاتی زندگی گزارنے والے افراد شہری زندگی میں سرگرداں افراد کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ چنانچہ اردو فکشن میں دیہی اور شہری زندگی کی کشمکش بیان کرنا تخلیق کاروں کا ایک خاص رویہ بنتا گیا۔ آج وہ تخلیق کار جو سات آٹھ دہائیوں کے ادبی موسموں کو دیکھ چکے ہیں اور دیکھ رہے ہیں، مشرقیت کے دلدادہ ہیں اور آج بھی مغرب سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں عربی فارسی ادب کی بازگشت اردو ادب میں سنائی دینا ضروری ہے۔ ادھر ۱۹۴۷ء کے بعد کی نسل عربی تو درکنار اردو سے بھی نابلد ہوتی جا رہی ہے اور ہم ہیں کہ ان سے یہ امید کرتے ہیں کہ انہیں حافظ، سعدی، رومی، جامی اور صائب کے اشعار ازبر ہوں۔ اگر نوجوان زمین کے بجائے لفظ دھرتی استعمال کریں تو ہمارے بزرگوں کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ جاتے ہیں۔

ادب کی ایک صنف وہ بھی ہے جو آفاقی تجربات کو خوش آمدید کہتی ہے اور اردو کے ساتھ انگریزی الفاظ کی پیوند کاری سے اردو کو بین الاقوامی زبان بنانے کے خواب بن رہی ہے۔ ادھر معاشرے کی صورت حال یہ ہے کہ فسادات، اغوا، ڈکیتی، زنا بالجبر اور قتل کرنے والے افراد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نئی نسل میں بڑھتی ہوئی منشیات پسندی نے قدروں کو متزلزل کر دیا ہے۔ میڈیا کی رقابتی ہوڑ نے ٹی وی کے اسکرین کو ہمہ وقت روشن رکھنے پر مجبور کر دیا ہے اور بے ترتیب معلومات متحرک منظروں کے ذریعہ ناپختہ ذہنوں کے حواس میں تیزی سے رچ بس رہی ہیں۔ ایک ایسا گھر

بہت تیزی سے تشکیل پا رہا ہے جو ہماری تہذیب نہیں بن رہا ہے۔ سیاسی بحران، مذہبی بےزاری، نام نہاد سیکولرازم، غریبی، مہنگائی کے درمیان اردو شعر و ادب کی آج کیا حیثیت ہے جب کہ اردو زبان کی تدریس اور اردو رسم الخط بھی ایک مسئلہ بنا ہوا ہے یعنی اردو کا مستقبل؟ یہاں پھر یہ ایک سوال ابھرتا ہے کہ کیا ہم اردو والے ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ یہ سوال ایک لمحۂ فکریہ ہے اور اردو کے بڑے بڑے پروفیسروں کو محجوب کرتا ہے جن کے بچے اردو نہیں پڑھ رہے ہیں۔ مگر دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ کچھ بھی لوگ اردو کی ترقی و بقا کے نعرے بھی لگاتے ہیں، سمپوزیم، کانفرنسیں، سمینار ہوتے ہیں لیکن کسی کی بھی نظر اردو کی ترویج و اشاعت اور اس کے مستقبل کے بجائے اپنے اپنے چیک پر ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کن سمتوں میں سفر کر رہے ہیں؟ ذات سے ذات کی طرف یا صرف ریٹائرمینٹ کی طرف یا سوال برائے سوال ہی کو ترقی سمجھ رہے ہیں؟ واضح رہے کہ آج اردو تنقید اور اردو ادب صرف اس لئے جدید تنقید اور جدید اردو ادب ہے کہ اس میں سوال پر سوال بنائے جائیں۔ حالانکہ یہ طریقۂ کار مغربی ممالک میں بچوں کے تدریسی طریقۂ کار کے لئے زیادہ مستعمل ہے کہ بچوں کو اشیا کے نام ازبر کرانے کے لئے براہ راست اشیار کے نام بتلانے کے بجائے سوال قائم کرکے خود کو بچوں سے اشیار کے نام دریافت کئے جائیں۔ مغرب سے یہ طریقۂ کار جب ادب تک پہونچا تو سوسئر کی اسلوبیاتی تنقید اور دریدا کی ردّ تعمیری تنقید وجود میں آئی کیوں کہ اسلوبیات، ساختیات، پس ساختیات، سب میں لسانیات کے تحت مواد و متن، لفظ و معنی کی بحث "شبدار تھو واکیم" بن جاتی ہے

افسانے کی صورت حال یہ ہے کہ پلاٹ کو ترتیب و تنظیم عطا کرنے کے لئے جب زبان ساتھ نہیں دے پاتی، تو بغیر پلاٹ کا افسانہ، تجریدی افسانہ اور منی کہانیاں کتب و رسائل کی غذا بن جاتی ہیں۔ مثنوی و مرثیہ جیسی اصناف کو ادب سے خارج کرنے کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی رہی کہ اس میں علم اور قوت شعری کی ضرورت ہوتی ہے آج علم کی صورت حال یہ ہے کہ اردو اساتذہ منطق کو "منتق"، فقہ کو "فکا"، علم الانسان کو "ام السصان"، حشرات الارض کو "ہشراۃ العرض"، عروض کو "اردو"، صرف و نحو کو "سرف و نو"، مخطوطات کو "مختوتات"، علم بدیع کو "علم بدیح" (مثالوں کو مختصر کرتے ہوئے) تحریر فرما رہے ہیں، یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کا یہ حال ہے کہ اردو لیکچرز کو ہندی میں نوٹ کیا جا رہا ہے، پھر نمبر سے ایم۔ اے۔ فرسٹ اس کے بعد ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کی فراوانی، ایم! اے کے بعد صرف ایک جواب کا شوق، آپ کیا کر رہے ہیں؟ ہم پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مول صرف دو ہزار روپئے دیجئے اور ڈاکٹر بن جائیے۔ کہیں اتفاق سے اردو استاد کی جگہ مشتہر ہوئی، لیکچرار ہوگئے بلکہ پروفیسر بھی۔

شاعری کا یہ حال ہے کہ پابند اردو نظم بکھر گئی۔ غزل بیش پا افتادہ مضامین سے بھر گئی۔ پانچ، سات شعر سے آگے غزل جاتی ہی نہیں۔ اس میں بھی حشو و زوائد کی بھر مار

اب ایک سوال اور ابھرتا ہے کہ ادب کے نئے جہات کیا ہیں؟ جواب میں بہت سارے ازموں کا نام لیا جائے گا جب کہ اردو میں ازم اور تحریک کے نام پر صرف پونے دو تحریکیں ہیں جب کہ دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا ادب بین الاقوامی ادب سے آنکھ ملا رہا ہے۔

آج ہم عصر اردو ادب کا محاسبہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پاس فکر ہے لیکن علم نہیں، تخیل ہے لیکن اظہار کے لئے زبان نہیں۔ اس کے باوجود رطب و یابس وافر مقدار میں شائع ہو رہا ہے۔ نئے نئے ادبی رسائل کے اجرا کی خبریں بھی آتی رہتی ہیں۔ ترسیل کے المیہ کو علامتوں میں پناہ دی جا رہی ہے، اتفاق یہ ہے کہ اردو میں جو رجحان (مغرب کے تعلق سے) متعارف ہوتا ہے اس کے نقوش اردو کے ابتدائی شعرا کے یہاں بھی مل جاتے ہیں پھر نئے جہات کیا ہیں۔ یہ شاید کم مائیگی، احساس کمتری، ذہنی پس ماندگی، ادب کی صحت مند اقدار سے گریز، فرار، انتشار، بدامنی، انسانیت کا زوال۔ یہاں اگر میں چاہتا تو فرانسیسی ادب، امریکی ادب، روسی ادب اور جس ادب سے میں ناواقف ہوں اسی سے متعلق مفکروں کے اقوال بھی قارئین کو مرعوب کرنے کے لئے لکھ سکتا تھا۔ لیکن مرعوب کرنا میرا مقصد نہیں۔ میں صرف اردو شعر و ادب کا محاسبہ چاہتا ہوں

غریب کا مزید غریب ہونا، امیر کا بتدریج امیر ہوتے چلا جانا، نیچے سارے ازم فیل ہوگئے۔ پھر مارکسزم ہمارا آموختہ بن گیا، وہ بڑھتی ہوئی آبادی، سیارے اور طیارے، راکٹوں اور بموں کے ذخائر میں مسلسل اضافہ، مہلک ہتھیاروں کی ہوڑ، تیسری عالمی نیوکلیائی جنگ کی تیاری لیکن ہم معروف ہیں عروض کی کوئی نئی بحر ایجاد کرنے میں، یا پھر نئی ادبی صنف پر بحث و تنقید کے لئے تاکہ ادب کی نئی جہتوں میں شامل ہو سکیں اس موقع پر مجھے تین نام یاد آ رہے ہیں سلیم احمد، شمیم احمد اور وارث علوی۔ ان ناقدین نے اردو ادب کو نیا تنقیدی اسلوب دینے کی لاکھ کوشش کی لیکن یہ کوششیں بہت حد تک رائیگاں ہی گئیں۔

شمیم احمد نے اپنی تصنیف ۲ + ۲ = ۵ میں "تنقید کی کھڑاؤں" کے عنوان سے بڑی دلچسپ باتیں کی ہیں۔ ان کی نظر میں "تنقید وہ واحد صنف ادب ہے جس کا شمار نہ ہیومنٹیز میں کیا جاتا ہے، نہ سائنس میں اور نہ سماجی علوم میں، عمر کا اندازہ اس سے لگائیے کہ بیسویں صدی میں اسے اردو ادب کی ایک اہم صنف قرار دے کر متعارف کرایا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۶ء تک آتے آتے اسے بیشتر تخلیقی اصناف پر ترجیح دی جانے لگی اور پھر اس کے بعد بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا کہ نقاد ایک ڈکٹیٹر بن بیٹھا۔ جس کو چاہتا تمغے دیتا، سرٹیفکیٹ اور اعزاز بخشتا، جس کی بیساکھیوں کے سہارے کوئی سکۂ رائج الوقت بن کر چلتا اور کوئی سرخ پھول بن کر مہکتا جن کو قابل اعتنا سمجھتا وہ اپنا سارا شعر و ادب "ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ" کہہ کر کسی نادر شاہ کے انتظار میں بیٹھ جاتا، آخر آخر وہ زمانہ آ ہی گیا جب ایک ڈکٹیٹر نے ایک ادبی نشست میں اپنے ہی ہم مشرب نقاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نشست کے عوام سے اپیل کی، "منہ بند نہیں کر دیتے آپ اس جاہل کا" افسوس کہ اس کے فوراً بعد اس تحریک ہی کا منہ بند کر دیا گیا ورنہ ان ادبی آمروں کا نظریاتی دور کہیں یہاں تک آ گیا ہوتا تو جگہ جگہ پیچ پیچ کی سولیاں نصب ہوتیں اور ان کے مخالفین ادب کی قربان گاہ پر نہیں بلکہ ان پیچ پیچ کی سولیوں پر ٹنگے نظر آتے اور ان پر نصب تختیوں پر لکھا ہوتا کہ یہ لکھنؤ والا عوام دشمنی اور رجعت پسند عناصر کے ہاتھوں کھیل رہا تھا، خیر وہ زمانہ نہ آ سکا مگر اردو ادب تنقید کے ہاتھوں واقعی سولی پر چڑھ گیا۔ مجھے اپنے ادب میں تنقید کا وجود "بھرت" کے مماثل نظر آتا ہے جس نے تخت پر رام کی کھڑاؤں رکھ کر سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ بھرت اپنے اس فعل میں مخلص تھا اور ہماری تنقید تخلیق کی کھڑاؤں کو بمشکل برداشت کر پا رہی ہے (مگر مجبوری یہ ہے کہ تخلیقی کھڑاؤں کے بغیر اس کا اپنا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے) اس جگہ سے تنقید کا خود غرضانہ اور مصنوعی تصور پھوٹتا ہے اور اس کے سیاسی اغراض و مقاصد کا ثبوت ملنے لگتا ہے مجھے خود بھی تنقید سے دلچسپی رہی ہے اس لئے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ میں تنقید کی اہمیت سے منکر نہیں مگر میری مشکل یہ ہے کہ میں ایک تو گنگو تیلی کو راجہ بھوج نہیں کہہ سکتا اور دوسرے اصل حکمراں رام ہی کو سمجھتا ہوں اس کی کھڑاؤں کو نہیں۔

شمیم احمد کا یہ جملہ کہ "گنگو تیلی کو راجہ بھوج نہیں کہا جا سکتا" تنقید کے ضمن میں ہمارے ناقدین کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ کسی بھی نثری تحریر پر صنف تنقید کا لیبل لگانا درست نہیں۔ وید، زبور، انجیل، قرآن حکیم پر کس صنف کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔؟ مکالمات افلاطون، مہابھارت، روسو کے اعترافات، چرچل کی جنگ عظیم، چینی دانشوروں کے اقوال (جو یقیناً عظیم تحریریں ہیں) کیا انہیں کسی صنف سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔؟ خطوطِ غالب، آب حیات، سیرۃ النبی کو کس خانے میں رکھیں گے۔؟ ظاہر ہے جواب گول مول ہوگا۔ لیکن یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان تحریروں میں تخلیقی جوہر موجود ہے جو عالمگیر اپیل رکھتا ہے انہیں پڑھ کر انسان خود ایک کُل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کیا آج کے ادب میں ایسی روح پرور کیفیات اور آفاقی جہات موجود ہیں۔ اگر نہیں تو کوشش کی جائے کہ ہم ادب کے ایسے نئے جہات قائم کریں جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو، جو خوشامدانہ یا معاندانہ نہ ہو جس میں طمع نہ ہو، صداقت ہی صداقت ہو، قصیدہ خوانی نہ ہو، گدھے گھوڑے ایک نہ ہوں، سنجیدگی ہو، متانت ہو، اسلوب کی سادگی سے ادب کے دامن کو سجایا جائے۔ بھلا ہو بھائی افتخار امام کا جنہوں نے "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کے ذریعہ نئے شعری افق کی جستجو کی ہے

غزل ہی اردو کی وہ واحد صنف سخن ہے جس کے اچھے شعر کسی بھی تنہائی کو محفل بنا سکتے ہیں پورے وجود کو تازگی دے سکتے ہیں یہ تاثیر کسی اور صنفِ شاعری میں نہیں۔ ترقی پسند تحریک کی تمام تر کوششوں کے باوجود صنف غزل آج بھی زندہ اور رواں دواں ہے۔ آج مغرب کا مہذب طبقہ یہ غور کر رہا ہے کہ دس ہزار صفحات کو اگر لفظ B (بی) سے ظاہر کر دیا جائے تو نہ صرف روپیہ بلکہ وقت کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے غزل کا ایک تہذیبی وصف یہ بھی ہے کہ یہ عربی، عجمی، اور ہندی تہذیب کے مشترک عناصر کی مظہر ہے اگر اس کا سلسلۂ نسب تلاش کیا جائے تو قدیم ادب کے سرمائے میں یہ نوزائیدہ اسلوب کے طور پر ابھر کر آئی۔ ظاہر ہے کہ قدیم فارسی پہلوی، ژند، سنسکرت اور پراکرتوں کے ادب میں اس کے نقوش نہیں ملتے۔ اس لئے یہ کہنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے کہ غزل ہی ایسی صنف سخن ہے جو "جدید اسلوب و جدید غزل" کے نام سے متعارف ہوئی اس لئے ادب کے نئے جہات کے تخلیقی اظہار کے لئے غزل ہی ایک موثر ترین صنف ہے۔

آج کے عہد کو دانشور، سائنسی عہد کہتے ہیں ان کے خیال میں بڑا ذہن، ادب میں نہیں سائنس میں سرگرداں ہے اور سائنس ہفت افلاک میں اپنی فتوحات کا ڈنکا پیٹ رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آج کا انسان کیا سائنس کی گرم بازاری اور مشینوں کی بے حس دنیا سے خوش ہے۔ میرے خیال میں آج کا تخلیق کار ایٹمی وجود میں عربوں کھربوں لوگوں کی موت کا خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔

[باقی صفحہ ۱۴ پر دیکھئے]

ندا فاضلی



چین کی نسائی شاعری



چین بھارت کی طرح ایک زراعتی تہذیب کا ملک ہے۔ دونوں کی طویل تاریخ، رقبہ، آبادی اور بدھ مت کی مشترکہ ماثلتوں نے ان کے سماجی و معاشی مسائل کو بھی کسی حد تک ہم صورت بنا دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے ان مسائل کے اظہار پر سیاسی پابندیوں نے (ملکی آزادی کے بعد) چین کے ادب کے ایک بڑے حصہ کو کافی عرصہ تک اس ذہنی کشادگی سے دور رکھا جو زندہ ادب کی نشو و نما کی ضروری شرط ہے۔ اشالن کے دورِ اقتدار میں بھی سرکاری اشتہاریت کو اسی طرح کا ادبی درجہ حاصل تھا۔ ان پابندیوں کے خلاف تخلیقی احتجاج چین کے نئے ادب کا چہرہ ہے۔ اس احتجاج کی بلند آواز، جو کئی سالوں تک چین کے ادبی بحث و مباحثے کا موضوع رہی ہے، وانگ مینگ کی ۱۹۵۰ میں لکھی ایک کہانی "سرکاری ڈپارٹمنٹ میں نیا آدمی" میں نمایاں طور پر سنائی دیتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار لن عمل و قول کے تضاد کے آئینے میں ارد گرد کے ماحول کو دیکھنے اور دکھانے کی جرأت کرتا ہے۔ نوانگ سا تھی زین کہتی ہے۔

"میں جب بھی تمہیں دیکھتی ہوں تو خود کو زیادہ جوان محسوس کرنے لگتی ہوں۔ تم بے خوف ہو ایماندار ہو۔ تم اپنے سچ کے لئے لڑنا چاہتے ہو۔ لیکن یہی سب کچھ تمہارے لئے خطرہ بھی ہے۔"

اس کہانی کے خالق کو اس بے باکی کے جرم میں بیس سال خاموشی کی سزا بھگتنی پڑی۔ وانگ مینگ پہلے لی جنفا (۱۹۷۶ - ۱۹۰۰) اور دائی وینگ شو (1950 - 1905) جیسے پیشہ پروپگنڈائی ادب کے مخالفین میں شامل تھے۔ انہیں شعری ادب میں علامتی تحریک کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ چین کے ادب میں سرکاری پابندیوں اور کلاسکی حصار بندیوں کا انحراف تو موجودہ صدی کی دوسری تیسری دہائی سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ لیکن ۱۹۴۹ کے بعد اس کے نقوش واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں یہ ہی دور ماؤ کی رہنمائی میں چین کی کمیونسٹ حکومت کے آغاز کا ہے۔ چین میں تائی وان اور بیجنگ کے شعرا فکر و اظہار کی سطح پر دو سمتوں میں منقسم محسوس ہوتے ہیں۔ ایک طرف بیرونی اثرات کے خلاف شاعری میں دیسی جذبہ و احساس پر اصرار اور اظہار و بیان کی جدت سے انکار ملتا ہے۔ دوسری طرف بیجنگ کے شعراء جدیدیت کے شجرِ ممنوعہ کی نئے سرے سے آبیاری میں مصروف ہیں۔ چین کے ادب کا موجودہ پس منظر انہیں متضاد رویوں کا آئینہ ہے۔ یہ متضاد رویے تنقید میں پابند اور آزاد نظم، روایت اور جدیدیت، مقصدی شاعری اور خالص شاعری کے بحث و مباحثے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ چین کی شاعرات کی تخلیقات کم و بیش اسی منظر نامے کا حصہ ہے لیکن اس فرق کے ساتھ جس کی طرف ایلین شو والٹر نے اپنے ایک مضمون میں اشارہ کیا ہے۔

"عورتیں ایک ہی دیس میں رہتے ہوئے، مردوں سے مختلف دیس کی شہری ہوتی ہیں۔ ان کا ادب بھی اسی لحاظ سے الگ پہچان رکھتا ہے۔"

ان شاعرات کے موضوعات اور ان کے برتاؤ میں اس فرق کو دیکھا جا سکتا ہے۔ بنگ تنگ پیدائش ۱۹۰۰ سے نئی شاعرہ لانگ لیو ہنگ (1995) تک خواتین کی نئی شاعری نے تقریباً تین چوتھائی صدی سے زیادہ کا سفر طے کیا ہے یہ شاعری جو موضوعی رنگا رنگی اور انداز و اظہار کی جمالی ہے، اس میں چین کی عورت کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔

(۱) بنگ شنگ پیدائش ۱۹۰۰۔ چین کی بزرگ شاعرہ ہیں۔ انہوں نے چین میں تعلیم مکمل کر کے امریکہ میں ویلیسلی کالج سے ماسٹر ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ وہ شاعری کے علاوہ افسانوی و تنقیدی ادب کا بھی اہم نام ہیں خلیل جبران اور ٹیگور کی مترجم بھی ہیں۔

(۲) چن جنگ رونگ (1990 - 1917) چین کی نئی ادبی تحریک کے بانیوں میں تھیں۔ نظریاتی وابستگی کے ساتھ موضوع و اظہار میں تجرباتی رجحان کی قائل ہیں۔ چین کی نئی شاعری، نام کے ادبی میگزین کی مدیرہ رہ چکی ہیں۔ ۱۹۴۹ میں آزادی کے بعد عدالت سے منسلک ہو گئیں۔ تین شعری مجموعے اور کئی نثری کتابوں کی مصنفہ ہیں۔

(۳) فوشین لن پیدائش ۱۹۴۶ چین کی نئی شاعرہ ہیں ان کے پہلے شعری مجموعہ پر ۱۹۸۱ میں، قومی شاعری اعزاز، مل چکا ہے۔ ان کی نظمیں خوبصورت زبان اور طرزِ بیان کی نفاست کے لئے کافی مقبول ہیں۔

(۴) چانگ یے پیدائش ۱۹۴۸ شنگھائی۔ شنگھائی یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کر کے، اس میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ "شاعر کی محبت" ۱۹۸۶ میں شائع ہو چکا ہے۔

(۵) وانگ سیاؤنی پیدائش 1955۔ جلن یونیورسٹی سے گریجویشن کر کے چانگشن میں ایک فلم اسٹوڈیو میں کام کیا، آج کل شین زین میں ہیں۔ معیاری ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

(۶) شو تنگ پیدائش 1952۔ چین کی مقبول ترین شاعرہ ہیں۔ ان کی ایک نظم "میرا وطن میرا پیارا وطن" جس کو قومی اعزاز سے نوازا گیا ہے، کافی مشہور ہے۔ اب تک چند شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں انہوں نے اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ۔ "میری نظمیں غم و خوشی کا غنائیہ ہیں۔ یہ صرف وطن کی محبت کا ہی اظہار نہیں ہیں، انسانی رشتوں کی تہذیب کا قصیدہ بھی ہیں"

*

مٹھی بھر نظمیں

پنگ شنگ

مشورے

ایک ہری نرم کونپل
جوانی سے کہتی ہے
اپنے آپ کو پھیلاؤ
ایک مرجھاتا سفید پھول
جوانی سے کہتا ہے
اپنے آپ کو محفوظ بناؤ

ایک تازہ سرخ پھل
جوانی سے کہتا ہے
اپنے آپ کو بھینٹ چڑھاؤ۔

ذرّات

یہ غلط ہے
نئے بر اعظم کی تخلیق
طوفانی لہروں کی برکت ہے
یہ تو
ان کے نیچے بہتے ہوئے
ننھے ذرات کی کرامت ہے

دو تجربے

بوڑھے نے بچے سے کہا
روؤ
چیخو، چلاؤ
کہ دنیا بے رنگ اور ناپائیدار ہے
بچے نے مسکرا کر جواب دیا
گستاخی معاف
جو میرا تجربہ نہیں ہے
اسے ماننا بیکار ہے
بچے نے بوڑھے سے کہا
جھومو
ہنسو
کہ دنیا حسین اور خوشگوار ہے
بوڑھے نے آہ بھر کر جواب دیا
معاف کرنا بیٹا
جس کا مجھے تجربہ ہے
اس کی نفی کرنا دشوار ہے

گھاس کی پتی

اے کمزور گھاس کی پتی
تیرے سر اٹھا
دراصل تجھے
ہمارے لہلہایا ہے
تو نے دنیا کو حسین بنایا ہے

چانگ یے

طلاق

غمزدہ چہرے سے مسکراتی
پانچ سال کے بچے کی انگلی تھامے
وہ رہ رہ کے اپنی بھیگی آنکھوں کو
دوسروں سے چھپاتی ہے
تنہا کشتی دریا میں تیرتی جاتی ہے
بچہ اپنی ماں کے ساتھ
کہیں دور بہت دور جا رہا ہے
اس کے اندر چھپا اس کے باپ کا سایہ
اس کے معصوم ہاتھوں میں دبی چاکلیٹ کو
توڑتے مروڑتے جا رہا ہے
یہ ایک نظارہ
کئی جانی انجانی یادوں کو جگا رہا ہے

محبت کی رہگذر

موسم بہار کی نئی صبح
سایہ دار درختوں میں رقص کناں تھی
کار ایک نئے راستے پر رواں تھی
کوئی ایک آواز
میرا نام لے کر میرا تعاقب کرتی رہی
اور کار محبت کی رہگذر پر بنا رُکے
گزرتی رہی
اسٹیرنگ گھومتا رہا
موسم جھومتا رہا
میں شاید ادھر سے گزرنا نہیں چاہتی تھی !!
لیکن یہ زیتون بلاؤس ؟
قمیض میں یہ ٹکے ہوئے پھول کی مسکراہٹ ؟
گالوں میں یہ جگمگاہٹ ؟
پستانوں میں یہ سرسراہٹ ؟
راستے کی چھتنار شام
ان رازوں کو خوب جانتی ہیں
میرے بچپن کی ساتھی ساری چڑیاں
ان کمزوریوں کو پہچانتی ہیں

میری کار محبت کی رہگذر پر
بنا رُکے
گزرتی رہی
میں خاموش رہی
اندر چھپا ہوا لفظ
باہر آنے کو ترستا رہا
اور میرے اندر کا آسمان
مسلسل برستا رہا
برستا رہا

شو تینگ

یہ میں نے نہیں بتایا

تم
نیچے تنگ گلی سے رخصت ہو رہے تھے
میں چھت سے اتر کر
تمہارے سامنے کھڑی ہو گئی

"کیا تم گھبرا رہی ہو ؟"
میں خاموشی سے تمہاری جیکٹ کا بٹن
گھماتی رہی

ہاں میں گھبرا رہی ہوں
لیکن کیوں ؟ یہ میں نے نہیں بتایا
ہم ندی کے کنارے ٹہل رہے ہیں
رات خوبصورت تھی
جسموں میں حرارت تھی
ہمارے ہاتھوں کی گرمی سے متاثر ہو رہے تھے
"کیا تم خوش ہو"
میں نے دیکھا آسمان کے سارے ستارے
میری طرف آ رہے تھے
ہاں میں خوش ہوں
لیکن کیوں یہ میں نے نہیں بتایا

تم میرے ڈیسک پر جھکے
میرے لکھے ہوئے مسودوں کو پڑھ رہے تھے
میں نے شرما کر تمہارے ہاتھ سے
کاغذ چھین لئے
"کیا تمہیں بھی محبت ہے"
ہاں مجھے محبت ہے
لیکن کیوں، یہ میں نے نہیں بتایا

ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا

ہر تناور درخت
طوفان میں اکھڑ جائے
ایسا نہیں ہوتا
ہر بیج کو زمین راس نہ آئے
ایسا نہیں ہوتا
ہر جذبہ ریت بن جائے
ایسا نہیں ہوتا
ہر خواب اپنے آسمان کو نہ چھو پائے

ایسا نہیں ہوتا
نہیں ! ہر بار ایسا ہی ہو
ایسا نہیں ہوتا

ہر تارِ مسرت اپنے لئے ہی روشن ہو
اور دوسروں کے تمام دُکھ
ایسا نہیں ہوتا
ہر ستارہ صبح کی آمد کو جھٹلائے
ایسا نہیں ہوتا
ہر گیت ہواؤں میں کھو جائے
اور دل کو نہیں دھڑکائے
ایسا نہیں ہوتا
نہیں ہر بار ایسا ہی ہو
ایسا نہیں ہوتا
کسی زخم کی دوا نہ ہو
کسی درد میں صدا نہ ہو
ہر غار میں ادبار ہو
ہر مفلس بے نادر ہو
ہر ارادہ سنگسار ہو
نہیں ! ہر چیز خون اور آنسو ہی ہوتی نہیں ہے
زندگی
ہنستی بھی ہے صرف روتی نہیں ہے

کیسن چنگ رونگ

پروں والی چڑیا

سورج کو اٹھائے ہوئے
گلابی بادلوں کو پروں میں چھپائے ہوئے
ہواؤں کو لعنہ بنائے ہوئے
ننھی سی چڑیا
تو ستی میں جتنا رقص کرتی ہے
اتنی ہی دھرتی کی تھکن اُترتی ہے
تو جب بھی آتی ہے
میری تنہا کھڑکی میں بہار سماتی ہے
دور تک آکاش کی نیلاہٹ پھیل جاتی ہے

میرے دکھتے ہوئے کندھوں سے
محنت
ذلت
اور قید خانے کی سرد دیواروں کا بوجھ اترے
تیرے سنہرے گیتوں میں سمٹ جاتا ہے
تیرے سنگیت کی لہروں میں
میرا وجود پرواز کرتے ہوئے
بادل بن جاتا ہے۔

وانگ شیاؤنی

گزرا ہوا وقت

ایک پرانے پل پر جھکی ہوئی
میں
لہروں میں چاند کو تیرتے دیکھ رہی تھی
اسی وہ شام
جو ایسے ہی کہر میں لپٹی
لے رہی تھی میرا نام
تم کتنی خوبصورت ہو
کسی نے کہا تھا
انجانی آواز کو سن کر میں مڑی
اور آگے بڑھ گئی
اسی پرانے پل پر جھکی ہوئی
میں
پانی میں یونہی کنکر پھینک رہی ہوں
چاند کے چہرے پہ بکھری جھریاں دیکھ
رہی ہوں

ژو تھی تن

میں ایک سیب ہوں

میں ایک سیب ہوں
ایک تازہ سرخ سیب
میری مسکراہٹ
بچے کے چہرے پر چمکتی ہے
میری مٹھاس
ضعیف دل میں دمکتی ہے

میں لمبے سفر میں
ملاح کا یار ہوں
میں ریگستان میں
تشنگی کا غمخوار ہوں
میں مریض کی صحت کا
رازدار ہوں

میں ایک سیب ہوں
ایک تازہ سرخ سیب
میں سورج اور زمین کی پریت ہوں
پھولوں اور چمن کا سنگیت ہوں
میں وہ چمکتا ہوا ستارہ ہوں
جنہیں چھوا جا سکتا ہے
میں وہ سیپ کا موتی ہوں
جنہیں حاصل کیا جا سکتا ہے
میں ٹھہرا ہوا لمحہ
بڑھتی ہوئی سمفنی ہوں
میں امید اور جذبات کا سنگم ہوں
میں ایک سیب ہوں
ایک تازہ چمکتا سرخ سیب۔



ترجمہ: محمود احمد قاضی
ملت کالونی نمبر ۲ راہ والی، گجرانوالہ۔ پاکستان

نائیجیریا: عادا بوریما

دروازہ

سوئی سوئی آنکھوں والا چھوٹے قد کا گر اس نوجوانی کے زمانے میں کسی قدر شاہانہ طرز کا حامل میرا دوست امادو جس کی چھیالیس سالہ زندگی میں کوئی ہلچل نہ تھی اور جس کے گرد خوشی اور قہقہے بکھرے پڑے تھے۔ میرے خیال میں دنیا کا سب سے پرسکون شخص تھا۔ اس نے سکون، خاموشی اور تنہائی سے اپنا ناطہ جوڑ رکھا تھا۔ اس نے یہ وطیرہ اپنی مسلسل ہٹ دھرمی سے اختیار کیا تھا۔ وہ ہجوم کے شور شرابے سے گھبراتا تھا۔ تنہائی ہی اس کی ساتھی تھی۔

خدا نے اس کی خواہشات پوری کر دی تھیں پچھلے دس سالوں سے ایک تجارتی ادارے میں بطور اکاؤنٹنٹ کام کرتے ہوئے اس کی مالی پوزیشن خاصی بہتر ہو گئی۔ اس نے اس دوران شادی کی اور ایک ایسا گھر بھی اس نے بنا لیا جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔ یہ گھر جو ذرا اونچائی پر بنایا گیا تھا۔ اور جس کا پچھلا صحن ایک حفاظتی تار میں لپٹا ہوا تھا۔ عام گھروں سے کافی ہٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس تک پہنچنے کے لئے ایک راستہ تو مشرق کی طرف سے تھا جو یوکلپٹس درختوں کے گھنے بن کے درمیان سے ہو کر جاتا تھا۔ اور دوسرا شمال کی طرف سے تھا جو پہلے راستے کو کاٹتا ہوا اتری باغ میں گم ہو جاتا تھا۔

مکان کی پچھلی طرف سے داخلے کا راستہ شمالی راستے کی جانب جاتا تھا۔ وہ ہر شام کو کام سے فارغ ہونے کے بعد مکان کے پچھواڑے کے لان میں آرام کرسی میں نیم دراز ہو کر اپنے ہاتھوں میں کتاب پکڑے مطالعے سے لطف اندوز ہونا پسند کرتا تھا۔

میں ہر دوسرے دن اس سے ملنے آتا تھا۔ وہ مجھے اور اپنی بیوی کو ایک اور کرسی لانے کو کہتا۔ اور پھر رسمی خیر خیریت پوچھنے کے بعد میں اس کے قریب بیٹھ جاتا اور پھر سورج غروب ہونے تک ہم دونوں بیٹھے خاموشی میں ڈوبے رہتے۔

زندگی کی اس یکسانیت اور سکون کو جس میں کبھی کبھی درختوں پر چہچہانے والے پرندوں کی آواز در آتی تھی۔ کسی شخص نے ایک دن اس گھر سے ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس واقعے سے چند دن پہلے امادو کی بیوی ایک مہینے کے لیے ایک مغربی گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے پاس چلی گئی تھی۔ وہ اکیلا تھا۔ اور اپنی زندگی کی تنہائیوں کی خوشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیونکہ میں اس کے مزاج سے واقف تھا اس لیے میں ایک ہفتے تک اس سے دور رہا۔ پر ایک شام کو کھانے کے وقت سے ذرا پہلے وہ اپنے ہاتھ میں ایک بیگ پکڑے ہوئے گھبرائے ہوئے انداز میں مجھ سے ملنے آیا۔

تین دن پہلے حالانکہ یہ بات بہت عجیب محسوس ہو گی اس نے ایک فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا جس میں لوئیس دی فیونتز مرکزی کردار ادا کر رہا تھا اور اس خیال سے کہ اس طرح اسے بہت سے لوگوں سے سامنا کرنا ہو گا۔ وہ اس شام گھر سے باہر نکلتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ تفریح کی خواہش بہرحال پہلی بار اس پر حاوی ہو گئی۔

اس نے جلدی جلدی نہانے کے بعد اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا آملیٹ تیزی سے نگلا اور پھر لباس بدلنے کے بعد اس نے شو شروع ہونے کے صرف چند منٹ پیشتر اپنے آپ کو سینما ہال میں پایا۔ اس شام کو میں بھی بہت سے فلم بینوں کے درمیان موجود تھا۔ اور یہ اس نے فلم دیکھنے کے بعد جانا۔ ہر کوئی اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے قہقہے لگا رہا تھا اور دوسرے میں امادو کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ قطعی خوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ وہ ابھی سینما ہال سے اٹھ جائے گا۔ اداکاروں کے فن سے متاثر ہو کر وہ فلم کے اختتام تک بیٹھا رہا۔ اور رات گئے گھر لوٹا۔

وہ بیرونی احاطے کا دروازہ کھول کر صحن میں داخل ہوا تو ان بلبوں کی روشنی میں نہا گیا۔ جن کو وہ جلتا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچا تو وہاں بھی روشنی تھی۔ لیکن جس چیز نے اس کے پاؤں جکڑ لیے

تھے۔ وہ یہ تھی کہ دروازہ بالکل کھلا تھا۔

اور یہ بات یقینی تھی کہ وہ باہر جاتے ہوئے گھر کا دروازہ بند کر کے گیا تھا ۔۔۔ تو پھر یہ دروازہ کس نے کھولا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ شاید یہ میں تھا جو اس کا انتظار کر رہا تھا لیکن یہ کس طرح ممکن تھا جبکہ ہم دونوں نے شو ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے کو الوداع کہا تھا؟ اور اگر یہ میں ہی تھا تو میں اندر کیسے داخل ہوا جب کہ میرے پاس اس گھر کی دوسری چابی ہی نہیں تھی۔ کیا یہ کوئی اجنبی ہے لیکن نہیں۔ وہ تو اجنبیوں سے ملتا ہی نہیں۔ شاید یوں ہوا تھا کہ وہ چابی دروازے میں ہی بھول گیا تھا۔ لیکن پھر وہ اپنی قمیض کی ایک جیب کے کونے میں چابی کی موجودگی کس طرح محسوس کر سکتا ہے۔؟ اگر یہ یہاں نہ ہوتو پھر اسے دروازے کے چابی کے سوراخ میں ہی ہونا چاہیئے تھا؟ اس بات کا اسے پکا یقین تھا کہ اس نے دروازہ بند کیا تھا۔ ہاں اسے یقین تھا۔ اسی لمحے اس نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا کوئی اندر ہے؟" لیکن جواب ندارد "اندر کوئی ہے" وہ دوبارہ بولا تھا۔ وہی خاموشی۔ یہ خاموشی ناقابل برداشت حد تک پراسرار طریقے سے اسے خوفزدہ کر رہی تھی۔

وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے بھاگ جانا چاہا۔ مگر پھر اس نے اس اقدام کو بے وقوفی سمجھا۔ وہ پھر آگے بڑھا اور اس نے اس دروازے کی طرف دیکھا جس نے اب اس کے اندر ایک خوف بھر دیا تھا۔ رات اب بھیگ چلی تھی۔ چاروں طرف ٹھنڈک تھی۔ مگر اس نے گھر میں داخل ہونے کی جرأت نہ کی۔ وہ مسلح نہیں تھا۔ اور اسی لئے وہ حیران ہو کر سوچ رہا تھا کہ وہ حملے کی صورت میں اپنا بچاؤ کیسے کرے گا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی مسلح ہونے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ضرورت پڑنے پر ایک نہتا آدمی کتنا غیر محفوظ ہوتا ہے۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ ایک آدمی کے پاس صرف ایک ہی زندگی ہوتی ہے۔

بعض اوقات آئندہ زندہ رہنے کے لئے دوسرا لمحہ موجود ہی نہیں ہوتا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے کسی دوسری جگہ پر رات گزارنے کے بارے میں سوچا۔

لیکن اگر یہ بات پھیل گئی تو اسے بزدل سمجھا جائے گا۔ نہیں بھاگ جانے سے مر جانا اچھا ہے۔ مستحکم ارادے کے ساتھ اس نے قدم دروازے کی طرف بڑھائے روشنی میں نہائی ٹیرس کو عبور کیا۔ دروازے کے ہینڈل کو پکڑ کر اس نے دروازے کو پورا کھول دیا۔ اور پھر وہ لاونج کے درمیان کھڑا پورے بدن سے کانپ رہا تھا۔

وہ ایک تحیر میں گھرا ہوا تھا۔ کھانے کی میز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ کچن کے آخری سرے پر بالکل دیوار کے ساتھ اور اس پر وہ پلیٹ ابھی تک وہیں پڑی تھی جس میں کہ اس نے آملیٹ کھایا تھا اور اس کے قریب چاقو، فورک، ایک خالی گلاس اور ایک ڈش کلاتھ بھی پڑا تھا۔ اس کی بازوؤں والی چار کرسیاں بھی وہیں گہرے سبز قالین پر پڑی تھیں۔ اور اپنی جگہ سے ہلی تک نہ تھیں۔ لیکن مہاگنی لکڑی سے بنی الماری ہاں اسے مزید جھٹکا لگا تھا۔ یہ کھلی پڑی تھی۔ اور وہ جس نے کچن کے برتنوں وغیرہ کے علاوہ یہاں کچھ اور تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اس کے پٹ یوں ہی وا چھوڑ دیئے تھے؟ پچھلی طرف موجود دو شیلفوں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی وہ ان کے قریب آیا اور ایک چھوٹی سی لوہے کی سلاخ کے پاس ایک گیلا کپڑا پڑا دیکھا۔ یہ چیزیں یہاں کس نے ڈالی ہیں؟ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور محسوس کیا کہ شائد سلاخ کو دروازے کا تالا توڑنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ لیکن یہ کپڑا۔۔۔!

اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ کوئی گھر میں ضرور داخل ہوا تھا لیکن کون؟ اور اگر وہ اس وقت گھر ہی میں کہیں کسی جگہ چھپا ہوا ہو تو۔ وہ اس خیال ہی سے کانپ گیا کہ کوئی اس وقت بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اور اس پر حملہ آور ہونے کے لئے پر تول رہا تھا۔ اس نے باہر چلے جانے کے بارے میں سوچا لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ اس بے بسی کی حالت میں کسی کو مدد کے لئے پکارنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

وہ دبے پاؤں اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا جو اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس نے اسے آہستگی سے کھول دیا۔ اس نے یہ محسوس کرنے کے لئے کہ کوئی اور تو اندر موجود نہیں پہلے اس تھوڑے سے کھلے ہوئے دروازے میں اپنا ہاتھ اندر بڑھایا۔ صندوق بیگ۔ اور الماری ساری چیزیں وہیں تھیں جہاں وہ انہیں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے باتھ روم اور بیڈ روم میں جھانکنے کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ اس کے نزدیک وہاں کوئی قابل ذکر چیز موجود نہیں تھی۔

وہ آرام کرسی میں گر گیا۔ کسی نے اس کے گھر میں نقب ضرور لگائی تھی اور اب اس کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا۔ اجنبی یقیناً چور نہیں تھا۔ وہ یہاں سے ہر چیز اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔ یہاں کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہیں تھا۔ تو پھر۔ کیا وہ اسے جان سے مار دینے کے لئے آیا تھا؟ ہاں ایسا ہونا ناممکن بھی تو نہیں تھا۔۔۔ وہ لوگوں کی نظروں

میں ایک اکاؤنٹنٹ بہت اچھی مالی حیثیت کا مالک ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی حاسد شخص اس کے وجود کو ختم کرنے اور اس کی جائداد کو ہتھیانے کے لئے ایسا اقدام کر سکتا تھا!

اس نے اپنے قریب ہی پڑے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

ہیلو ۔ پولیس اسٹیشن؟ مہربانی کر کے مجھے پولیس چیف مسٹر دوکی سے ملوائیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

چند لمحوں بعد اسے بتایا گیا "پولیس چیف مسٹر دوکی سے بات کیجئے!"

مسٹر کمشنر ۔ میں امارو بول رہا ہوں۔ مہربانی کر کے فوراً میرے گھر پر تشریف لائیے۔ کوئی یہاں میری جان کے درپے ہے۔ بڑے کلاک کے مطابق اس وقت رات کے دو بجے تھے۔

پانچ منٹ بعد پولیس چیف اپنے ایک ماتحت کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ وہ امارو کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور فوراً ہی انکوائری شروع ہو گئی۔ دوکی الف سے ی تک ہر چیز کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کہ امارو نے کس ہمسائگی کے بغیر یہاں اتنا دور یہ مکان کیوں بنوایا۔ اس کے پاس کتنی چابیاں ہیں! اس کی بیوی کہاں گئی ہے۔ اور کتنے عرصے کے لئے گئی ہے! کیا اس کے پاس کوئی نوکر بھی ہے! کوئی محافظ؟ کون کون سی چیزیں چرائی گئی تھیں! کیا اس نے باغ میں قدموں کے کوئی نشان دیکھے ہیں۔ اسے ختم کر کے کون فائدہ اٹھا سکتا تھا دوسرے جو سوالات اس سے پوچھے گئے۔ ان کی نوعیت کیا تھی یہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں جبکہ جوابات اس سے بالکل مختلف نہیں جو آپ پہلے ہی سے جانتے ہیں ۔ دوکی نے سب کچھ نوٹ کر لیا۔ اور یہ راز کی بات ہوگی۔ اگر کہیں آپ کو یہ بتا دوں کہ دوکی بھی امارو سے متفق تھا کہ سلاخ کو واقعی دروازہ کھولنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اور کپڑے کو اپنی انگلیوں کے نشانات مٹانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اور وہ پر اسرار شخص جو یہاں مکان میں داخل ہوا تھا اس کی نیت یہاں سے کچھ چرانے کی نہیں بلکہ کچھ اور بھی۔

اب چونکہ کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے انسپکٹر وہاں سے چلا آیا۔ مگر پولیس مین کو امارو کے پاس وہیں چھوڑ گیا۔ اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا ہو سکتا تھا وہ "شریف آدمی" پھر چلا آتا ہے۔

اگر دن اور راتیں پولیس مین وہاں اس لئے موجود رہا تھا کہ اس طرح وہ اس لعنت والے پر ہاتھ ڈال سکے تو امارو نے بھی اس حالت میں یہ وقت گزارا جیسے کہ اس کی زندگی کے دن ختم ہوئے ہوں۔ دن اور رات کے مختلف حصوں میں نیند لیتے ہوئے امارو نے خوابوں میں ایک لمبے قد کے آدمی کو اپنے سر پر ایک تلوار تانے ہوئے پایا۔ وہ اپنے اس ڈراؤنے خواب کے دوران ہمیشہ اس وقت ڈر کر جاگ گیا تھا جب اس نے محسوس کیا کہ اب وہ خوفناک ہتھیار اس کی گردن پر گرنے ہی والا ہے۔

تیسری صبح تک جب کوئی انہونی بات ظہور پذیر نہ ہوئی۔ تو پولیس چیف نے اپنے آدمی کو واپس بلا لیا۔ اور امارو پھر اکیلا رہ گیا ۔ سہ پہر کے بعد واپسی پر امارو اپنے گھر کے باغ میں بڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ اس کے چہرے پہ ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بار بار جھکا یو کلپٹس کے درختوں کے اس جھنڈ کی طرف دیکھتا رہا جو ایک حقیقی جنگل کی طرح لگ رہا تھا۔

یہ جھنڈ ۔ ہاں واقعی ۔ اس نے اس کے بارے میں پہلے کیوں نہیں سوچا؟ وہ ادھر ہی سے آیا ہو گا ۔ وہ یقیناً ان بھوتوں میں سے ایک تھا جنہوں نے اس جھنڈ میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ اور اس رات اس سے ملنے آیا ہو گا۔ وہ کانپ گیا بھوتوں کی بستی کے درمیان میں رہنے کے تصور نے اس کا خون خشک کر دیا تھا۔

وہ ایک طرف ہوا۔ باڑ سے پیچھے ہٹا۔ اور پھر گھر میں داخل ہو گیا اگلے لمحے بعد وہ اپنے ہاتھ میں ایک بیگ پکڑے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر آیا۔ اور شہر کی طرف چل پڑا۔ جہاں کی مینار کے اوپر سے کوئی موذن دن کی چوتھی یعنی مغرب کی اذان دے رہا تھا۔ اور اس طرح امارو نے جب اپنی تنہائی کو خیر باد کہا تو اسی لمحے اس کے تمام خوف اور خطرات بھی ہوا ہو گئے تھے۔

بقیہ صفحہ ۸ فرانز کافکا کا جہان

علت کو غیر واضح ثابت کرتا ہے۔ اور یہ تکنیکی اشتراک کچھ کم توجہ طلب نہیں۔

مجمل طور پر، ۱۹۷۰ء کے بعد ہمارے افسانہ نگاروں نے کافکا کو کہیں زیادہ بہتر انداز میں دیکھا اور پرکھا ہے جس کی سب سے بڑی وجہ کافکا کے جملہ کام کا عمومی تاثر یعنی "جبریت کا گہرا احساس" ہے۔ انسانی بیش بندیاں فطرت کے کام میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکیں۔ کافکا کا انسان قہار فطرت سے نبرد آزما ہے۔ اور مزاحم ہونے کی سکت نہیں رکھتا۔ تائید ایزدی سے محروم، تنہا اور ناتواں فرانز کافکا کا جہان۔ ✱



افتخار امام صدیقی

ماں: دنیا اور کائنات

میں نے
دنیا کو
اپنی ماں کی دعاؤں سے باندھ دیا ہے
اب کائنات کا حصول
میرے لیے آسان ہو جائے گا

ایک نظم

میرے لاشعور میں
عمرِ سفر کا
کوئی لمحہ
محفوظ نہیں رہا
سوچتا ہوں تو
روشنی کے تیز لہریئے
ابھرتے ہیں
گم ہو جاتے ہیں
آواز سائے
گونج بنتے ہیں
ٹوٹ جاتے ہیں
کوئی جذبہ
کوئی احساس
باقی نہیں رہا
میں!
شاید اپنے لئے مر چکا ہوں۔

نام نہاد قلم کاروں سے خطاب

کچھ ہی تخلیق کار
خامشی کے مراقبوں کو طویل کرتے ہیں، اور
اپنے حرفوں، لفظوں کے جہاں آباد میں اترتے ہیں
سخن خواب کی تعبیر کے
پیش آمد کو صبر بناتے ہیں
ریاضتوں کے عذاب کو
لمحہ لمحہ کشید کرتے ہیں
فن پارے کی تخلیق کے بعد
اسے اعتکاف میں رکھ دیتے ہیں
اور اپنے نفس کے
خس و خاشاک کو صاف کرتے ہیں
اس طرح اپنی تحریروں سے
اپنا تخلیقی قد ابھارتے ہیں۔
لیکن
بے شمار قلم کار
اپنی شخصیت سے باہر
سماجی تام جھام سے
فن پارہ تلاشتے ہیں
اور
کسی زندگی سے پہلے ہی
مر جاتے ہیں۔

ایک نئی دعا

رکھ دے
میری یادداشت میں
وہ سب کچھ
جو تو نے
کسی کو بھی عطا نہیں کیا
اور وہ بھی
جو تیرے پاس نہیں
مگر!
خالق ہے تو۔

روح کی سچائی کا
تجسس تمام تر
لوحِ محفوظ سے ماورا

مکتوبات

اکتوبر ۹۳ء

★ راقب قریشی — (پتہ ناخواندہ)

ساقی فاروقی اور بلراج کومل کے مضامین خوب ہیں مگر لہجہ کی تلخی سنجیدگی کی راہ کاٹتی محسوس ہوتی ہے۔ جدت (جدیدیت) کا تعلق زمان و مکاں سے نہیں بلکہ افکار و خیالات اور ادراک و احساسات سے ہے۔ اسی لئے میر، غالب اور اقبال ماضی ہی کے نہیں حال و مستقبل کے بھی جدید شعراء ہیں۔ بعض اہل قلم نے مذہب کا مفہوم غلط سمجھا ہے جس کی وجہ سے مذہب کے نام سے ہی نالاں ہونے لگے ہیں۔ حالانکہ مذہب زندگی کے جزو و کل پر محیط ہے۔ زندگی کا مقصود و معنی بھی بعض اہل قلم کے یہاں محدود و مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ کلام اگر شاعری نہیں اس سے بے کراں و وسیع ہے۔ جس کے تعلق سے حدیث شریف میں ہے کہ "قرآن شریف کے عجائب لامحدود ہیں اور اس کی جدت بے نہایت ہے"۔ (لفظ جدت کا استعمال حدیث کے متن میں ہے) ایسی صورت میں شعراء جو تلامیذ الرحمٰن ہیں ان کا کلام الہامی ہے تو پھر اس کلام کو کسی خاص اصطلاح کی وجہ سے محدود و مقید کر دینا کہاں تک درست ہے۔ خیر یہ تو ہم جیسے کم علم لوگوں کے اکابرین ہیں، معاف فرمائیے۔

ہاں اصلاً میں تو یہ خط آپ کے مرتبہ "حرمت" کی وجہ سے لکھنے بیٹھا تھا، سبحان اللہ آپ نے "انہ کان ظلوما جهولا" اور "خلق الله آدم علی صورته" کی عمدہ تفسیر پیش کر دی۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم کو روز افزوں کرے۔ اللھم زد فزد۔

★ علی تنہا — پاکستان ہاؤسنگ کالونی، ... ملتان

میں آپ کا نہایت ممنون ہوں کہ آپ نے سال ۹۳ء کے دوران میں "شاعر" کے متعدد و ضخیم رسائل ارسال فرمائے۔ اور یوں ملتان کے ادبی حلقوں میں بیشتر اہل قلم آپ کے رسالے کے مندرجات سے مستفید ہوتے رہے۔ آپ اردو ادب کی جو خدمت استقامت اور عزم سے کر رہے ہیں وہ ہم سب کے لئے مایۂ افتخار ہے۔ آپ کا معاصر ماہنامہ بہت تاخیر کر رہا ہے۔ خدا کرے آپ اسے جلد مرتب فرمائیں۔ ہم سب یہاں ملتان میں آپ کے اس مجوزہ نمبر کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ اب خدارا اسے مزید موخر نہ فرمائیے۔

★ سعید احمد — شولاپور (مہاراشٹر)

کسی سے ہاں کا حسن، حق گوئی اور بیباکی ہے، دو ٹوک اور بے ساختہ ہے۔ بقول شخصے

کہتے کہتے آپ نے جو کچھ کہا
اچھا کہا، بہتر کہا، اور سچ کہا

سابقہ نشستوں میں آپ کہتے رہے اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ صاف اور واضح نہیں ہے۔ لیکن تازہ شمارے کے "جدیدیت" میں آپ کی زبان سے بے ساختہ حق ادا ہوا ہے۔ مراد مستقیم کی ہدایت مبارک ہو۔ الا۔ اللہ اللہ کیفی کی ہے۔ آپ نے گویا اس کی تفسیر اور ترجمانی بہترین انداز میں کی ہے۔ "میں تمام مذاہب، عقیدوں، نظریوں، فلسفوں اور مادی تحریکوں کا احترام کرتا ہوں--- آدمی کو پہلے آدمی سمجھا جائے۔ جو چیزیں آدمی کو فطری طور پر ایک دوسرے سے فرق کرتی ہیں---- خدا، مذہب اور اخلاق سے آزادی کا تصور ہی دراصل آدمی کو غلام کرتا ہے۔ خدا اور کائنات کے ماضی اور مستقبل کا علم باوجود ہزار دعووں کے کسی کو بھی نہیں۔ انسانی شعور اپنے طور پر صدیوں سے اسی جستجو میں ہے۔ یہاں سے کہیں کا یہ سفر، لیکن کہیں سے یہاں کی طرف--- سفر"۔ اور اختصاصی اقتباس۔ صاف اور سچی باتیں ہیں۔ اسی گفتگو کو جاری رکھیے۔ نہیں سے یہاں میں واقعی امکانات ہیں۔

★ پرویز اختر — تاگ سرسف پاڑہ، بار (یوپی)

"شاعر" کے شمارہ ... میں "مکتوبات" کے تحت جناب اکبر آبادی نے شکیل جمالی کی غزل کا ...

ابھی کچھ دن قیامت اے خدا تمیں

کو خارج از وزن لکھا ہے۔ موصوف اپنی عروض دانی کے شوق میں لفظ "تمیں" کو ٹھیک طرح سے نہیں پڑھ پائے۔ لفظ "تمیں" وتد مجموع نہیں ہے بلکہ سبب خفیف ہے۔ کلاسیکی شعراء نے "تمیں" کو سبب خفیف ہی کے طور پر برتا ہے۔ جدید شعراء میں جون ایلیا اور عرفان صدیقی وغیرہ نے اسی طرح استعمال کیا ہے۔ یہاں مثالیں دینا غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ شاعر کے قارئین صاحب نظر ہیں۔ شکیل جمالی عروض سے واقف ہیں اور ان کے یہاں عروضی خامیوں کا احتمال نہیں۔

★ اکبر حمیدی — ... اسٹریٹ ۲۲، جی ۲/۶، اسلام آباد

آپ کا اداریہ بہت قابل توجہ ہے۔ "شاعر" کو سب نظریات کا مشترکہ فورم بنا کر آپ نے ایک اچھا قدم اٹھایا ہے۔ ادبی رسالے کی یہی شان ہونی چاہئیے ورنہ تو اپنے اپنے ڈربے اور اپنے اپنے مرغے ہو جائیں گے۔ یہ زمانہ لبرل اہل قلم کا ہے کہ تمام نظریات کے بعد دیگرے درست تسلیم ہو چکے ہیں۔ یا پھر اب ایک ایک کر کے غلط کئے جا رہے ہیں۔ انسانی سوچوں پر کوئی قدغن نہیں چاہئیے۔ ایک تخلیق کار کی کمٹمنٹ صرف انسان سے ہونی چاہئیے اور ہر اس انسان سے جو اپنے مسائل کے حساب سے بیشک مقامی ہو مگر اپنے خوابوں اور رشتوں کے حوالے سے جغرافیائی حدود سے بلند و بالا ہو۔ ایک عالمی معاشرہ بڑی تیزی سے وجود میں آرہا ہے۔ شاعر، ادیب، دانشور کو انسانیت کی شیرازہ بندی کے نئے ترانے میں اپنا رول ادا کرنا چاہئیے۔ صرف ایک ہی انسان ہی سیکولر ہو سکتا ہے اور انسانیت کی بھلائی سیکولرازم میں ہے۔

ساقی فاروقی بنام بلراج کومل

تم نے اپنے مضمون نما میں دانستہ طور پر ایک ایسی زیادتی کی ہے کہ میں دل مسوس کر رہ گیا اور میرا کلیجہ کٹ گیا۔ تم نے لکھا "۱۹۶۰ء میں شب خون کے ایک شمارے کے اولین صفحات میں برصغیر کے ایک نامور شاعر نے نثری شاعری میں عورت کے کولہوں کی تعریف کچھ اس قسم کے الفاظ میں کی ہے"۔ اسکے بعد تم نے نثر کے آہنگ سے قطعی ناآشنائی کے سبب غلط سلط میرے فقرے (جنہیں تم مصرعے سمجھے) لکھ دئے ہیں۔ یہ میرے ساتھ بھی زیادتی ہے، نثر کے ساتھ بھی اور نثری شاعری کے ساتھ بھی۔

تم نے سنہ بھی غلط لکھا (سات آٹھ سال پہلے کی تحریر ہے) فقرے بھی غلط لکھے اور یہ بات بھی کہ یہ نظم ہے۔ اس کا حق تو تمہیں شاید ہے کہ تم جنس اور لذت کو ادب نہیں سمجھتے (یہ بات تمہاری روشن خیالی پر داغ ہے کہ یوں تم دنیا کے تمام، اگر تمام نہیں تو ۹۹ فیصد شاعروں، ادیبوں کو قلم کی ایک جنبش سے منسوخ کر رہے ہو)۔ تم نے مجھے "نامور شاعر" لکھا ہے اس کے لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں مگر اس "نامور شاعر" نے ۴۰ برس میں تقریباً ۳۰۰ (تین سو) صفحات نثر کے بھی لکھے ہیں اور ان ۳۰۰ صفحات میں ۲ صفحے جنس اور لذت پر بھی ہیں اور نثر بھی ایسی کہ آج کے سب سے بڑے نثار اور میرے دوست مشتاق احمد یوسفی نے اسے (ان ۲ صفحات کو) پڑھنے کے بعد مجھے فون کیا اور کہا "یار میرے چار صفحے لے لو اور مجھے یہ دو صفحے دیدو"۔ نثر اور نظم کی جمالیات اور آہنگ کو سمجھنے سمجھانے کیلئے میں "شاعر" میں یہ "ترانہ" دوبارہ چھپوا رہا ہوں۔

ایک بالشت کی مدافعت میں

----- وہ اسکی طرف بالشت کئے، مہک میں سچ کے چھوٹے بدن تن دھو رہی تھی-----

"عورت اور مرد کی بالشت یکساں ہوتی ہے" نہیں سلطان حیدر جوش نے یہ فقرہ کیسے لکھ دیا، اس نے دامن کی لذت کھوتے ہوئے سوچا۔ یہ غلط فہمی بالشتہ بالشت

سے ہے۔ دراصل یہ بڑی معنی خیز بات ہے اور نہ مرد کی پشت خاصی سپاٹ ہوتی ہے۔ شانوں سے لے کر کمر تک تو ٹھیک ہے کہ اس میں ریڑھ کی پشت کا سا طنطنہ اور کس بل ہوتا ہے مگر کولہے غیر منحنی اور ناتراشیدہ ہوتے ہیں اور کسی عمر رسیدہ کولہو کے بیل کے کچلے دھڑ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یعنی وہ حصہ جو "قلب" سے جدا "میسرہ — میمنہ" کرتا رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں عورت کے کولہے، کمر سے اوج کا عروج دکھا کر ایک حشر سامان انداز میں دو آدھے چاند بناتے ہوئے فرازوں سے نشیب کی طرف ہجرت کرتے ہیں، جلالی دریاؤں کی طرح اوپر بہہ کر راہوں کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر ٹھہر جاتے ہیں۔ مرد کے کولہوں کی زمین قحط زدہ اور پتھریلی ہوتی ہے، عورت کے کولہوں کا خمیر زرخیز مٹی سے اٹھتا ہوا معلوم پڑتا ہے۔ ان کا ایک اپنا مزاج، ایک اپنی شخصیت ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ آدمی نے پتھروں کے رگڑنے سے آگ پیدا کی، میرا اندازہ یہ ہے کہ پہلا شعلہ اسی چقماق سے نکلا ہوگا۔ پھر ہر وصال کے بعد مرد کے کولہے اندر کی طرف دھنستے جاتے ہیں مگر عورت کے کولہوں میں رس بھرتا جاتا ہے اور گولائیوں میں ایک ساحرانہ دلکشی آتی جاتی ہے۔ ایک عورت کی پشت دیکھ کر آسانی سے قیاس آرائی کی جا سکتی ہے کہ اس کے پیچھے کتنے وصالوں کا عمل دخل رہا ہوگا۔ --- وہ اس کی طرف پشت کئے، سنک میں صبح کے جھوٹے برتن دھو رہی تھی ---

نومبر دسمبر ۹۴ء

★ عبدالقوی ضیاء — 961 AUGER AVE SUDBURY ONTARIO CANADA P3A 4A7

شاعر کا مشترکہ شمارہ، "پروین شاکر: اردو شاعری کا ماہ تمام غروب ہوگیا" کی سرخی لئے ہوئے موصول ہوا۔ آپ کا مضمون "خوشبو کے پیکر نے کیا راستہ کہاں" بصورت اداریہ، پروین شاکر کے تعلق سے کئی بے نام منزلوں کا سراغ دیتا ہے۔ آپ کے قلم کے اعجاز کی نشاندہی بھی کر دیتا ہے اور مرحومہ کی شخصیت اور شاعری کے بہت سے پہلو اجاگر کرتا ہے۔ مضمون مختصر ہونے کے باوجود گہرے تاثرات، قارئین کے دل و دماغ پر مرتسم کرتا ہے۔ آپ کی چند بے ترتیب سوچ سطریں، بہت ہی گہری سوچ کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور اپنے اندر کتنی ہی داستانیں سمیٹے ہوئے ہیں۔ باقی مضامین دوسرے ماخذ سے ماخوذ ہیں اور نظر سے گزر چکے ہیں۔ البتہ آپ سے ایک شکایت ہے کہ اس دوران ہم سے بہت سے عالی قدر شعراء و ادباء جدا ہو گئے، ان کے لئے آپ نے اظہار تعزیت کیا اور نہ ہی ان کو شاعر کے کسی گوشے میں جگہ دی۔ ڈاکٹر ظ انصاری، [illegible] صدیقی، ظہیر کاشمیری، محشر بدایونی، احمد داؤد، محمد صلاح الدین وغیرہم۔ ان مرحومین کی ادبی خدمات کو یاد رکھنے کے لئے ادارہ شاعر کچھ کر سکتا ہے کہ نہیں؟ (شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر میں "وفیات" کا ایک باب خصوصیت سے دیا جا رہا ہے۔ اس میں مرحوم شعراء و ادباء کو خراج عقیدت پیش کیا جائے گا۔ ادارہ)

★ ستیہ پال آنند — 13003 NEW AUSTIN CT HERNDON, VA 22071 USA

شاعر کے تازہ شمارے میں جوانمرگ شاعرہ پروین شاکر کا گوشہ شائع کر کے آپ نے اردو دنیا پر تو احسان کیا ہی، مجھ پر ذاتی طور پر بہت احسان کیا۔ ایک مختصر سی ملاقات کے بعد ہم دونوں برسوں تک خط و کتابت کے اس سلسلے کی زنجیر میں بندھے رہے ہیں جس میں بہت کم لوگ اس شدت سے بندھے ہیں کہ ایک ماہ میں دو یا تین خطوں کا تبادلہ ہو۔ یہ اس بات کے باوجود کہ میں خود سلسلۂ خط و کتابت میں تنگ دست گرفتہ واقع ہوا ہوں اور پروین شاکر کے بارے میں احباب کو عام شکایت تھی کہ خطوں کا جواب ان پر واجب الادا ہوتا ہے۔ عادہ حسین کا [illegible] میں پہلے پڑھ چکا تھا، لیکن آپ کا سیاہ حاشیہ مضمون اور سردار جعفری کی سیاہ حاشیہ نظم (دونوں کے گرد گہرا سیاہ حاشیہ ہونا چاہئے تھا) بہت گہری سوچ میں ڈوب کر لکھی ہوئی ہیں۔ میرے آنسو رک نہیں پائے۔

★ مقصود الٰہی شیخ — RAVI HOUSE UNIT 61 LEUTRANS LANE BRADFORD BD7 1NS

شاعر کے نئے شمارے کا سرورق دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ آپ نے سرورق کے لئے پروین شاکر کی موزوں ترین اور خوبصورت ترین تصویر چنی۔ کمپوزیشن ایسا لگا کہ سیدھا دل میں اتر گیا۔ میں اتنا مدہوش اور جذباتی سرخوشی ہوا کہ فوراً خط لکھنا چاہتا تھا، مگر یہاں وقت پر کسی کو اختیار نہیں۔ پروین شاکر پر ماتمی مضامین تو بہت چھپے ہیں مگر اکثر کی نوعیت صحافیانہ یعنی اخباری ہے۔ آپ نے مرحومہ کی ایسی تصویر، سرورق پر ایسے کمپوزیشن کے ساتھ۔ ان کی شخصیت و فن پر ایک حد تک ایسے مضامین جو اچھے ہیں اور ساتھ کلام ایسا منتخب کر کے چھاپا ہے کہ شاعر کی یہ اشاعت ایک سکہ بن گئی ہے۔ پروین شاکر پر آپ کی COLECTION بہت سے گوشوں پر بھاری ہے۔ وہ شاعری ایسی تھی۔ یہاں کے ماتمی جلسے میں میں نے کہا تھا کہ ہمارے یہاں عورتوں کو معتوب سوئی اور الگ سی شے سمجھا جاتا ہے۔ احترام بھی ایسا کیا جاتا ہے جس میں توہین مستور ہوتی ہے، وہی عورت کو کمتر جاننے والی ذہنیت۔ ادب میں بھی عورتوں کا صفحہ الگ۔ پروین ان معنوں میں روایتی شاعرہ ہرگز نہیں تھی بلکہ مکمل اور بھرپور شاعر تھی وہ۔ مرد شاعر، جیسا کہ ہمارے ادب میں دوسرے شاعر ہیں۔ وہ فنی اور فکری سطح پر، سماجی سطح پر، سرحدی سطح پر اور تو اور، محبت کے میدان میں مردانہ وار اتری۔ برسرپیکار رہی اور فاتح بنی۔ اس کا تذکرہ ہمیشہ شاعروں میں آئے گا، شاعرات میں نہیں۔ اس کی موت پر یہ بات سوجھی تو میں نے راوی میں عورتوں کا صفحہ بند کر دیا۔ ادب میں امتیاز کیسا؟ خواتین شعر لکھتی ہیں، افسانے لکھتی ہیں، وہ سب کام کرتی ہیں جو مرد حضرات مدت سے کر رہے ہیں۔ پھر خانہ خانہ تقسیم کیسی؟ کیوں روا رکھی جاتی ہے؟ رہ گئی خانہ داری تو جناب اب یہاں کا چلن یہ ہے کہ کھانا پکانا، برتن دھونا، شاپنگ کرنا، کپڑے دھونا، بچوں کا دودھ پلانا مرد بھی کرتے ہیں، عورتیں ہی نہیں۔ ان دنوں مرد بھی سنگل پیرنٹ ہوتے ہیں تو اسی EQUELITY کے زمانے میں ہمارا اردو ادب، عورتوں کا صفحہ الگ رکھے ہوئے ہے۔ اب تو لکھنے والی خواتین کے ساتھ DISCRIMINATION بند ہو کر ROUTINE DISCRIMINATION ختم ہونا چاہئے تاکہ مکمل ہم آہنگی ہو سکے۔ الگ خانہ نہیں، ایک ہی خانے میں۔

★ شمس بدایونی — [illegible] بریلی

پروین شاکر پر شاعر کی پیشکش بروقت اور برمحل بھی ہے اور ترتیب و تہذیب، مواد و معلومات کے لحاظ سے ایک خاص معنویت کی حامل بھی۔ آپ کا اداریہ مجھے خاص طور پر پسند آیا۔ تنقیدی بصیرت و بصارت اس میں صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ آپ کا یہ خیال صحیح ہے کہ "شاعرات اردو کو کبھی معتبر نہیں سمجھا گیا، لیکن یہ درست نہیں کہ اردو شعری تذکروں میں شاعرات کا ذکر بہت معمولی سا ہے"۔ اردو میں شاعرات کے مستقل تذکرے ہیں، جو تذکرے میری معلومات میں ہیں وہ یہ ہیں۔

بہارستان ناز۔ سال تصنیف ۱۲۸۱ھ
شمیم سخن حصہ دوم ۱۲۸۹ھ
گلشن ناز و فارسی شاعرات۔ ۱۳۰۳ھ
چمن انداز ریختہ گو شاعرات۔ ۱۳۴۳ھ
اختر جلیل یادگار خیال۔ ۱۲۹۹ھ

حقیقت یہ ہے کہ شاعرات کی تلاش و تحقیق ہی ابھی مکمل نہیں ہوئی اور ان کی اکثریت ناقدوں کی توجہ کی بھی مستحق نہ بن سکیں۔ زمانہ قدیم کی شاعرات یا تو پردہ نشین خواتین تھیں جو اپنے نام اور کلام کا اخفا چاہتی تھیں۔ یا زنان بازار میں جن کی رسائی ادبی محفلوں میں نہ تھی لیکن پھر بھی اردو میں ان شاعرات کے کلام کا خاصا ذخیرہ محفوظ ہے۔ مطبوعہ

ادا جن کی تمنا ادا کی تھی ہے۔ بیسویں صدی میں جدید تعلیم نے عورت کو مرد کے شانہ بشانہ چلنے اور اظہار خیال کرنے کا موقع دیا۔ اور اس طرح ادا جعفری سے پروین شاکر تک متعدد نام نظر آنے لگے۔

آپ میں تنقیدی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے سب سے اہم بات جو میں آپ کی تحریروں میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ جدید بلکہ جدید تر ہوتے ہوئے بھی روایت سے رشتہ استوار رکھے ہوئے ہیں۔ جو بات کہتے ہیں ہمارے جذبی شعور اور روایتی پس منظر میں کہتے ہیں۔ آپ مستقل مضامین کیوں نہیں لکھتے۔ اس دور میں ایسی لکھی ہوئی تحریروں کی اشد ضرورت ہے جو ادب اور ادبی موضوعات کو ادبی و تہذیبی شعور کے ساتھ دیکھیں اور لکھیں۔ پروین شاکر میری پسندیدہ شاعرہ تھیں، مجھے بھی ان کی ناگہاں موت کا صدمہ ہوا۔ ان کی شاعری نے ہمارے ادب کو عورت کے حقیقی جذبات سے متعارف کرایا ہے۔ علی سردار جعفری کی نظم بہت پسند آئی۔ شاید اس سے زیادہ تحسین اور مرثیہ بھی نہیں ہو سکتا۔ دیگر شاعرات کے کلام کو شامل کر کے موجودہ شاعرات کے شعری اسلوب کو سمجھنے کا بھی آپ نے موقع فراہم کر دیا ہے۔

★ شرون کمار ورما ——— [illegible] امرتسر (پنجاب)

پروین شاکر کی کار حادثہ میں موت کی خبر پاکستان ٹی وی پر سنی تو عجیب سی گہری اداسی کا احساس ہوا تھا۔ ایک ہمارا غم وقت سے بہت پہلے ہو گیا۔

اپنے انجام تک آ گئی زندگی
یہ کہانی مگر ادھوری رہی

پروین شاکر کی غزلوں میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ترنت شور مچانے، اچھی طرز کہانی ہے۔ "دوزخ" کی شیطان تو خوبصورت ہے، کلائمکس پر پہنچ کر بھٹک گئی۔ شمارہ ۲۰ میں محترمہ جبین قیصر کی کہانی "سندور" کئی جھٹکے دیتی ہے۔ ریلوے اسٹیشن کا اسٹیشن ماسٹر تو ایک ہی ہوتا ہے۔ دوسرا اسسٹنٹ ہو سکتا ہے۔ امرتسر ریلوے اسٹیشن کا جغرافیہ غلط بیان ہوا ہے۔ امرتسر اسٹیشن پر مرنے لگے میں شاکر سامان نہیں لیا جاتا۔ اسٹال ہیں، بھی جلی رنگ چہل ہیں، "بادام" کے تھیلے ڈھاک وغیرہ کے پتوں کے دونے بنائے جاتے ہیں۔ کلکتہ جانے والی گاڑی صبح نہیں شام اور ساڑھے رات کو امرتسر سے روانہ ہوتی ہے۔ ہاوڑہ میل اور ڈیلی کرشنا ہاوڑہ ایکسپریس صبح کو دلی کے لئے ضرور چلتی ہیں۔ اب سب سے زوردار جھٹکا سیندور کی ڈبیہ دیتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمان عورتیں خاص طور پر پاکستان میں بالکل سیندور نہیں لگاتیں۔ پرتیں کیا سوچ کر سیندور کی ڈبیہ لے آیا، اور کوئی تحفہ کیوں نہیں۔ جدید کا یہ کہنا کہ پرتیں اپنے ہاتھ سے ہما کی مانگ بھر دو، ممکن ہی نہیں۔ عورت کی مانگ میں سیندور شوہر بھرتا ہے کوئی غیر نہیں۔ اتنا تو سب جانتے ہیں۔ اگر جدید سے غلطی ہوئی تو پرتیں کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ کہانی دوستی، محبت، اخوت کے جذبہ کا اظہار کرنے کے باوجود کمزور رہی ہے۔

★ اندر پال تیر ——— ۵-اے، سول لائنز، [illegible] (پنجاب)

شاعر کا شمارہ نمبر ۷ میرے سامنے ہے۔ افتخار امام نے پروین شاکر کو بڑا بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ صحیح معنوں میں وہ اسی کی حقدار تھی ہے۔ پروین کی شاعری جوانوں کو متاثر کرتی ہی کرتی ہے بزرگوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ انہوں نے عورت کے احساسات کا بڑے ہی جرأت مندانہ طریقے سے اظہار کیا ہے لیکن بے حیائی، بے حجابی اور فحاشی کا اسکی شاعری میں شائبہ تک نہیں۔ شاعری میں یہ کام بڑا مشکل ہے۔ رومانی شاعری میں جنس، لمس، خواب، بے خوابی، انتظار، بے قراری، سراپا کا اظہار تو ہے ہی مگر پروین شاکر ان کا اظہار بڑے خوبصورت اور متوازن ڈھنگ سے کرتی ہے۔ وہ اپنی ہم عصر دو تین پاکستانی شاعرات کی طرح عورت کو بے لباس نہیں کرتی سی تھے اسکی خوشبو عرب سے کنار بن گئی اور بقول افتخار امام یہ لفظ تو اسی کا ہو کر رہ گیا ہے۔

پروین اپنے آپ میں ایک انجمن، ایک LEGEND تھی۔ جو شہرت، چاہت، محبت اسے حاصل ہوئی وہ بہت ہی کم شعراء کے حصہ میں آئی ہے۔ پروین نے میدان شاعری میں اس وقت قدم رکھا جب سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، فیض، احمد فراز، ادا جعفری اور دیگر استاد فن کی دل گرفت اور مسحور کن آوازیں دلوں کو مسحور کر رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ توانا اور چونکا دینے والی آواز ہی اپنی پہچان بنا سکتی تھی۔ افتخار نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ پروین شاکر نے اپنا منفرد لہجہ دریافت کر لیا تھا۔ کلام میں شگفتگی، جدت، ندرت اور وضاحت سلیقے جانے کے اجالے کی مرہون منت نہیں ہو سکتی۔ اسی سلسلے میں گروہ بندی کے نقادوں کو کون پوچھتا ہے۔ بڑی بدقسمتی ہے کہ کوری آنکھوں میں خواب سجانے والی، منجمد نسوانی زندگی کو متحرک کرنے والی، نئی نئی اصطلاحوں، تشبیہوں اور بشارتوں سے شاعری کو حسن دوام عطا کرنے والی پروین خلاؤں میں کھو گئی۔ افسوس صد افسوس کہ گلستان ادب کی بلبل ہزار داستاں یوں اچانک ابدی نیند سو گئی۔ اسکا جانا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

اس شمارے کو فاطمہ حسن، پانچال، نسیم سید، عذرا پروین، شاہدہ حسن، زہرہ نگاہ اور تبسم شکیل نے اپنی شعری تخلیقات سے جگمگا دیا ہے۔ روانی اور سلاست کے ساتھ ساتھ انکی فکر بھی شعر میں آگئی ہیں۔ اس خوش نما گلدستے میں شامل منتی کی غیر حاضری کھٹکتی ہے۔ کم از کم میرا یہ بھرم جاتا رہا ہے کہ میدان شاعری کے شہسوار صرف مرد شعراء ہی ہیں۔ میرا یہ یقین ہے کہ شعری ادب کا مستقبل شاعرات کے ہاتھوں میں نہ صرف محفوظ ہی ہے بلکہ تابناک بھی۔

★ بلراج کومل ——— ای-[illegible]، نئی دہلی-۹

شاعر کا نیا مشترکہ شمارہ میں نے بغور پڑھا۔ پروین شاکر کے بارے میں آپ کا نوٹ اور کلام کا انتخاب ہم سب کو ان کی زندگی اور ان کی غیر متوقع بے وقت ہلاکت موت میں جذباتی طور پر شامل کر لیتا ہے۔ میں مرحومہ سے کبھی ملا تو نہیں لیکن ان کے کو بے حد پسند کرتا تھا اور پاکستانی دوستوں اور یہاں کے دوستوں کے ساتھ اکثر ان کا ذکر کرتا تھا۔ حال ہی میں کشور ناہید دلی آئیں تو ہم لوگ دیر تک پروین شاکر کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

★ قمر قدیر ارم ——— قمر منزل، [illegible] (یو پی)

پروین شاکر کی اچانک موت کی خبر اخبار میں پڑھی تو بے ساختہ ڈاکٹر صدر الصدی کا یہ شعر زبان پر آ گیا۔

فنا کا رنگ نہ تھا کوئی میرے جوہر میں
یہ کون آ کے قضا لکھ گیا مقدر میں

اس سانحے پر اخبارات میں کئی مضامین نظر سے گزرے لیکن نہ جانے کیوں کسی بھی مضمون میں جذبات کی وہ آنچ محسوس نہیں ہوئی جو اس شاعرہ کے لئے سچا اظہار عقیدت بن جاتی، جو دل میں گداز پیدا کر دیتی، تڑپا کر رکھ دیتی۔ یہ بات آپ کے اداریے میں البتہ موجود ہے۔ "خوشبو کے پر کتر کے گیا راستہ کہاں" عنوان ہی خون کے آنسو رلانے کے لئے کافی ہے۔ آپ کی تحریر کا حرف حرف غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں سے یوں نکلا ہے کہ درد کے چراغ لو دینے لگتے ہیں۔ غم کی اس بزم میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ آپ کی تحریر نے ایک عجیب رونق بھر دی ہے۔ اس شکست خواب سے ایک دیدہ بیدار تک جو منظر آپ لے جاتے ہیں وہ سکون بخشتے ہیں۔

★ عبدالرحیم نشتر ——— [illegible] ضلع [illegible]

شاعر کا ہر شمارہ ایک قدرت کے ساتھ آ رہا ہے۔ شمارہ نمبر ۱۱ اور ۱۲ بھی اسی طرح بے مثال ہے۔ اردو شاعری کے ماہ تمام کے غروب پر آپ نے جو خراج عقیدت پیش کیا ہے

وہ نئے ماہ تمام کے طلوع کی امید سے خالی نہیں۔ نذر پروین شاکر کے تحت آپ نے جن خواتین کی تخلیقات کو پیش کیا ہے وہ بجائے خود بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ شمارہ ایک دستاویز کی اہمیت کا حامل ہے۔

★ رفعت اختر — سول لائن، گمیر کھتان، ٹونک

تبھی یہاں شاعر مسلسل وقت پر چھپ رہا ہے۔ ساتھ ہی شاعر کے قارئین میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ پروین شاکر پر ہندوستان میں شاید پہلی بار آپ نے گوشہ شامل کرکے نذرانہ پیش کیا ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب میں یہ ایک فیشن سا ہو گیا ہے کہ نوعمر خواتین تخلیق کاروں کو وقت سے کامہان بنا دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں پروین شاکر کی بے وقت موت پر افسوس کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)۔ اکثر رسائل و جرائد میں مرحومہ سے متعلق تحریریں چھپ رہی ہیں اور شاید چند سال بعد بھلا دی جائیں گی۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر پروین شاکر طلاق شدہ نہ ہوتیں تو انہیں کوئی نہیں جانتا ہوتا، ان کی شاعری کہ ملمع پردہ کوئی جوہر ضرور ہے۔ انڈو پاک میں خصوصاً اردو کے ایسے ان گنت تخلیق کار ہیں جو جیتے جی مرے ہوئے ہیں کیونکہ وہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں۔ نوجوان خاتون نہیں، لیکن ایسے تخلیق کاروں کے شاگرد اعلیٰ عہدوں پر رہیں اور معیاری تخلیق کار نے ہوتے ہیں۔ کبھی اس موضوع پر بھی سوچئے!۔ یہ بھائی احمد ہمیش کو کیا ہو گیا کہ اپنے آپ کو محض "تشکیل" تک محدود کر لیا۔ بیند شب خون اور شاعر میں ان کے تکلیف دہ تقریباً یکساں خطوط پڑھے۔ شب خون میں شامل خط میں وہ لکھتے ہیں کہ شب خون کے علاوہ ہندوستان کے کسی رسالے کو وہ نہیں گرداتے۔ دوسری طرف شاعر میں بھی تقریباً اسی مفہوم کا خط چھپا ہے جو شب خون میں ہے۔ شاید شاعر کا نیا شمارہ پڑھ کر وہ اور ناراض ہوں گے کہ ان کی مطبوعہ تخلیقات جو پاکستان میں چھپتی ہیں انہیں ہندوستان کے رسائل اس لئے چھاپتے ہیں کہ ہندوستان کے قارئین بھی پڑھ سکیں۔ جبکہ آپ نے پروین شاکر پر جو تحریریں شامل کی ہیں بقول آپ کے پاکستان کے دو ادبی رسائل سے حاصل کی ہوئی ہیں۔

★ یعقوب تصور — پوسٹ بکس نمبر ٢٣٨، دہلی

زیر نظر شمارہ ١١-١٢ حسب سابق صفحۂ اول "فکر امروز" سے، مکتوبات تک روایتی توانائیوں کا مظہر ہے۔ خصوصاً سارے حصے یعنی نذر پروین شاکر میں آپ نے وقت کی کمی اور صفحات کی قلت کے باوجود ایک پر تاثر اور بھرپور انداز اختیار کیا ہے اور آپ نے حق ادا کر دیا۔ پروین شاکر کے بارے میں مضامین اور ان کی منتخب غزلوں اور نظموں نے اس شمارے کو ایک دستاویز کی شکل دے دی ہے، جو بوقت ضرورت حوالے کے طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔ "خوشبو کے پر کتر کے گیا راستہ کہاں" میں آپ نے پروین شاکر کا بہت پر اثر تعارف دوسری مشہور شاعرات سے موازنے کے ساتھ کیا ہے۔ محترم علی سردار جعفری کی نظم "پروین شاکر" بہت خوبصورت اور متاثر کن ہے۔ اسی شمارے کا باقی حصہ نسواں بھی پیش کش کا خوبصورت زاویہ ہے اور یوں آپ نے تمام اچھی شاعرات کے دلکش کلام کو قوس قزح کے انداز میں شاعر کے صفحات پر بکھیر دیا ہے۔ رہی سہی کسر دھنک رنگ نے پوری کر دی۔

★ فصیح اکمل — لیٹ سبرٹی، ١٣ مالی، ٹونک کولی واڑہ، دوستی

شمارہ نمبر ١١ میں بہت دن کے بعد تحی مشتاق مومن کی تحریر "ترنت شور مچائیے" پڑھی، جی خوش ہوا، ان کی تحریر میں جو شگفتگی اور شائستگی ہے وہ منفرد ہے۔ ابن اسماعیل (یہ املا شاید رشید حسن خاں کی سفارش کا مرہون ہے۔ ورنہ اسماعیل ہی اب تک لکھا اور پڑھا گیا ہے) کا "دوزخ" بھی فرحت بخش ثابت ہوا، مبارکباد۔ شمارہ نمبر ١٢ میں "پروین شاکر" (میں مرحومہ نہیں لکھوں گا) کو مناسب انداز میں خراج محبت و اعتراف پیش کیا گیا ہے۔ لیکن علی سردار جعفری ایک ہی تخلیق کئی رسالوں میں بیک وقت شائع کرا کے بھی مطمئن نہیں ہوتے، نظم کا ملمع منظر جس عظمت کا اظہار کرتا ہے نظم اس تاثر سے خالی ہے۔ خالدہ حسین کا مضمون "سمیع کی گویا" متاثر کرتا ہے اور اس کے ساتھ آپ نے جو پروین شاکر کی غزلوں کا انتخاب شائع کیا ہے وہ اس تاثر کو اور افزوں کرتا ہے۔ نظمیں بھی آپ کے حسن انتخاب کی ضامن ہیں اور پھر اس شمارہ کو حلقۂ نسواں کی تخلیقات کیلئے مخصوص کر دینا بھی آپ کی ادا ہی ہے۔

★ سید اختر ان رستوگی — بیر وبلڈی، گوہاٹی (آسام)

شاعر کا مشترکہ شمارہ، سابقہ شماروں کی طرح معیاری ادبیاتی مزاج و آہنگ کا آئینہ دار ہے۔ شاعر اب اردو ادب کے بہترین محرکات و بصیرتیں بہم پہنچاتا ہے۔ شمارہ نمبر ١١ کی منظومات اچھی ہیں مگر بدر عالم خلش کی تحریر موجودہ ادبی صورت حال، پریشاں خیالی میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ شمارہ نمبر ١٢ میں مرحومہ پروین شاکر کے احوال و کوائف سے چند غزلوں اور نظموں کی پیش کش قابل داد ہے۔

یہ حصہ تحقیقی نقطۂ نظر سے بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ پروین شاکر کے متعلق آپ کا تعزیتی اداریہ اور دونوں مضامین بہت خوب ہیں۔

★ پیر محمد چندر کوشک — ٢٣٩١ اندرا نگر، اڈیالا، رعنایہ

گوشہ پروین شاکر میں مہ جبیں قیصر کا افسانہ "سیندور" پڑھا۔ بہت دلچسپ، موثر اور اپنے آپ میں ایک تحریکی جذبہ لئے ہوئے ہے جو کہ ہند و پاک کے عوام کی قربت اور خیرسگالی کے جذبے سے پر ہے۔ جس فنی چابکدستی سے انہوں نے دونوں ملکوں کی تہذیب اور تمدن کے بارے میں ذکر کیا ہے وہ دونوں طرف کی عوام کے لئے بہت ہی خوش کن ہے۔ برائے مہربانی انہیں میری طرف سے مبارکباد دیجئے۔

★ شعور آشنا — ١٣٣ معلہ محلہ، مدارس، مہاراشٹر، (بھیونڈی)

میں مسلسل شاعر کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو اپنی تخلیقات کو شاعر کے آئینے میں سنوارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اردو کا طالب علم اور ایک نو مشق شاعر ہوں۔ مشترکہ شمارے میں نذر پروین شاکر والا گوشہ بے حد پسند آیا۔ خواتین کی شاعری اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کہانیوں میں مہ جبیں قیصر کی کہانی "سیندور" نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ مکتوبات میں ساجد رشید کا خط بہت سارے حقائق لئے ہوئے ہے۔

★ رئیس الدین رئیس — ٥٢٥ اسماعیلی گیٹ

شاعر کا مشترکہ شمارہ ١١-١٢ مل چکا ہے جس میں دوسرا شمارہ پروین شاکر کی نذر کیا ہے۔ میرے خیال سے اس سے بڑھ کر اور کیا خراج عقیدت ہوگا آپ نے حق ادا کر دیا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ پورا شمارہ خواتین قلمکار کی تخلیقات سے مزین ہے۔ یہاں بھی آپ کا ترتیب و انتخاب لاجواب ہے۔

بیانِ ملکیت اور دیگر تفصیلات شاعر بمبئی

(مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ٨)

مقام اشاعت	بمبئی
پرنٹر و پبلشر	ناظر نعمان صدیقی
پتہ	دیناتھ بلڈنگ تیسرا اسٹریٹ نالا سوپارہ بمبئی
ایڈیٹر	افتخار امام صدیقی
پتہ	دیناتھ بلڈنگ تیسرا اسٹریٹ نالا سوپارہ بمبئی
وقفۂ اشاعت	ماہنامہ
قومیت	ہندوستانی
ملکیت	ناظر نعمان صدیقی
قومیت	ہندوستانی

میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط ناظر نعمان صدیقی ٢٨ فروری

اعلان

نسیم ہاشمی کا سنگھار دان ان پر جموبن نے لوٹا۔

شموئل احمد کا سنگھار دان کس نے لوٹا......؟

میں نے شاھد انور کو ان کی درخواست پر اپنی مشہورِ آفاق کہانی "سنگھار دان" کو ڈرامے کے قالب میں ڈھالنے کی تحریری اجازت اس شرط پر دی تھی۔ کہ عنوان کے نیچے یہ عبارت تحریر ہوگی۔ کہ ڈرامہ شموئل احمد کی کہانی "سنگھار دان" پر مبنی ہے ڈرامہ سنگھار دان اردو اکادمی نئی دہلی کے ڈرامہ فیسٹول میں شامل ہوا۔ لیکن اجازت نامے کی بنیادی شرط کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہاں تک کہ ناظرین کو دعوت نامے تقسیم ہوئے اور ڈرامے پر جو تبصرے مختلف جرائد میں شامل ہوئے۔ اس میں یہ تحریر نہیں ملتی کہ ڈرامہ شموئل احمد کی کہانی پر مبنی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہد انور نے ڈرامے کی کہانی کو اپنی کہانی بتایا ہے۔ اور اکاڈمی سے رائلٹی کی بھاری رقم وصول کی ہے۔ اگر ایسا ہے تو شاہد انور قانونی گرفت میں آجاتے ہیں۔

میں شموئل احمد جناب شاھد انور کو آگاہ کرتا ہوں کہ وہ ڈرامے سنگھار دان کو کسی جریدے میں شائع کرانے یا آئندہ کسی بھی ادارے سے اس کو اسٹیج کرانے کی غلطی نہیں کریں۔ ورنہ ان کے خلاف سخت قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

رابطہ

شموئل احمد ۱۰۴ گرینڈ اپارٹمنٹ، نئی پاٹلی پتر کالونی پٹنہ ۱۳

فون نمبر — ۲۶۱۰۴۵ - ۰۶۱۲



مشہور شکاری اور ممتاز ادیب و شاعر



کا

دلکش مجموعہ کلام

فکر و فن اور علم و دانش کا حسین مرقع



ریشۂ حنا

ضخامت ◆ ۲۶۴ صفحات
قیمت ◆ ۱۵۰ روپے

رابطہ

لالہ زار اکاڈمی، ۱۶۱ - ڈی - ۳ جناح کالونی
مسلم روڈ، سمن آباد، لاہور (پاکستان)

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۶واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد — ۶۶
شمارہ — ۶

فون: ۳۸۲۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۷ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے — لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تاعمر خریداری ۳۰۰۰ روپے — معاونین سے ۱۵۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

فکرِ امروز

میں (اب) شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں۔ میں شاعری میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اس کے متعلقات ہوں یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع : حسنِ محض اور عشقِ محض ہے اور تمام ضمائر کا مرجع وہ ذات ہے جو حاملِ حسن اور مرکزِ محبت ہو۔ جس طرح علم، شاعری کے لئے ضروری دلائل ہے۔ اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی میں لازم و ملزوم سمجھتا ہوں اور خیالات میں تصنع یا جھوٹ کا حامی نہیں۔ میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں اور حقیقی وارداتِ قلب کی ترجمانی میرا مسلکِ بیان ہے۔ گو مجھے تمام اصنافِ سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے مگر میں نظم، غزل اور رباعی کو اظہارِ خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے۔ میں شعر میں بلند خیال کے ساتھ بلند الفاظ کا موید ہوں۔ ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنھیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔ میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعراء، غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔

[شعر الحیات، کلیم عجم — ۱۹۳۶ء]

سیماب اکبرآبادی

شاعر

ہم عصر اردو ادب نمبر

[دو جلدوں میں]

اردو شعر و ادب کا ایک خوب سیرت عالمی گاؤں
۲۱ ویں صدی کے نام

*

تعمیر و تشکیل کے ناتمام منظر نامے

بابِ افسانہ

- ۵۰ سے زائد مشاہیر اور تازہ کار افسانہ نگاروں کے غیر مطبوعہ افسانے
- عظیم افسانہ نگاروں سے منسوب ذیلی ابواب
- ہر باب کی ابتدا ایک زندہ شاہکار کہانی سے
- معاصر اردو کہانی پر لکھی گئی اہم تنقیدی کتابوں کے حوالے، تجزیے اقتباسات
- اردو افسانہ: داستان سے کہانی تک (تجزیہ)

١٩٩٠ء کے بعد کی کہانی پر مذاکرہ
ایک بہت مختلف و منفرد ادبی مذاکرہ جس میں ۲۰ سے زائد نئے افسانہ نگاروں، افسانوں کے نئے نقادوں اور افسانے کے قارئین نے اردو افسانے پر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے۔

اس کے علاوہ افسانے پر بہت کچھ

بابِ شاعری

- ہم عصر عالمی اردو شاعری کا ضخیم ترین انتخاب (غیر مطبوعہ)
- نئی نسل کے شعرا (۱۹۸۰ء کے بعد)
- مرحوم شعرا [۱۹۹۰ء کے بعد]
- نووار دانِ شاعری [شاعری کی درافت]
- بزرگ شعرا (کلاسیکی روایت کے امین)
- مختلف شعری اصناف۔ شعری تجربے
- ذیلی ابواب۔ شاعری کی اہم کتابوں کے تجزیے، تبصرے، حوالے اقتباسات۔ ادبی شذرات ان کے علاوہ بھی بہت کچھ

بابِ مقالات

شاعری، افسانہ، ڈراما، ناول، تنقید، تخلیق، سوانح، طنز و مزاح فنونِ لطیفہ۔ اور کئی اہم موضوعات پر فکر انگیز مضامین۔

۵۰ سے زائد ناقدینِ ادب نے ہم عصر اردو ادب کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا ہے۔

بابِ طنز و مزاح، انشائیہ

طنز و مزاح اور انشائیہ کے نامور قلم کاروں کی تازہ تحریریں۔ تازہ کار قلم کار۔ معاصر طنز و مزاح اور انشائیہ کی صورتِ حال۔ کتابیں، تجزیے اقتباسات

بابِ ڈراما

نادر ڈراما نگاروں کے ساتھ نئے ڈراما نگاروں کے جدید ڈرامے، اردو ڈراما، اردو تھیٹر، ہندوستان میں تھیٹر ڈرامے پر ایک بھرپور باب۔

بابِ ناول۔ ناولٹ

کئی مکمل ناولٹ اور نئے قلم کاروں کے زیرِ قلم ناولوں کے ابواب۔ معاصر اردو ناول پر معلوماتی تنقیدی شذرات

بابِ سفرنامہ

سفرناموں سے متعلق ایک بھرپور باب نئے سفرناموں سے دلچسپ اقتباسات۔

مکالمہ ۔ مصاحبہ

کئی اہم اور مشاہیر قلم کاروں سے دلچسپ مکالمے اور مصاحبے ۔ مرحومین کے غیر مطبوعہ انٹرویوز

گوشے

- توقیتِ میر اور میر پر تحقیقی لوازمہ
- توقیتِ سیماب اور سیمابیات
- مختار صدیقی خطوط اور شعری انتخاب
- اعجاز صدیقی ۔ ایک مطالعہ
- ژاک دریدا ۔ ایک مکمل مطالعہ

اور کئی اہم نام

اردو کی نئی بستیاں

اردو کی نئی بستیوں کے شعر و ادب پر تازہ ترین مضامین ، جائزے ، معلوماتی نوٹس ۔ اور بہت کچھ

بازیافت

قدیم و نایاب اہم کتابوں کے عکس اور تحقیقی تفصیل

ادبی مذاکرے

- ترقی پسندی کا زوال ، نئی دانشوری اور کئی سوال
- جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مسائل
- شاعری سے نثر کی طرف اور شاعری
- نثر سے شاعری کی طرف اور شاعری
- قاری اساس شعر و ادب پر قارئین کے تاثرات

غزل پر تنقیدی مکالمہ

غزل پر شاعر کے ایک ہنگامہ خیز تاریخی ادبی معرکے کا اختتامیہ ۔ ایک نئے تنقیدی آغاز کے ساتھ ۔ ۷۰ سے زائد نئے پرانے قلم کار اس بحث میں شامل ہیں

بخط شاعر

ہم عصر مشاہیر شعرا کا کلام



بہ صورت گر

خاص نمبر میں شامل قلم کاروں کی تصاویر (البم)

سوانحی اشاریے

خاص نمبر کے قلم کاروں کے مستند حالات

آثار لفظ لفظ

مشاہیر کے خطوط (عکسی) مع حواشی

نقد و نظر

- کتب و رسائل پر تبصرے
- کئی اہم کتابوں کے تجزیے
- ۹۹ء تا ۱۹۹۵ء کی مطبوعات

وفیات

- مرحومین کی غیر مطبوعہ تخلیقات
- سوانحی اشاریے اور دیگر معلومات

چہرہ چہرہ یادیں

- نایاب تصاویر
- حوالے

ضخامت ، قیمت ، کتب و رسائل کے اشتہارات کی رعایتی شرح ، اشتہارات کا نرخ نامہ شاعر کے مستقل خریداروں کے لئے رعایتی قیمت ، غیر ممالک کے قارئین و قلم کاروں کے لئے رعایتی شرح ، کتب فروشوں کے لئے کمیشن کی شرح ، خاص نمبر کے تمام ابواب میں شامل ہونے والے قلم کاروں کے نام اور دیگر ضروری معلومات کے ساتھ بہت جلد ——

ہم آپ تک پہنچ رہے ہیں

۲۲ر نومبر ۹۰ء
[illegible]

مکرمی تسلیم

ایک ذرا دیر سے شکریہ ادا کر رہی ہوں کہ میں شاعر کے خاص
نمبر کو بھیجنے سے معذور ہوں اور عابد صاحب کے بھی
معذرت خواہ ہوں۔ لیکن اتفاق سے اسی زمانہ میں
عابد صاحب نے ایک مضمون [illegible] کے نام سے
لکھا ہے اور میں نے ان سے شاعر کے سالنامے
کے لئے لے لیا ہے۔ [illegible] ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ
آپ کو جو شکایت میری طرف سے افسانہ نہ بھیجنے
کی ہو گی وہ عابد صاحب کا مضمون بھیجنے پر دور ہو جائے گی۔
ایک بات اور [illegible] مجھے معذور رکھئے۔ میں ابھی
[illegible] ذاتی حالات [illegible] ابھی تو خود
[illegible] سے لکھنے کے قابل ہوں۔

شاعر میں اکثر رسالہ اور کتب کے سلسلے میں نئی شائع شدہ کتابوں
کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اطلاعاً عرض ہے کہ حال
میں میری تین کتابیں شائع ہوئی ہیں۔
[illegible] — مطبوعہ [illegible] آباد (مجموعہ [illegible])
ادبی جھلکیاں (تنقیدی و ادبی مضامین) مطبوعہ ادارۂ ادبیات اردو
[illegible] (افسانوں کا مجموعہ) " "
تیسری کتاب [illegible] شائع ہوئی ہے [illegible]
[illegible] ہیں۔

یہ بھی شاید آپ نے پڑھا ہو کہ بچوں کے لٹریچر کو [illegible] منسٹری
جو ایوارڈ دیتی ہے اس میں اس سال میری ایک
کہانی سنہری بالوں والے بچوں کا [illegible] کو انعام ملا ہے۔
مضمون کی رسید ضرور بھیجئے گا۔
اکتوبر اور نومبر کا شاعر نہیں ملا۔

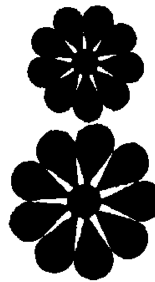
خاکسار
صالحہ عابد حسین

صالحہ عابد حسین [بنام] اعجاز صدیقی

اصلی نام: مصداق فاطمہ۔ [پ: ۱۸ر اگست ۱۹۱۳ء - م: ۸ر جنوری ۱۹۸۸ء] شاعر کے مستقل قلم کاروں میں شامل رہی ہیں ۔۔ قبلہ اعجاز صدیقی کے انتقال [۹ر فروری ۱۹۷۸ء] سے قبل شائع ہونے والے شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر (۱۹۷۷ء) تک صالحہ صاحبہ کی بہت ساری کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۷ء کے دوران بھی مرحومہ کی شاعر سے وابستگی رہی تھی۔

(ادارہ)





شمارہ - ۶ [جون ۹۵] جلد - ۴۶

عوام سے اردو کا رابطہ ٹوٹ رہا ہے

(٦)

بیسویں صدی کی آخری دہائی بھی اب سمٹنے کو ہے۔ ہندوستان کی آزادی، ملک کی تقسیم در تقسیم کے سلسلے اور بکھرتے ہوئے ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں فنون لطیفہ کے منظرناموں میں شعر و ادب کی وہ اہمیت نہیں جو آزادی سے قبل رہی تھی یا آزادی کے آس پاس تھی۔ ملک کی آزادی میں زبانوں اور ان کے شعر و ادب نے جو بنیادی کردار ادا کیا تھا، آج وہ سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔ آزادی کے حصول میں تنہا اردو زبان کی اپنی ایک زندہ تاریخ ہے۔ مگر آج اس تاریخ کو بھی مسخ کیا جا رہا ہے، ختم کیا جا رہا ہے۔ ذہنی اور اخلاقی سطح پر پچھڑنے والی عوام کو ترقی یافتہ ممالک کی نئی تہذیب سے ہم آہنگ کرنے کی ناکام کوششیں کی جا رہی ہیں۔ آزادی سے قبل جس جنت نشاں ملک کے خواب آزادی کے متوالوں نے دیکھے تھے، سوچے تھے، وہ سارے خوش خواب برسوں ہوئے ٹوٹ گئے، بکھر گئے۔ اب تو جمہوریت کے نام پر طاقت اور غنڈہ گردی کے تال میل سے سیاسی کاروبار چمکائے جاتے ہیں۔ دنیا کا ایک بڑا جمہوری ملک، کاغذ پر ایک مثالی ملک ہے لیکن عملی سطح پر ناکام جمہوری نظام کی بدترین مثال ہے۔ کسی جمہوری نظام کے لئے کس طرح کا سیاسی ڈھانچہ ہونا چاہیے وہ کم از کم ہندوستان میں تو واضح نہیں ہے ورنہ اردو جیسی بڑی اور زندہ زبان کو ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاتا۔ اسے کسی ایک قوم کے ساتھ بریکٹ کرنے کی شعوری کوششیں نہیں کی جاتیں۔ تنہا ہندی کے ساتھ اس ملک کا کوئی بھی مستقبل مشکوک ٹھہرے گا کہ سیکولرزم کا تصور تنہا ہندی یا تنہا اردو نہیں ہو سکتا۔ ہندی اردو یا پھر دونوں کے رسم الخط کے ساتھ ہندوستانی کی گونج بھی اب سنائی نہیں دیتی۔ اردو اور دوسری بڑی اکثریت دشمنی اتنی تیز تر ہے کہ سیدھے سادے اردو والے جو زبانی اور تحریری احتجاج کی سطح سے بلند نہیں ہو سکے ہیں۔ اپنی روایتی پریشانی کے ساتھ بہت زیادہ خوش گمانیوں سے باہر ہی نہیں نکل رہے ہیں۔ دوسری طرف عوام کے ساتھ اردو کا تہذیبی رابطہ اب پس منظر ہوتا جا رہا ہے۔ ہندی کے نام پر بننے والی فلموں میں گانوں اور غزل گائیکی میں اردو، صرف بولنے اور سننے کی سطح سے بھی پیچھے اتر رہی ہے۔ اور اب میڈیا کی حد میں ٹیلی ویژن پر چھوٹے بڑے، نیٹ ورک پروگراموں میں، ٹائیٹل سے مکالموں تک بظاہر اردو کہیں نہیں ہے۔ فلموں میں نوے فیصد اردو استعمال کئے جانے کے باوجود ہندی سرٹیفکیٹ کے خلاف کبھی بھی احتجاج نہیں کیا گیا۔ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ فلموں کے کہانی کار، مکالمہ نویس یہ سمجھتے ہیں کہ فلموں میں زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی جب کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ فلموں کے مکالمے، گانوں ہی کی طرح عوام میں مقبول ہوتے تھے۔ اور فلموں کے بیشتر مکالمہ نگار، اردو زبان اور اس کے شعر و ادب سے پوری طرح واقف ہوتے تھے۔ وہ لوگ بھی جن کی مادری زبان ہندی ہوتی تھی، اردو ضرور پڑھنے لکھنے لگتے تھے۔ مگر افسوس کہ کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ فلموں کی غالب زبان اگر اردو ہے تو پھر اسے ہندوستانی کا سرٹیفکیٹ ملنا چاہیے یا، ہندی اردو کا سرٹیفکیٹ ملنا چاہیئے۔ اب اگر آج فلموں میں زبان کی کوئی اہمیت نہیں تو اس کی بڑی وجہ فلموں میں کہانی اور مکالموں کے بجائے ایکشن کے نام پر مار دھاڑ کے خوبصورت مناظر اور بے تکے گانوں کی بھرمار میں عورت کے جسم کا بھرپور استعمال ہی رہ گیا ہے اور ان سب کو آج عوام کی پسند قرار دیا جا رہا ہے۔ تذکیر و تانیث سے عاری جو بے روح مکالمے ادا ہوتے ہیں۔ ان میں بھی اردو مزاجی موجود ہوتی ہے۔ لیکن تلفظ اور لہجہ تمام تر ہندی آمیز ہو رہا ہے لیکن اب بھی فلموں کے مکالمہ نگاروں اور گانے لکھنے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اگرچہ ہندی بھی کرتے ہیں تو اردو کے شعری مزاج سے قریب رہنے کی بہرحال کوشش ضرور کرتے ہیں۔ کیونکہ اردو شاعری کی روایت سے وہ آج بھی کسی نہ کسی طرح جڑے ہوئے ضرور ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہندی کے نام اور ہندی کے کھاتے میں ڈالا جا رہا ہے۔ موجودہ نئی نسل اور آنے والی نسلوں کو مشترکہ تہذیب و تمدن سے دور ہٹایا جا رہا ہے۔ اب زندگی کے ہر شعبے میں ایک بڑے ملک میں خانہ بندی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ زبان، مذہب، سیاست اور تہذیب کے نام پر ہم سب تقسیم ہو رہے ہیں اپنے اپنے خانے بنا رہے ہیں اور اردو والے؟ ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی زبانوں سے زیادہ مصروف تو اردو والے ہی ہیں (عوام نہیں) اردو اکاڈمیوں، سرکاری اداروں اور اپنے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے گروہ میں بٹے ہوئے، "اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ" کے مصداق بے طرح مصروف ہیں۔ اردو کے خلاف عملی سطح پر جو کچھ ہو رہا ہے اس سے یا تو بے خبر ہیں یا پھر اپنی روش ہی بدلنا نہیں چاہتے۔ میڈیا سے پوری طرح جڑنے والے اردو داں حضرات نے یہ بھی احتجاج نہیں کیا کہ دور درشن پر منعقد ہونے والے مشاعرے کیوں بند کر دیئے گئے [ہندی کوی سمیلن بھی بند کر دئے گئے ہیں لیکن اس سے ہندی شاعری کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ سرکاری زبان کے شعر و ادب کو کیا نقصان ہو سکتا ہے] عوام سے اردو کا رشتہ دن بہ دن کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ اردو کی نئی نسل کے لئے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ نئی نسل کو آگے آنا ہے اور اپنے بزرگوں سے الگ، اپنی زبان اور اس کے شعر و ادب کے لئے۔ عملی طور پر وہ سب کچھ کرنا ہے جو بزرگوں نے نہیں کیا اور اب ان سے کوئی امید بھی نہیں کی جا سکتی کہ اب یہ سارے بزرگ منصب داریوں کے قابل ہی رہ گئے ہیں۔

ایک چہار غزلہ
بہ اختلافِ قوافی

مخمور سعیدی



۱

ہر نفس مذہر خود آگہی اور میں
مجھ کو ڈستی ہوئی زندگی اور میں
ہر نئی رُت میں افسردگی اور میں
موسموں کی وہی بے رُخی اور میں
ہر طرف شام اُترتی ہوئی اور میں
اک سمٹتی ہوئی روشنی اور میں
اک نظارہ، نظر سے گذرتا ہوا
ایک دو پل کی نظارگی اور میں
چند پرچھائیاں رقص کرتی ہوئی
اک تماشا، گھڑی دو گھڑی اور میں
کب بجھا سے مجھے یہ ہوائے ستم
بجھ نہ جائیں مری روشنی اور میں
آسماں چل کے خود میرے پاس آئیگا
منتظر، میری درماندگی اور میں
رونقِ شہر بھی جلوۂ دشت بھی
میری بدنام آوارگی اور میں
راستے آشنا آشنا سے، مگر
منزلیں اجنبی اجنبی، اور میں
ہر قدم پر کوئی ہمقدم ہو، مرا
ساتھ میرے یہ دیوانگی، اور میں
ہجر کی رات اور چاند نکلا ہوا
تن جلاتی ہوئی چاندنی، اور میں
پیاس بڑھتی ہوئی، ہونٹ جلتے ہوئے
پاس سے اک گذرتی ندی اور میں
لمحے لمحے سے شرمندگی ہے مجھے
وقت کی کیسی بے مصرفی اور میں
گھٹ کے مرنے کو میں اپنی ہی قید میں
میری اک خواہشِ آخری اور میں
ڈر رہا ہوں تو مخمور حیران ہوں
اک عجب بے دلی بے حسی اور میں

۲

ماندگی کا کٹھن مرحلہ، اور میں
طے نہ ہوتا ہوا راستہ، اور میں
کیسا کہرام مجھ میں بپا، اور میں
قتلِ امید کا سانحہ، اور میں
منہدم جیسے میں خود بھی ہوتا ہوا
انہدامِ طلسمِ وفا، اور میں
سانس سے رشتے خلا میں بکھرتے ہوئے
ربط کا ٹوٹتا سلسلہ، اور میں
لمحہ لمحہ مجھے زیر کرتا ہوا
دمبدم وقت کا سامنا، اور میں
لذتِ بزم آرائی کا ماحصل
زہرِ تنہائی کا ذائقہ، اور میں
وہ بھی بھٹکا ہوا، میں بھی کھویا ہوا
مجھ سے بچھڑا ہوا قافلہ، اور میں
اس فضا سے سلامت گذرنا مجھے
روبرو اک مخالف فضا، اور میں
میں کہاں سے چلا تھا کہاں آگیا
اب سفر میں سبھی کچھ نیا، اور میں
زندگی میں اب اس کے سوا کچھ نہیں
زندہ رہنے کا اک حوصلہ، اور میں
راستے کا تماشا تھے سب کے لیے
مجھ پہ گذرا ہوا حادثہ اور میں
ہر تعلق جدائی کی سوغات لے
بار بار ایک ہی واقعہ، اور میں
رات کی رہگذر، چاندنی ہمسفر
آنکھ سے نیند کا فاصلہ، اور میں
شہر کی اک مہذب گھٹن سے پرے
جنگلوں کی یہ وحشی ہوا، اور میں
پاؤں مخمور دلدل میں دھنستے ہوئے
سر پہ گہری گھنیری گھٹا، اور میں

۳

طنز کرتے یہ دیوار و در، اور میں
مجھ سے بیزار میرا ہی گھر، اور میں
رائیگاں میرا سارا سفر، اور میں
ساتھ چلتی ہوئی رہگذر، اور میں
ذہن دو راستوں پر بھٹکتا ہوا
سر میں آویزشِ خیر و شر، اور میں
بے کراں دل کے دریا کی طغیانیاں
بے اماں خواہشوں کے بھنور، اور میں
ہر قدم پر میں کیا کیا نظارے لیے، مگر
کتنی تنہا ہے میری نظر اور میں
لاکھ خوشیاں مگر کتنی نا معتبر
ایک میرا غمِ معتبر، اور میں
بارگاہیں نہ جو سجدہ گاہیں بھی تھیں
جھک نہ پایا کہیں میرا سر اور میں
راس آئی ہے خانہ خرابی مجھے
ورنہ یوں شہر میں دربدر اور میں!
مدعائے سفر کچھ نہ سمتِ سفر
بس ہولئے سرِ رہگذر اور میں
ایک ٹھوکر لگے ہر قدم پر مجھے
ایک افتاد ہر موڑ پر، اور میں
لمحہ لمحہ فضاؤں میں بکھرتا دھواں
میرے جلتے ہوئے بال و پر، اور میں
ہیں کس اندیشۂ قتل میں ہمرہو
خون آلودہ شام و سحر، اور میں
باخبر لوگ مجھ سے گریزاں رہے
ساتھ میرا دلِ بے خبر، اور میں
کن دنوں کی نہ جانے یہ تصویر ہے
چاندنی رات، سونا کھنڈر، اور میں
اب تو مخمور اس شہر میں کو بہ کو
سر پہ جلتی ہوئی دوپہر، اور میں

۴

اپنی موجودگی کی طلب، اور میں
مجھ سے خالی مرے روز و شب، اور میں
زندگی: ایک بے کار مصروفیت
ہر نفس زحمتِ بے سبب، اور میں
وضعِ دنیا نبھانا کچھ آساں نہیں
مختلف میرے جینے کا ڈھب، اور میں
اس کے ہمراہ، ملنا ہوا تھا کبھی
بعد اس کے ملا خود سے کب اور میں!
پھٹ پڑیں گے تو باہر بچے گا: کچھ
میرے اندر کا قہر و غضب، اور میں
چل پڑوں راہ اپنی نکالوں کوئی
وقت کی راہ دیکھوں نہ اب اور میں
قہقہوں سے کچھ آنسو چھلکتے ہوئے
حزن انگیز فضائے طرب اور میں
اس کی محفل میں بھی آن گھیرا مجھے
غم سے بچ کر کہاں جاؤں اب اور میں
قربتوں کا تصور ہی کچھ ساتھ دے
دوریوں کے یہ رنج و تعب اور میں
بزمِ جاناں کے آداب اپنی جگہ
میری اک خواہشِ بے ادب اور میں
کیا بتاؤں لئے کیا پھراؤں اسے
دل سا مصروفِ لہو و لعب اور میں
سر پہ سورج مرے قہر ڈھاتا ہوا
دھوپ میں سائباں کی طلب اور میں
دیر تک رات اپنے پہ ہنستے رہے
ایک مردِ بلند و لقب اور میں
دیر سے اُن کی آمد کے ہیں منتظر
رات کا منظرِ جاں بہ لب اور میں
آج مخمور اس بے نسب دور میں
مفتخر میرا نام و نسب اور میں

۱۱۷ غالب اپارٹمنٹ، پروانہ روڈ، پریتم پورہ ۔ نئی دہلی

حامدی کاشمیری

مسعود منزل، شالیمار، سری نگر (کشمیر)

معاصر اردو تنقید ۔ چند سوالات

اردو میں روایتی تنقید کے بعد موجودہ صدی میں کم و بیش وہ جملہ تنقیدی نظریات متعارف کئے گئے، جو یورپی ادب میں اپنی حیثیت اور اہمیت منوا چکے ہیں۔ ان میں مارکسی، تمدنی، لسانیاتی، ہیئتی، اسلوبیاتی، اور ساختیاتی نظریاتِ نقد نمایاں ہیں۔ اردو نقادوں کے یہاں انیسویں صدی سے ہی مغربی اصولِ نقد سے اخذ و استفادہ کے رجحان کا اظہار ملتا ہے۔ حالی کا مقدمہ اس کی بیّن مثال ہے۔ مغربی نظریاتِ نقد سے مستفید و متاثر ہونے کا عمل حالی کے بعد برابر جاری رہا اور موجودہ صدی میں فاصلوں کے انہدام اور جدید ذرائع ابلاغ کے فروغ کے نتیجے میں اردو کے نقادوں کو مغربی تنقید کے متنوع نمونوں سے واقفیت بڑھانے کے مواقع ملے اور انہوں نے نظری اور عملی طور پر مغربی تنقیدی نظریات کو برتنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ اردو میں تنقید کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے کافی مالدار ہوتی گئی۔ اور اس نے ایک علاحدہ اور خود کفیل شعبۂ ادب کا مرتبہ حاصل کیا۔ بیسیوں تنقید نگاروں نے اپنے زورِ قلم کا مظاہرہ کیا۔ اسی بنا پر موجودہ دور کو تنقید کے دور سے موسوم کیا جانے لگا۔

تنقید کے تاریخی ارتقاء اور عصرِ حاضر میں اس کی مقبولیت اور دست پذیری کے باوجود اس کی ماہیت، اس کے تفاعل اور اس کی ضرورت کے بارے میں جلد بہ جلد سوالات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اور آج بھی یہ سوالات پوری شدت سے قائم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ روایتی نقادوں کے بعد جدید نقادوں نے اپنے علم اور ادراک کے مطابق ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بالعموم یہ جوابات وقتی اور نظریاتی نوعیت کے ہیں۔ اور جزوی اور غیر تسلی بخش ثابت ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید آج بھی سراپا نشان بنی ہوئی ہے اور اپنے صد سالہ سفر کے بعد بھی سمت و منزل کے تصور سے بیگانہ نظر آتی ہے۔

روایتی نقاد بالعموم سوانحی، تاریخی، اور عصری معلومات کو ادیب کے سر تھوپ کر اپنے تنقیدی فریضے سے خود کو سبکدوش کرتے رہے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں، کہ یہ معلومات ادیب کے تخلیقی شعور کا حصہ بن چکے ہیں۔ یا نہیں۔ یہ درسی عمل تنقید کو غیر متعلقہ تشریح و تفسیر کا آلہ بنانے پر مصر رہا۔ اور فن کاری کے لئے ناقابلِ رسائی ہو کے رہ گیا ہے۔ مارکسی نقاد ادب کے جمالیاتی اصل کو نظر انداز کر کے اسے سماجی اور افادی نقطۂ نظر سے پرکھتے رہے ہیں۔ یہ ادب کے مقتضیات سے چشم پوشی کرنے اور اس پر ایک سیاسی نظریہ لادنے کا غیر فطری عمل ہے۔ جو اس کی صورت کو مسخ کرنے پر منتج ہوتا ہے۔ مارکسی تنقید کے علی الرغم تمدنی تنقید کے موئدین فن کے تخلیقی عناصر کی نشاندہی تو کرتے ہیں۔ مگر مختلف علوم متداولہ یعنی عمرانیات، نفسیات اور بشریات کا سہارا لے کر فن کی قیمت شناسی کی سعی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ایک نتیجہ خیز عمل ثابت ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ فن کے انفرادی وجود اس کے مخصوص تفاعل کا اعتراف کیا جائے۔ بدقسمتی سے ایسے بیشتر نقاد فن کے تجربے کو منکشف کرنے کے بجائے اسے اپنے علم سے گرانبار کرتے ہیں۔ ہیئتی نقاد سوانحی کھوکھلے پن کے مرتب نظریے متن کے خود کفیل اور آزاد وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور لفظ و پیکر کے استعاراتی اور علامتی برتاؤ کا تجزیہ کرتے ہوئے معنی و مطلب ہائے گرد دیدہ نظر [illegible] صورتحال کی شناخت کے بجائے [illegible] تنقید کا عکس ہے۔ یہ بھی آتی تنقید ہی کا [illegible]

سماجی مسائل کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، اور فن کا کوئی تجربہ نہیں۔ بلکہ معنی [illegible] تعین کرتا ہے۔ اور ایک [illegible] ہو کے رہ جاتا ہے۔ پیش تر تخلیق کو مرکز توجہ بناتی ہے اور تخلیق کے موضوعات [illegible] اور معنیاتی [illegible] پر تجزیہ کرتا ہے۔ جو [illegible] ادب کے [illegible] کا تعین کرتے [illegible]

ستخراج معنی ہی کو اپنا مقصد گردانتا ہے۔ جہاں تک ساختیات کا تعلق ہے یہ لسانیات کے حوالے سے فن سے اسی طرح دلچسپی لیتی ہے جس طرح یہ ثقافت کے دیگر مظاہر کا دلچسپی لیتی ہے۔ ساختیاتی تنقید کی رو سے تخلیق کا لسانیاتی عمل لفظوں کے رشتوں کے ایک تجریدی نظام کے تحت کسی متعینہ معنی کے بجائے کثرت معانی کے لئے فضا تخلیق کرتا ہے۔ اسی طرح سے تخلیق اپنے خالق سے لاتعلق ہو جاتی ہے۔ لیکن ہیئتی تنقید کے برعکس ساختیاتی طرز نقد تخلیق کو قائم بالذات وجود تسلیم کرنے کے بجائے لسانیاتی سطح پر اس کے ثقافتی، عمرانی، نفسیاتی، اساطیری اور تاریخی رشتوں کی دریافت پر زور دیتا ہے۔ گویا ساختیاتی پس ساختیاتی اور ساخت شکنی کے نظریات نقد بنیادی طور پر تخلیق کے لسانی وجود کو اہمیت دیتے ہیں اور بعض بنیادی تنقیدی اصولوں یعنی لفظوں کے رشتوں کے ربط و تناقص سے معنوی جہات کی تعیین، متعینہ معنی کے نظریے کی شکست، متن کی لامرکزیت، اور تخلیق کی ثقافتی معنویت کو نمایاں کرتے ہیں۔ تاہم اس نظریۂ تنقید کے عملی امکانات ابھی اردو میں سامنے نہیں آئے ہیں۔ نہ ہی اس کی شعریات کے خدوخال واضح ہوئے ہیں۔

عرض کرنا چاہوں کہ اردو کے نقاد مغربی فکری اور انتقادی تحریکات سے متاثر ہونے کی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں جو ایک طرح سے اچھی بات ہے۔ بشرطیکہ مغربی نظریات نقد کو حرز جاں نہ بنایا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا (اور ایسا کیا جاتا رہا ہے) تو انفرادی غور و فکر کی قوت جواب دے سکتی ہے۔ مغربی نظریات نقد کے دلدادگان اگر استفادے کے رویے کی صحت پر اصرار کرتے ہوئے مغربی نظریات کو اپنا لیتے ہیں، تو پوچھا جا سکتا ہے کہ مشرقی اصول نقد سے بیگانگی کیوں برتی جا رہی ہے؟ کیا مشرقی تنقیدی نکات سے ایک یا ایک سے زاید نظام نقد اخذ نہیں کیے جا سکتے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مغربیت سے مرعوب ہو کر ہم اپنے قیمتی ورثے سے منہ موڑ رہے ہیں! ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ میر اور غالب کے کلام میں مستور شعریات کو ابھی تک مدون کرنے کی جانب توجہ کیوں نہیں کی گئی ہے؟ یہ شعرا جتنے بڑے تخلیق کار تھے، اتنے ہی بڑے نقاد بھی تھے۔ انہوں نے اپنے کلام میں اپنے تنقیدی شعور کا اظہار تنقیدی نکات کی صورت میں متعدد مقامات پر کیا ہے۔ اپنے تنقیدی ورثے سے لاتعلقی یا تو نقادوں کے احساس کمتری کی غماز ہے یا ان کے رویے کے یک رخے پن کو ظاہر کرتی ہے۔ یا ان کی تساہل پسندی کا ثبوت ہے۔ کیا نقادوں کا یہ رویہ اردو تنقید کی تہی مائیگی کا ذمہ دار نہیں؟

تنقید کے نام پر کتابوں اور مقالات کی جو کثرت دیکھنے میں آ رہی ہے، وہ خوش آئند تو ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس حد تک تنقید کا حق ادا کرتی ہے۔ اردو اکادمیوں نے کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی امداد ارزاں کر کے معلمین ادب کو بھی صاحب کتاب بنا دیا ہے۔ اور وہ نقاد ہونے کے دعویدار بن گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جو کتابیں اور مقالے تنقید کے نام پر چھپے ہیں؛ وہ FAKE CRITICISM کے ذیل میں آتے ہیں۔ اور تنقید میں بحران پیدا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے۔ سوال یہ ہے کہ موجودہ کاروباری اور منفعت اندوزی کے اقدار شکن دور میں اردو اکادمیاں بھی اسی دور کا حصہ بننے پر رضامند ہیں! ان کاروباری کار قسم کی تنقیدوں کی اشاعت پر صرف ہونے سے زبان اور ادب کی کیا خدمت ہو سکتی ہے۔

اور یہ سوال بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ قاری اس نوع کی تنقیدات سے اپنا دماغ اور وقت کب تک اور کیوں برباد کرے؟ ایسی تنقیدات سطحیت کے علاوہ یکسانیت کی شکار ہیں۔ آئے دن رسائل میں جو تنقیدی مقالات شائع ہوتے ہیں وہ کون سا نیا تنقیدی نکتہ منکشف کرتے ہیں؟ کیا یہ TRASHY تحریریں ذہنی افلاس اور پستی کو ظاہر نہیں کرتیں؟

تنقید نگاروں کی سہل پسندی کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں دو اور باتوں کی جانب دھیان جا رہا ہے۔ اول یہ کہ اردو تنقید کی روایت اب ماشاء اللہ سو سال کی ہے۔ لیکن اردو میں انگریزی کی جیسی مستند اور تنقیدی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔ جمیل جالبی کی قاموسی تاریخ کی اپنی اہمیت ہے اگر کوئی ایسی جامع تاریخ نہیں ملتی، جو ایک ہی جلد پر محیط ہو۔ کیا یہ کام ادبی نقادوں کا نہیں ہے؟ دوم، عام طور پر ہماری تنقید شاعری کی تنقید ہو کے رہ گئی ہے۔ لے دے کے گوپی چند نارنگ اور وارث علوی کے چند مقالات فکشن کی تنقید سے متعلق ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ فکشن پر کوئی وقیع تنقیدی تصنیف نہیں ملتی!

مروجہ تنقیدی نظریات کی بار آوری تو ایک حد تک مشتبہ ہے ہی۔ تنقید نگاروں نے تنقید لکھتے ہوئے ژولیدگی، تکرار، وضاحت، اصطلاحات کی بھرمار، عبارت آرائی، منطقیت، بے ربطی اور فارسیت سے ان کی رہی سہی افادیت اور معنویت کا بھی خاتمہ بالخیر کیا ہے۔ کیا نقاد صاف، شستہ [illegible]، اور استدلالی زبان نہیں لکھ سکتے۔

مجھے کہنے دیجئے کہ بیشتر معاصر نقاد اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں انصاف سے کام لینے میں بالعموم ناکام رہے ہیں۔ وہ تنقید نگاری

کرتے اسی وقت قلم اٹھاتے ہیں جب مالی منفعت، دوست نوازی، منصبی ترقی، یا شہرت طلبی کے اغراض کی تکمیل ممکن ہو یا کسی سمینار میں ان
کی شرکت یقینی ہو۔ اس نوع کی تنقیدات تجارتی ذہن کو ظاہر کرتی ہیں اور مجموعی طور پر ذاتی لسانی اور علاقائی تعصبات کو ہوا دیتی ہیں۔ کشمیر کی مثال لیجیے
گذشتہ ڈیڑھ سو برس سے یہ خطہ اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت انجام دیتا رہا ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان اردو ہے۔ اور اردو ذریعہ تعلیم ہے۔
جامعات میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کے انتظامات ہیں۔ اردو کتب کی جتنی کھپت یہاں تعلیمی اور ثقافتی اداروں میں ہوتی ہے۔ اور غالباً کہیں نہیں ہوتی نیز یہ خطہ
کل ہند مشاعروں اور ادبی سیمناروں کا مرکز رہی ہے۔ یہاں کے تخلیق کاروں نے اردو زبان و ادب کی توسیع کا سامان کیا ہے۔ کئی اداروں سے
معیاری جرائد نکلتے ہیں کتنے ہی کشمیری الاصل ادیبوں نے وادی سے نکل کر اردو زبان و ادب کو چار چاند لگائے ہیں۔ اور کتنے ادیب اور شاعر
وادی میں رہ کر گیسوئے اردو کو سنوار رہے ہیں۔ اور آج بھی نئی نسل سے تعلق رکھنے والے کتنے ہی باصلاحیت قلمکار اسی سرزمین سے تعلق رکھتے
ہیں۔ لیکن کیا مستند تنقید پر شکن نقاد حضرات نے کبھی کسی کشمیری فنکار پر قلم اٹھایا ہے۔ [لوارہ شاعر کی ایک مثال ہے۔ جس نے گزشتہ حامدی کاشمیری شائع
کیا ہے] ایسا ہی متعصبانہ رویہ ہمارے ادیبوں کے ساتھ روا نہیں رکھا گیا۔ ! کلیم الدین احمد جیسے مستند نقاد کو برسوں تک طعن و تشنیع کا ہدف بنتا پڑا ہے تو ہمارے
کے ادیبوں کو کون منہ لگاتا ہے !

اسی طرح نئی نسل کے باصلاحیت تخلیق کاروں سے اغماض برتنے کا جو عام رویہ اردو نقادوں میں ملتا ہے۔ اس کو کیا کہیے۔ نئی نسل تنقید سے خوف
نہیں کھاتی۔ وہ اپنے محاسن سے زیادہ اپنے معائب سے آگاہ ہونا چاہتی ہے۔ لیے شکوہ ہے تو نام نہاد نقادوں کی شان بے نیازی سے ہے۔ اگر نقاد
ان کی تخلیقات کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے روادار نہیں۔ تو یہ تنگ نظری نہیں تو اور کیا ہے ! کیا نقادوں کو نئے تخلیق کاروں کے "مستند" ہونے
تک انتظار کرنا ہوگا؟ کیا وہ اپنی "نگاہ تیز" سے نئے فنکاروں کی تخلیقات میں کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ نہیں کر سکتے ؟ کہیں ہمارے نقاد اس نگاہ تیز
سے ہی محروم تو نہیں۔ جو دل وجود کو چیر سکتی ہے۔ کبھی کبھی نئی نسلوں کے اس خدشے کو SHARE کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

معاصر نقادوں میں تعصب اور تنگ نظری کی انتہا دہاں ظاہر ہوتی ہے۔ جہاں انہیں کسی اور تنقیدی نظریے سے سابقہ پڑتا ہے اگر اتفاق سے دوسرا
[illegible] اپنے نظریے کا حامی ہوتا ہے۔ یا اس پر چوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو۔ تو ان کی بلبلاہٹ دیدنی ہوتی ہے۔ وہ حزم و احتیاط استدلال اور شائستگی
کو خیرباد کہہ کے 'ذاتیات' پر اترنے اور رکیک حملوں سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ بجائے اس کے کہ مخالف نظریہ نقد کا کھلے ذہن سے مطالعہ کیا جاتا اور اگر
اسے رد کرنا مقصود ہو۔ تو استدلالی قوت سے کام لیا جاتا، وہ بے محابا، "زد یا زد" آزمانے پر اتر جاتے ہیں۔ یہ رویہ حد درجہ افسوسناک ہے اور ساتھ
کی جمہوری قدروں کے منافی ہے۔ ادب کے بارے میں بیک وقت مختلف اور متضاد نظریات کی یکجائی اور کارفرمائی کا جواز خود ادب فراہم کرتا ہے تنقید کوئی
سکہ بند قطعی اور سائنسی فارمولا نہیں کہ جو ایک ہی نظریے کا پابند ہو۔ ادب شناسی کے نظریات و معائر کا اختلاف ادبی اقدار کے فروغ کا باعث ہے مگر ہمارے
نقاد حضرات جو اپنے نظریے کو حرف آخر قرار دیتے ہیں، دیگر نظریات یا کسی نئے نظریے کو لاطائل قرار دینے میں مطلق تامل نہیں کرتے۔

آخر میں "سخن گسترانہ بات" کے مصداق، مجھے کہنے دیجیے کہ میں نے اپنی تنقیدی کتاب "معاصر تنقید" میں اپنے حق کا استعمال کرتے ہوئے معاصر تنقید
کے نظری اور عملی امکانات کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے اردو کے نقادوں (جن میں بڑے بڑے نام بھی ہیں) کی بعض فروگذاشتوں اور حد بندیوں کی نشاندہی کی
ہے۔ یہ کام میں نے نظریاتی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کے پورے خلوص اور نیک نیتی سے کیا ہے۔ ظاہر ہے اس کام میں بعض مستند نقادوں کے علاوہ
بعض مروجہ نظریات نقد کی فروگذاشتوں کی نشاندہی ناگزیر تھی۔ میرا تنقیدی موقف یہ رہا ہے کہ ادب اور غیر ادب میں فرق کیا جائے اور ادب کو غیر ادبی
معیاروں سے جانچنے سے اجتناب کیا جائے۔ میرے خیال میں مروجہ تنقیدات کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ وہ تخلیق میں لسانی دروبست سے ابھرنے والی
نادیدہ اور تجرباتی تخیلی فضا کی دید و دریافت سے چشم پوشی کرتی ہیں۔ اور اس سے صرف سماجی، ثقافتی اور عصری معلومات کے استخراج پر زور دیتی
ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ فن پارے سے اس نوع کی معلومات کا تقاضا کرنا فن کی ماہیئت سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے ! فن ایک منفرد ذہنی عمل ہے۔ جو
تخلیقیت کا پروردہ ہے۔ اور دیگر تمام ذہنی اعمال سے مختلف ہے۔ کیوں نہ فن کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اور اسے تاریخ، ثقافت اور علوم کی بیساکھیوں
سے نجات دلا کر اسے اپنے آزاد، توانا، اور حرکی وجود سے متعارف ہونے کا موقع دیا جائے ! لیکن یہ بات تنگ نظر نقادوں کے گلے سے کیونکر اترے
گی وہ ادب اور علوم کو گڈمڈ کرنے سے کیوں کر باز آئیں گے ! ذہنی آزادی کی نعمت سے بے بہرہ شخص اس کی قدر و قیمت کو کیا سمجھے گا !



راج نرائن راز



مظہر امام

کوئی سُنے نہ سُنے، عرضِ حال کرتا جا
نہ رُک جواب کی خاطر سوال کرتا جا

سمندروں کو ہوا میں اچھال دے اک بار
تو باہنر ہے تو یہ بھی کمال کرتا جا

بدل دے ہجر کی ساعت کو وصل لمحوں میں
بنا کے کام کو آساں محال کرتا جا

تری مثال میں کیا دوں کہ بے مثال ہے تو
مجھے بھی منفرد و بے مثال کرتا جا

"شکست و فتح نصیبوں سے ہے" ولے اے دل!
ملے ہیں زخم تو خود اندمال کرتا جا

یہیں کہیں ترا ماضی بھی سو رہا ہوگا
گزرنے والے! بس اتنا خیال کرتا جا

ترا ہنر، تری دانائی بد دعا ہے امام!
زوال تیرا مقدر، کمال کرتا جا

قطعہ

مرے عزیز! مرے نکتہ چیں! مرے ناقد!
مجھے شکارِ عتاب و جلال کرتا جا

بہت سے تیر ہیں تری کماں میں قید ابھی
مرے لہو سے قبا اپنی لال کرتا جا

مرے زوال پہ کر ثبت آخری تحریر
یہ کارِ نیک بھی اے لازوال! کرتا جا

● ۱۸۶ - بی، پاکٹ ۱، میور وہار، فیز ۱، دہلی - ۱۱۰۰۹۱

ایک نظم

اس نے کہا تھا:
بول رہٹ کے، اور پنچھی کے
سب الفاظ، صدائیں ساری
جو تحلیل ہوئیں، نیلے گنبد میں
جو تحریر ہوئیں لمحوں پہ
جو محسوب ہوئیں سانسوں سے
نیل گگن میں۔ صبحِ ازل سے بکھری ہیں
۔ آج بھی ان کو سُن سکتے۔ پڑھ سکتے ہیں

اس نے کہا تھا:
شبد امر ہے....
شبد امر ہے

● ۳۴/۷۹ - ایسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی - ۸

سلطان جمیل نسیم

اے ۹۱/۴/۳ گلشن اقبال، کراچی۔۔۔۳۰۰ پاکستان



انتظار

جب پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج اندھیرے میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ مدھم روشنی پھیلتی ہے اور اسٹیج کی جدید تکنیک کے استعمال سے شہر کی ایک مصروف شاہراہ پر بے ہنگم بھاگتے ہوئے ٹریفک کو روشنیوں اور صوتی اثرات کے ذریعہ دکھایا جاتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد صرف ٹریفک کا شور باقی رہ جاتا ہے۔ ہال کی روشنیاں بھی بجھ جاتی ہیں۔ تماشائی اندھیرے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ تو اسٹیج کی مدھم روشنی واضح طور پر نظر آنے لگتی ہے۔

اب اسٹیج پر لوگوں کی آمد و رفت دکھائی جاتی ہے۔ سب تیز تیز چل رہے ہیں۔ اور اس طرح چلتے ہوئے کبھی کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جاتے ہیں۔ مگر کوئی معذرت کئے بغیر جیسے کچھ ہوا ہی نہیں عجلت کے ساتھ اپنے راستے پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

مدھم سے اجالے میں روشنی کا دائرہ اسٹیج کے داہنی طرف سے چلتا ہوا سڑک کے کنارے ایک پان والے کی دکان کو نمایاں کرتا ہے۔ جہاں ایک آدمی دکان سے ٹیک لگائے کھڑا ہے۔ اور دکاندار بڑی پھرتی سے پان لگا کر ایک طرف رکھتا جا رہا ہے۔ آدمی اور دکاندار آپس میں باتیں کر رہے ہیں مگر تماشائی ان کی گفتگو نہیں سن سکتے۔ کبھی کبھی راہگیروں میں کوئی پان یا سگریٹ خریدنے کے لئے دکان کے سامنے آ کے ٹھہر جاتا ہے۔

روشنی کا دائرہ راہگیروں کے ہجوم اور دکان کو گہنائے ہوئے اجالے کا حصہ بنا کے ایک عورت کو اپنے حلقے میں لیتا ہے جو بائیں جانب سے اسٹیج پر آتی ہے۔ عورت کی عمر چالیس سال کے قریب ہے۔ بوسیدہ اور میلا لباس، بے ترتیب الجھے ہوئے بال، اور چہرے پر امڈتی ہوئی پریشانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لمبا سفر کر کے آئی ہے۔ عورت کے ایک ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ ہے جس کو وہ اتنی احتیاط اور مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے جیسے وہ آخری نوٹ ہے جس کو اگر کسی نے چھین لیا۔ یا ہاتھ سے گر کے کہیں گم ہو گیا، تو وہ بالکل محتاج ہو جائے گی۔

عورت اسٹیج پر آنے کے بعد حیرت اور پریشانی کے ساتھ آنے جانے والوں کو غور سے دیکھتی رہتی ہے۔ پھر جھجکتے ہوئے کسی گذرتی ہوئی عورت کی جانب بڑھتی ہے۔ اور کبھی کسی مرد کی طرف، مگر ان کی تیز رفتاری اور ایک دوسرے سے لاتعلقی دیکھ کر ٹھٹھک جاتی ہے۔ ایک شخص جو دوسروں کے مقابلے میں کم تیز قدم ہے جب عورت کے قریب پہنچتا ہے تو اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا کاغذ کا پرزہ اس شخص کی طرف بڑھا کے کہتی ہے۔

"بھائی! یہ۔ ذرا سنئے۔"

عورت کی بات سنے بغیر وہ شخص جلدی سے "معاف کرو" کہتا ہوا دوسرے لوگوں کی طرح تیز تیز قدم بڑھا کے روشنی کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔

عورت کے چہرے پر تحیر کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ اس شخص کو آنے جانے والوں کی بھیڑ میں گم ہوتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے۔ اتنی دیر میں دوسرا آدمی اس کے قریب آتا ہے وہ سہمے ہوئے انداز میں اسے متوجہ کرتی ہے۔

"بھائی صاحب۔۔"

آدمی چلتے چلتے ٹھہر جاتا ہے۔ عورت کے جانچنے والی نظروں سے سر سے پاؤں تک دیکھتا ہے۔ پھر کندھے اچکا کر کچھ کہے سنے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ عورت کو تعجب کے بھنور میں گھومتے چھوڑ کر روشنی کا دائرہ اسٹیج پر آنے والے ایک ایسے آدمی کو نمایاں کرتا ہے جو اپنے پیشرو سے گذرنے والے ہجوم کا حصہ نہیں

ملگجا، سست قدم، ڈھیلے ڈھالے لباس، بڑھا ہوا شیو، کھچڑی بال، عمر پچاس کے لگ بھگ۔ اپنے خیالوں میں گم۔ خیال کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے ہاتھ۔ اپنے آپ سے الجھتا ہوا یہ آدمی جب عورت کے قریب پہنچتا ہے تو عورت کے چہرے سے فکر اور پریشانی کم ہو جاتی ہے۔

اور وہ قدرے اعتماد کے ساتھ مگر آواز میں لجاجت پیدا کر کے مخاطب کرتی ہے تو قدرتاً آدمی ٹھہر جاتا ہے۔ مگر کچھ بولتا نہیں۔ عورت کی طرف دیکھتا ہے۔ عورت اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ اس آدمی کی طرف بڑھا کر کہتی ہے۔

"یہ نظیر کا پتہ ہے۔ مجھے بتا دو اس پتے پہ کیسے پہنچوں"

وہ آدمی عورت کے ہاتھ سے کاغذ لے لیتا ہے۔ اور الٹ پلٹ کے دیکھنے لگتا ہے۔ تماشائی محسوس کرتے ہیں کہ کاغذ کورا ہے۔ یا پھر وہ شخص پڑھنا نہیں جانتا۔ وہ آدمی کاغذ کو اس طرح اپنی آنکھوں کے قریب لے جاتا ہے جیسے اس کی نظر بہت ہی کمزور ہے اور کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت اسے نظر نہیں آ رہی ہے۔ عورت کہتی ہے۔

"بہت دن ہو گئے مجھے ڈھونڈتے ہوئے۔ پتہ ملتا ہی نہیں۔"

یہ سن کر وہ آدمی زور زور سے ہنسنے لگتا ہے۔ عورت اس کے ہاتھ سے پرچہ جھپٹ لیتی ہے۔ مگر اس شخص پر عورت کی بے اعتباری کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ مسلسل قہقہہ لگائے جاتا ہے۔ اب عورت خوف زدہ ہو کر آدمی کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ پھر وہ اپنے چاروں طرف دیکھتی ہے۔ اس آدمی کے بے تحاشہ ہنسنے پر کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے۔ لوگ مخالف سمتوں سے آتے ہیں اور تیزی سے چلتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

وہ شخص ہنستے ہنستے تھک کر کھانسنے لگتا ہے۔ جب کھانسی تھمتی ہے۔ تو کہتا ہے۔

"یہاں لوگوں کو اپنے پتے نہیں ملتے۔ تجھے اپنوں کا پتہ کیسے مل جائے گا۔"

عورت ہمت کر کے بے یقینی لہجے میں کہتی ہے۔

"مجھے پتہ کون بتلائے گا۔ میں کس سے پوچھوں۔"

اب آدمی غصہ میں کہتا ہے۔

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تیرے پاس تو پتہ ہے چلی جا۔" پھر ایک دم غصیلہ لہجہ نرمی میں بدلتا ہے۔ "کسی سے بھی پوچھ لے شہر کا ہر آدمی بتا دے گا۔" اتنا کہنے کے بعد اس شخص کے چہرے پر بے چارگی کی کیفیت چھا جاتی ہے۔ اور وہ دکھ بھرے لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا ہے۔

"میرے پاس تو پتہ بھی نہیں ہے۔ وہ بھی کہیں گم ہو گیا ہے۔"

عورت حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ اور پوچھتی ہے۔

"تمہارے پاس نظیر کا پتہ تھا؟"

آدمی یہ بات سن کر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر ایسے رکھتا ہے جیسے چھلکتے ہوئے درد کو سمیٹ رہا ہو۔ اور کہتا ہے۔

"ہاں۔ بلکہ نظیر میرے پاس تھا۔"

عورت کی اضطرابی کیفیت بڑھ جاتی ہے۔ ہونٹ کانپتے ہیں۔ ہاتھ تھرتھراتے ہیں۔ پھر وہ خود پر قابو پا لیتی ہے۔ اور شک بھرے لہجے میں پوچھتی ہے۔

"نظیر تمہارے پاس تھا؟ وہ اب کہاں ہے۔؟"

یہ سوال سن کر آدمی کے سینے پر رکھے ہوئے ہاتھ یوں گر جاتے ہیں جیسے بالکل بے جان ہوں۔ پھر خود کلامی کے انداز میں بولتا ہے۔

"معلوم نہیں اب کہاں ہے۔ گم ہو گیا۔"

عورت ایک قدم اس کی جانب بڑھتی ہے۔ اور بہت ہی بے چینی کے ساتھ پوچھتی ہے۔

"گم ہو گیا؟ مگر کہاں۔؟"

جواب دینے کے بجائے وہ آدمی مسخرے پن سے ہنسنے لگتا ہے۔ عورت غصہ میں اس کی طرف ایک قدم اس طرح بڑھاتی ہے جیسے اس کا گریبان پکڑ لے گی۔ پھر اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتی ہے۔ اور تیز لہجے میں پوچھتی ہے۔

"بتاؤ۔ کہاں ہے میرا نظیر۔ بولو۔"

آدمی کی ہنسی رک جاتی ہے۔ ذرا سی خاموشی کے بعد دکھی لہجہ میں کہتا ہے۔

"یہ معلوم ہوتا تو اسے لے نہ آتا۔"

عورت چند لمحوں تک آدمی کو گھورتی رہتی ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر ہونٹ ہل کر رہ جاتے ہیں۔

تماشائی سمجھتے ہیں جیسے وہ اپنے مکالمے بھول گئی ہے۔ پھر وہ اسے اداکاری سمجھتے ہیں۔ اور چپ بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں۔

خاموشی کے ایک قلیل وقفہ کے بعد عورت پوچھتی ہے۔

"تم کو ملا کہاں تھا۔"

مرد حیرت بھرے لہجے میں پوچھتا ہے۔ "کون۔؟"

"نظیر۔" عورت نام بتا کے آدمی کی شکل تکنے لگتی ہے۔

آدمی نام سن کر چاروں طرف گھوم کے دیکھتا ہے جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ پھر تماشائیوں کی جانب منہ کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ عورت بھی اس کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے۔ اور پھر پوچھتی ہے۔

"نظیر تم کو کہاں ملا تھا۔"

"نظیر۔ نظیر بیٹا تھا میرا۔ میرا بیٹا تھا۔" اتنا کہنے کے بعد وہ بازوؤں میں منہ چھپا کے رونے لگتا ہے۔ اس کا رونا بھی عورت کے لئے اتنا ہی تعجب خیز ہے جتنا قہقہے لگانا تھا۔ وہ چند لمحوں تک آدمی کو منہ چھپائے روتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے۔ پھر مطمئن انداز میں اٹھ جاتی ہے۔ جیسے اس آدمی کی باتوں سے عورت کے وجود میں اٹھنے والے ناامیدی اور بے قراری کے بگولے تھم گئے ہوں۔

آدمی اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھاتا ہے۔ عورت کی طرف دیکھتا ہے گلوگیر لہجے میں کہتا ہے۔

"میں نے تو اس کو منع کیا تھا۔ میں نے کہا تھا باہر آندھی چل رہی ہے۔ کون کب اڑ جائے پتہ ہی نہیں۔ مگر اس نے ہمیشہ کی طرح میری بات نہ مانی۔ میں نے دیکھا وہ گھر سے نکلا۔ پھر میں نے دیکھا وہ آندھی کی لپیٹ میں آیا۔ پہلے چکر کھائے پھر گرا۔ پھر اڑ گیا۔ اب دیکھو۔ ان لوگوں کے چہرے دیکھو۔ کون گر گیا۔ کون اڑ گیا۔ ان کو جیسے واسطہ ہی نہیں ہے۔ سب اپنے کام میں۔ اپنے دھن میں مگن ہیں۔"

اتنا کہہ کے وہ آدمی اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں باندھ کر پرعزم لہجے میں کہتا ہے۔

"اب میں آندھی کو روکوں گا۔ میں اس کے سامنے دیوار بن جاؤں گا۔"

اتنا کہنے کے بعد گھٹنوں کے بل اس طرح بیٹھ جاتا ہے۔ جیسے ڈھے ہو گیا ہو۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کے باندھ لیتا ہے۔ اور اپنی بھاری ڈوبتی آواز میں کہتا ہے۔

"میں آندھی کے ہاتھ جوڑوں گا۔ میں کہوں گا۔ میں کہوں گا۔ بوڑھے بیٹھے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے بند پردے ہو گئے ہیں۔ ان بوڑھوں کو اڑا کے لے جا۔ ابھی جن کے کھانے کمانے کے دن ہیں۔ ان کو چھوڑ دے۔ ان کو تو چھوڑ دے۔"

اسٹیج پر دفتہ رفتہ تاریکی کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔ پھر اتنا اندھیرا چھا جاتا ہے کہ وہ آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ مگر عورت جو ذرا دور کھڑی رہتی ہے روشنی کا دائرہ اسے اپنے ہالے میں لے رکھتا ہے۔ عورت کے کانپتے ہاتھوں میں کاغذ کا پرزہ لرز رہا ہے۔ پھر وہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ زمین پر گرا ہوا کاغذ کا ٹکڑا روشنی کی زد میں ہے۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا کاغذ کو اڑا کے ایک سمت لے جاتا ہے۔ عورت بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑی رہتی ہے کاغذ کا ٹکڑا روشنی کے دائرے میں اڑتا ہوا پان والے کی دکان کی طرف جاتا ہے۔ اب دکان اور دکان سے ٹیک لگائے ہوئے کھڑا آدمی تیز روشنی کے دائرے میں آ جاتے ہیں۔

آدمی جھک کر کاغذ کا پرزہ اٹھاتا ہے۔ اور اس پر نظر ڈالے بغیر دکاندار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتا ہے۔

"یار بہت دن ہو گئے۔ ان دونوں کا یہ ایک ہی ڈرامہ دیکھتے ہوئے یہ لوگ اکتائے تو نہیں ہیں جن کا بیٹا مارا گیا ہے۔"

دوکاندار پان لگاتے لگاتے رک جاتا ہے۔ اور دکھ بھرے لہجے میں کہتا ہے۔

"شہر میں دس پانچ آدمی روز ہی قتل ہو جاتے ہیں۔ اب تو ہم سوگ منانا بھی بھول گئے ہیں۔ میں تو روز دعا مانگتا ہوں۔ پروردگار اپنی امان میں رکھنا کسی دن اتنے قتل نہ ہو جائیں کہ بازار ہی بند کرنا پڑ جائے۔ بازار بند ہوتا ہے۔ تو دوکان بند رہتی ہے۔ اور بھوک کا منہ کھل جاتا ہے۔"

دوکاندار کے اس جملے کے ساتھ ہی روشنی کم ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ اسٹیج پر موجود ہر شے اور تمام کردار اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں۔ تماشائیوں کے چاروں طرف بھی اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ اس اندھیرے میں تماشائی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ یہ درمیانی وقفہ ہے یا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ وہ بیٹھے رہیں یا اٹھ جائیں۔ ❁

بقیہ صفحہ ۱۸ قرض

دینے کی رہے تھے۔ ہی ہی ہی۔ ؟"

"ارے نہیں بیٹا۔ اب کی بار یہی تیس روپے رکھ لے۔ اگلی بار آؤں گا تو کسر پوری کر دوں گا۔"

اور رگھو نے تیس روپے پکڑ لئے۔

اسی وقت اس کی نگاہ مکان سے نکلتے ہوئے ایک نئے شادی شدہ جوڑے پر پڑی۔ اس نے ماموں کے بیٹے کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ سمجھ گیا کہ یہ ماموں کا بیٹا ہے۔ اور اس کے ساتھ ان کی بہو ہے۔

وہ دونوں دو قدم ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

رگھو بولا۔

"ماموں یہ تو بہو ہے نا۔ ؟ اور وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔"

اور ان دونوں کی طرف بڑھا

"یہ لے بہو۔ یہ لے۔ ماموں! میرا ابھی تو کچھ فرض بنتا ہے نا۔"

اور اس نے ہاتھ میں پکڑے تیس روپے بہو کو پکڑا دیئے ❁

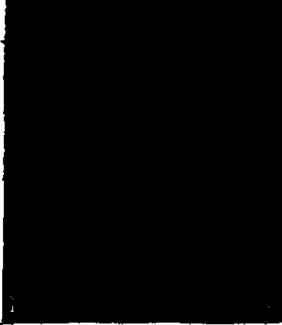


عقیل شاداب

زندگی کا تانا بانا

اک جزیرا
پانیوں کے بیچ میں
خواب آنکھوں کی امانت
جاگتی آنکھوں کے خواب
اور تعبیریں
بھٹکتی پھر رہی ہیں دشت میں
ہم سرابوں کے مسافر
آندھیوں کی زد میں ہیں
جسم کے مرقد میں ہیں
کشتیاں کاغذ کی لے کر چل پڑے ہیں
ایک اندیکھے سفر پر
ہر طرف متّو جزر ہے
اور بھنور ہے
اب جزیرے تک
سفر ممکن نہیں ہے
پلکوں سے خوابوں کی چلمن نوچ کر
اندھی تعبیروں کی قبروں میں سُلادیں
نقش پانی پر ہیں جو
وہ سب مٹا دیں
سونے والوں کو
جگا دیں
اب جزیرا ہے نہ صحرا
شہر زادِ زندگی
اک ادھورا فسانا
اور اک شب زندگی کا
تانا بانا

● برج راج پورہ، کوٹہ-۶- راجستھان



کشوری لال ذاکر

اپنا خط شاعر

اپنی تقدیر سے کچھ دیر خفا ہو جاؤں
سوچتا ہوں کہ میں اب تجھ سے جدا ہو جاؤں

ایک لمحے میں بکھر جاؤں میں خوشبو بن کر
جذب ہو جاؤں ہواؤں میں فنا ہو جاؤں

اس بری دنیا میں سو دھوکے خدا رکھے ہیں
سوچتا ہوں کہ میں خود اپنا خدا ہو جاؤں

میرے معصوم سے کردار بڑے اچھے ہیں
ان کو چاہوں تو کبھی ان سے خفا ہو جاؤں

مجھکو تاریخ میں ڈھونڈیں یہ سوچ کے میں
کاش میں رنگ حنا، رسم وفا ہو جاؤں

● ۳۶۷- سیکٹر ۱- ۴۴- چنڈی گڑھ

بشیشور پردیپ

۵۵۵ - لے اندرا نگر، لکھنؤ - (یوپی)

فرض

یہ کیا کم تھا کہ جب بھی وہ اپنے شہر جسونت نگر جاتے تو اپنے بھانجے کو کچھ نہ کچھ ضرور دے آتے۔ کبھی کچھ نقد روپئے۔ اور کبھی قمیص، نیکر یا پاجامے کے لئے کپڑا۔ وہ ان کا سگا بھانجا بھی تو نہ تھا۔ رشتے کی ایک بہن کا لڑکا تھا۔ اس لحاظ سے جتنا بھی وہ اس کے لئے کرتے، بس اتنا ہی اپنا فرض سمجھتے۔

رگھو جب تین برس کا تھا تب ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر کمزور ہے۔ اور انہی دنوں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ جب وہ کچھ بڑا ہوا تو سوتیلی ماں کے سلوک کی وجہ سے پریشان بھی رہنے لگا۔ وہ تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا۔ نہ باپ نے اس کی تعلیم کی طرف دھیان دیا۔ اور نہ سوتیلی ماں نے۔ چھ سات ماہ ہی اسکول گیا۔ پھر گیا ہی نہیں۔ وہ دن بھر ادھر ادھر گھومتا رہتا۔ لیکن اس کے گھومنے پھرنے میں اس کی شرارتوں کا یا آوارہ گردی کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ صرف اس کی معصوم طبیعت نمایاں ہوتی کبھی کہیں مداری کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ تو کبھی ڈگڈگی پر ناچنے والے ریچھ یا بندر کا تماشا کبھی اسٹیشن پر کسی بنچ پر بیٹھا ان گذرتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھ رہا ہے جو اس چھوٹے اسٹیشن پر رکتی نہیں تھیں، تیزی سے گذر جاتی تھیں۔ تو کبھی کسی میدان میں یا کسی درخت کے نیچے سویا ہوا ہے۔ جب تیرہ چودہ برس کا ہوا تو رات کو بھی گھر سے غائب رہنے لگا۔ شروع شروع میں اس کے باپ نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ تو وہ کبھی کسی مندر میں سویا ہوا ملا، کبھی کسی پیر و مرشد کے مزار پر۔ پتہ چلا کہ مندر میں دیر رات تک بھجن کیرتن سننے کے بعد یا مزار پر ہو رہی قوالی سننے کے بعد وہ وہیں سو گیا تھا۔ اور اس کے بعد تو اس کے باپ نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش ہی چھوڑ دی۔ اور پھر ایک دن اس کا باپ اور اس کی سوتیلی ماں دونوں ہی ایک حادثے میں چل بسے۔ اور اب وہ بالکل ہی اکیلا رہ گیا۔ اُسے گھر کے ساتھ پہلے ہی کوئی لگاؤ نہ تھا۔ لیکن ایک تعلق تو ان لوگوں کے ساتھ بنا ہی ہوا تھا۔ یعنی جب کبھی اس کا جی چاہتا تھا تو وہ سارا دن گھر ہی میں پڑا رہتا۔ اور اب وہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔

اس کی اپنی ماں کا کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد اپنے اس بھانجے کا خیال کرتا۔ ماں کے دور کے رشتے کے ایک بھائی تھے جو اب کان پور میں جا بسے تھے۔ انہیں اچانک خیال آ گیا رشتہ نبھانے کا۔ اس کے باپ کی زندگی میں وہ جب کبھی اپنے شہر جسونت نگر آتے تو اسے بھی دیکھنے چلے آتے۔ اور اب باپ کے مرنے کے بعد رگھو نے یہ سلسلہ اس طرح جاری رکھا کہ ان کے آنے پر وہ خود انہیں پرنام کرنے کیلئے ان کے پاس پہونچ جاتا۔ اپنے بے ڈھنگے سے ڈیل ڈول کے ساتھ میلے کثیف کپڑے پہنے۔ گرمیوں میں صرف نیکر اور بنیان اور سردیوں میں ایک پرانا جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا سویٹر، جو اکثر اس نے بنیان کے اوپر ہی پہنا ہوتا اور پاؤں اس کے ہمیشہ ننگے ہی ہوتے۔ لیکن اسے پاس دیکھ کر ماموں کو قطعی اچھا نہ لگتا بلکہ کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگتی۔ اور کبھی کبھی وہ سوچتے میں نے بھی کیا مصیبت مول لے لی ہے۔ جب اس خبطی نے ہوش سنبھالا تھا۔ میں اس سے اپنا رشتہ نہ جوڑتا تو کون سا فرق پڑ جاتا۔ میرے بارے میں اسے پتہ ہی نہ چلتا۔ پھر وہ یوں مجھ سے ملنے تو نہ چلا آتا۔ لیکن پھر انہیں خیال آ جاتا۔ انسانیت کا ناطہ بھی تو کوئی ناطہ ہوتا ہے۔ اور یہ تو پھر بھی رشتے میں بھانجا لگتا ہے۔ اس کا اور ہے کون۔؟ کچھ نہ کچھ تو اس کا خیال کرنا ہی پڑے گا۔ اس سے ان کی ہر ملاقات ان کے ذہن میں اس طرح کے منفی اور مثبت خیالات کو اجاگر کرتی۔ جہاں تک رگھو کا سوال ہے۔ تو اسے اپنے ماموں کے بلانے

میں کیا سوچتا تھا۔؟ وہ تو بس اتنا جانتا تھا کہ اس کے ماموں اس کے لئے۔ اور اسے ان سے ملنے ضرور جانا ہے۔ اور جب ماموں ملیں گے تو اسے کچھ پیسے بھی دے دیں گے۔ ان پیسوں سے لئے اور بعد میں ان پیسوں سے کھانے پینے کی چیزیں خریدنے میں اور ان چیزوں میں سے کچھ اپنے لئے رکھنے کے بعد باقی کسی مسجد یا مندر کے باہر بیٹھے فقیروں میں بانٹ دینے میں اسے ایک خاص مسرت ہوتی تھی۔

شروع شروع میں یہ رقم صرف چار پانچ روپے تک ہی محدود تھی پھر وقت اور مہنگائی کے ساتھ ساتھ یہ رقم بڑھتی گئی اور اب جبکہ رگھو تیس برس کا ہو گیا تھا تو ماموں اسے پندرہ بیس روپے دے جاتے وہ ہمیشہ سوچتے اب کی بار اسے کچھ زیادہ دے دیں گے۔ لیکن ہر بار ان کا یہ جذبہ سوچنے کی حد تک ہی رہ جاتا۔ ہر بار انہیں یاد آجاتا کہ انہیں فلاں فلاں کام کے لئے خرچ کرنا ہے۔ وہ پندرہ بیس روپے سے زیادہ نہیں بچا پائیں گے۔

رگھو کبھی کبھی مزدوری بھی کر لیتا تھا اس شہر کے چھوٹے اسٹیشن پر قلی گیری۔ یہ مزدوری کرنے کا جذبہ بھی اس کے اندر اپنے آپ کسی وقت ابھرتا۔ ورنہ اسے بیکار گھومنا زیادہ اچھا لگتا تھا یا پھر گلی محلے والوں کا مفت کام کر دیتا۔ ایسے کام جن کے کرنے کے بدلے میں کوئی بھی چیز کے پانے کی خواہش نہ ہوتی۔ یہ بات اور ہے کہ ان میں سے کوئی اسے کھانا کھلا دیتا یا گھر میں کسی کا اترا ہوا کپڑا دے دیتا۔

”ارے رگھو بیٹا! یہ لے جھولا۔ اس میں گیہوں ہے تھوڑا سا کیسے کی چکی میں پسوالا۔ یہ لے پیسے۔ اسے پسوا کے سیدھے آنا۔“

”رگھو بیٹا! یہ لے برتن اور پیسے، نانک حلوائی کی دکان سے دہی لا دے، ایک پاؤ۔“

”رگھو ذرا ادھر تو آنا بیٹے۔ میرے ساتھ مل کر یہ سامان اندر رکھوا دے۔“

”بھیا رگھو۔ یہ لو تھیلا۔ اور پیسے۔ ذرا ایک کلو پیاز تو لا دو۔“

اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ وہ کسی کا جھولا اور پیسے لے کر گیا ہوتا بازار سے اس کا سامان لانے۔ اور قمیص کی جیب میں سوراخ ہونے کی وجہ سے پیسے کہیں گر جاتے۔ اور اسے جب ہی پتہ چلتا جب سامان لے چکا ہوتا۔ پھر وہ سامان دوکان والے کو لوٹا کر تقریباً بھاگتا ہوا واپس آتا۔

”چاچی۔ پیسے تو گر گئے رے۔“

”گر گئے۔؟ کیسے گر گئے۔؟!“

”یہ دیکھ وہ جیب کے سوراخ میں انگلیاں ڈال کر دکھانے لگتا۔ اور کھل کھلا کر ہنس دیتا۔

ہاہا۔ ہاہا۔ چاچی مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ اور چاچی تم نے بھی تو میری جیب نہیں دیکھی۔ لاؤ پیسے دو۔ تمہارا سامان لا دوں۔“

”ارے رہنے دے اب۔“

”نہیں چاچی۔ پیسے دو۔ سامان لا دوں گا۔“

اور پھر چاچی اس کی جیب بھی سی دیتی۔ اور دوبارہ پیسے بھی دے دیتی۔ اس وقت چاچی اسے سمجھانے بھی لگتی۔

”دیکھ رگھو۔ اب تو کچھ کام کیا کر بیٹے۔“

”ارے آج مزدوری کی تھی چاچی۔ دو روپے ملے تھے۔“ اور وہ اپنی جیب کو دیکھنے لگتا۔ چاچی سمجھ جاتی۔ وہ اپنے دو روپے بھی کہیں گرا آیا تھا۔

اور پھر ایک دن اسے کسی نے بتایا کہ اس کے ماموں کے بیٹے کی شادی ہے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اور شادی میں شریک ہونے کے خواب دیکھنے لگا۔ لیکن ماموں اسے شادی میں مدعو کرنے کے بارے میں کیسے سوچ سکتے تھے۔؟ کہاں ان کے یہاں شادی میں آنے والے مہذب و شائستہ مہمان۔ اور کہاں یہ وہ ان پڑھ گنوار رگھو۔! انہیں خیال ہی نہ آیا کہ ان کے اپنے شہر میں رگھو نام کا ان کا کوئی بھانجا بھی رہتا ہے۔؟

ان کے بیٹے کی شادی ہو گئی۔ اور ادھر رگھو بھی بھول گیا۔ کہ ماموں کے بیٹے کی شادی ہونے والی تھی یا شادی ہو گئی ہو گی۔ وہ اسی طرح اپنی روزمرہ کی زندگی میں مست تھا۔

شادی کے دو ماہ بعد ماموں جب وہ نئے اگر آئے تو اپنے بیٹے اور بہو دونوں کو ساتھ لیتے آئے انہیں اپنے شہر میں اپنا مکان اور زمین دکھانے کے لئے اپنے مکان کا آدھا حصہ انہوں نے اپنے لئے رکھا ہوا تھا۔ اور باقی آدھے میں ان کا ایک کارندہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ جو ان کی زمین کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ وہ دن بھر اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ اپنے مکان ہی میں رہے۔ بس ایک بار ان کو ساتھ لے جا کر اپنی زمین، اپنے کھیت دکھا لائے۔ وہ

وہاں پر پکنک منانے کے موڈ میں تھے۔ جو کچھ سامان ساتھ لائے
تھی۔ اس نے کار سے کی بیوی تک ساتھ مل کر [illegible] بلٹ پر سب
مل کر کھائے۔

شام کو جب واپس چلنے کا وقت نزدیک آیا تو ماموں کو رگھو
کا خیال آگیا۔ وہ حیران تھے کہ اب کی بار رگھو انھیں ملنے کیسے نہیں
آیا! شاید اسے پتہ نہیں چلا کہ اس کے ماموں آئے ہوئے ہیں۔
چلو۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا [illegible]
کہتے ہیں کہ شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر۔ وہی ہوا۔ وہ جو اور
بیٹے [illegible] تیار ہوئے اور گھر سے باہر نکلے تو سامنے سے
رگھو آتا ہوا دکھائی دیا۔ ان کا بیٹا اور بہو [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible]

"پرنام ماموں جی۔" رگھو نے ایک کر ان کے پاؤں چھوئے۔ وہی
میلا سا پاجامہ، میلی سی بنیان۔ اور ننگے پاؤں۔ اسے اپنے پاس
دیکھ کر ماموں کو ہمیشہ کی طرح گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ [illegible]
اس پر ترس آگیا۔ انہیں اس کی حالت [illegible] اور ان
[illegible]

رگھو ان کے پاس کھڑا تھا اور وہ اپنے پرس میں [illegible]
تلاش کر رہے تھے۔ [illegible]
[illegible]

[illegible] سوچا کہ سو روپے کا نوٹ
دے دیا تو بہت زیادہ ہو جائیگا۔ ماموں بٹوے کے اندر
جھانکتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ اور رگھو ان کو دیکھ رہا تھا۔
[illegible] روپے مانگ لوں۔ [illegible]
[illegible] وہ لوگ [illegible]
[illegible]
[illegible] بڑھا دیے۔

"یہ لے بیٹا۔"

رگھو نے دس دس کے تین نوٹ ان کے ہاتھ میں دیکھے
تو بولا۔

"ماموں۔ صرف تیس روپے! تیس روپے میں آج کل
کیا بنتا ہے ماموں۔ بڑی مہنگائی ہے۔ اور پھر آپ تو کچھ زیادہ

[باقی صفحہ [illegible] پر]



اکبر علی خاں عرشی زادہ

مژدہ باد اے کشتگاں تم سے بہم ہونے کو ہوں
میں بقدرِ حرفِ حق دنیا سے کم ہونے کو ہوں

روح کی اک جست نے رکھ لی بالآخر آبرو
وہم سا کچھ سر میں آیا تھا کہ خم ہونے کو ہوں

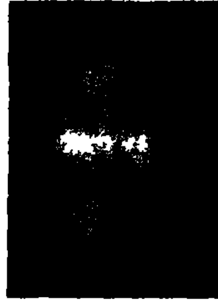
خود شناسی نے دکھائی ہے وہ راہ خود گری
میں اب اپنے آپ ہی اپنا صنم ہونے کو ہوں

آئینہ ہونے لگے ہیں مجھ میں سارے حادثات
گردشِ دوراں کے ہاتھوں جامِ جم ہونے کو ہوں

اپنا [illegible] ذات، اپنا [illegible]
ایسا لگتا ہے کہ جیسے خود میں ضم ہونے کو ہوں

میں جو کل دستِ عمل تھا اور کیسا ارجمند
دیکھ اب دستِ دعا ہوں اور قلم ہونے کو ہوں

پھلواری - رامپور - (یو۔پی)



زبیر شفائی

یہ [illegible] سے بگولے گئے سرخاب چلے آئے
جب ہم نے بلایا ہے یہ سیلاب چلے آئے

پل بھر کو بند ہوئی تھیں مری آنکھیں
تعبیر کہیں اور گئی خواب چلے آئے

اب میرے لیے ہو گیا پایاب سمندر
موتی نہیں پتھر بھی سرِ آب چلے آئے

میں نے طرفِ ماہ اڑائی تھی ہوائی
دامن میں کئی انجمِ شب تاب چلے آئے

ہم داخل ہوا اور میں طوفان سے ملاح
ساحل کی طرف گھوم کے گرداب چلے آئے

میں نے زبیر اک سانس بہت زور سے کھینچی
تابوت میں خود ساختہ احباب چلے آئے

۹/۱۲ رائٹ کالونی - جوہی - ۲ نوئیڈ



قمر نقوی

کچھ ایسی [illegible] تیز بیاں [illegible] میں
جتنے [illegible] سب آسماں میں ہیں

مدت ہوئی کہ سوکھ گیا صحن کا شجر
لیکن کئی پرندے ابھی آشیاں میں ہیں

شبہات سب انھیں سے ہیں دشمن کو آج بھی
دو ایک تیر جو مری ٹوٹی کماں میں ہیں

اب کیا شگفتِ گل کی سُنے کا صدا کوئی
سب نو دمیدہ غنچے صفِ کشتگاں میں ہیں

بہت ہے امیرِ شہر کے گھر [illegible]
[illegible]

اپنے ہی گھر [illegible] کے یہ شاداب بھی کچھ ہے
جس طرح سارے اور کسی کے مکاں میں ہیں

ممکن ہے ان سے پھر کبھی شعلے اٹھیں قمر
پنہاں کئی شرر ابھی اس خاکداں میں ہیں

6207 S. INDIANA POLIS
TULSA, OK 74136 U.S.A

محسن بھوپالی

محسن منزل ۵/۳ اے، ناظم آباد، کراچی۔ پاکستان

ہائیکو کی ہیئت کا مسئلہ

گذشتہ ربع صدی اور بالخصوص پچھلی ایک دہائی کے دوران میں جاپانی صنفِ سخن ہائیکو نے اردو میں جس تیزی سے مقبولیت حاصل کی ہے اس کی مثال پورا اردو ادب دینے سے قاصر ہے۔ آزاد نظم کو انیسویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے نصف تک یا یوں کہیے کہ عبدالحلیم شرر سے ن۔ م۔ راشد اور فیض احمد فیض تک پہنچنے اور ادب میں قبولِ عام کا درجہ حاصل کرنے میں کم و بیش ساٹھ برس کا عرصہ لگا۔ جب کہ ترائیلے اور سانیٹ اس صدی کی چوتھی دہائی میں متعارف ہوئے۔ اختر شیرانی، ن۔ م۔ راشد، [illegible] اور چند ایک شعرا نے ان پر [illegible] آزمائی کی۔ اور [illegible] دہائی تک آتے آتے یہ [illegible] ہو گئیں۔ لیکن اس کے برعکس بیشتر اردو شعرا چند [illegible] ہائیکو نگاری کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کی تعداد میں قابلِ قدر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ملک کے تقریباً سبھی اہم ادبی رسائل [illegible] نظموں میں ہائیکو بھی جگہ پا رہا ہے۔ اور [illegible] ہائیکو پر مشتمل متعدد شعری مجموعے بھی [illegible] جاپان کا [illegible] اردو ہائیکو مشاعرہ گذشتہ دس برس سے ہر سال منعقد ہو رہا ہے جس میں اردو کے اہم [illegible] شعرا کے ساتھ [illegible] بھی شرکت کرتے رہتے ہیں۔ ان مشاعروں [illegible] شائع ہو چکے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ایک اہم شعری روایت کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔

اردو میں ہائیکو نظموں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ہی بحیثیت صنفِ سخن اس کی ہیئت کے بارے میں وقتاً فوقتاً ادبی پرچوں میں [illegible] میں مضامین اور خطوط بھی شائع ہوتے رہے ہیں [illegible] کی علامت [illegible] ہائیکو کو [illegible] موضوعات اور [illegible] احمد علی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر وزیر آغا، [illegible] رشید امجد، [illegible] جمال، [illegible] رفعت اختر، ڈاکٹر بشیر سیفی، اور [illegible]

خصوصیت کے ساتھ تحقیق کرنے والے رفیق سندیلوی کی تحریریں قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب نے تقریباً بھرپور ہائیکو کی ہیئت کے بارے میں اپنے اپنے دلائل اور [illegible] ذریعہ اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہائیکو کی تعریف، ہیئت اور اس کے ارتقا کے بارے میں اپنی بات جاپان کے [illegible] دانشوروں سے شروع کروں۔ کوڈنشا انسائیکلوپیڈیا آف جاپان (ج ۳، [illegible]) میں ہائیکو کی تعریف اس طرح درج ہے۔

"ہائیکو سترہ رکنی [illegible] ۵-۷-۵ کے تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ [illegible] جاپانی شاعری کی اہم ترین صنف ہے جو آج کے جدید جاپان میں بھی مقبول ہے۔ اور پچھلے برسوں میں دیگر ممالک میں بھی اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ۔ ۔ ۔ جدید ہائیکو کی تاریخ کا آغاز ۱۸۹۰ء میں شیکی (۱۸۶۶ - ۱۹۰۲) کی اصلاحات سے ہوتا ہے [illegible] ہائیکو کو ایک جدا اور ممتاز صنفِ سخن کا درجہ حاصل ہوا۔ شیکی نے ہائیکو کی تبدیلی کے سلسلے میں جتنی بنیادی تصورات [illegible] بندش الفاظ اور [illegible] اپنی اصلاحات میں ہائیکو کے [illegible] سترہ ارکان کی [illegible] تین مصرعوں میں تقسیم اور موسم یا اس کی علامت کے ذکر کو جزو لازم [illegible] دیا۔"

درج بالا تشریح میں جس جاپانی شاعر اور ناقد شیکی کا ذکر کیا ہے اس کے نظریات اور اصلاحات کے بارے میں ہائیکو کے جدید عہد کے نقاد یاسودا نے اپنی کتاب "جاپانی ہائیکو" میں بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "شیکی ایک وقت تک اپنے نظریے پر قائم رہا۔ (یعنی ارکان کی [illegible]) لیکن وقت گذرنے کے ساتھ جب اس نے محسوس کیا کہ ہیئت کے بارے میں [illegible]

نے اجازت دی تھی۔ وہ اصل ہیئت سے بہت دور جا پڑی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایذرا پاؤنڈ نے محسوس کیا تھا کہ ایمی لاول نے مغرب میں نظم آزاد کی تحریک ایسی مضحکہ خیز رعایتوں کے ساتھ سہل انداز میں چلائی ہے۔ کہ نظم آزاد سے شاعرانہ ہیئت رخصت ہو گئی۔ (صفحہ ۲۵)

آگے چل کر اسی باب میں یاسو دا نے شیکی کے اپنے مذکورہ موقف سے ہٹنے کے بارے میں اس طرح تحریر کیا ہے۔ جیسا کہ یہاں کہا جا چکا ہے شیکی اپنے اصل موقف سے اس حقیقت کے پیش نظر ہٹ گیا کہ اس نے شعری ہیئت کے بگاڑنے کے پہلو کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان کے نئے اوزان میں کوئی وزن نہیں ہے۔ اور اس طرح وہ نثری آہنگ کے قریب چلا گیا ہے۔ وہ بے وزنیک (ناشائستہ، غیر دلچسپ) ہو گیا ہے۔ پھر بھی ۲۲ سے ۳۰ ارکان میں پابند ہے۔ اور پورے طور پر اپنے آپ کو تعریف سے الگ نہیں کر سکا۔ اس طرح کی تحریروں کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں جسے نیا وزن کہا جاتا ہے۔ وہ محض ایک عارضی اور اتفاقی تحریک ہے۔ جو زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتی۔ وہ ہائیکو کی صرف ایک بے قاعدہ ہیئت ہے۔ . . . . یہ بہت ترقی یافتہ شکل ہو یا انحطاط یا رجعت قہقری کی مظہر ہو یا بگاڑ کی بہر صورت کسی بھی قیمت پر مستقل طور پر برقرار نہیں رہ سکتی۔ شیکی نے محسوس کیا کہ ہائیکو میں پیچیدگی کا امکان ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔ اس امر سے قطع نظر کہ ہم اپنے شعروں کو پیچیدہ اور تہہ دار بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ یا ان کے ذریعہ کتنا ہی واضح تصور پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم آخر کار پر فیکشن تک محدود ارکان میں رہتے ہوئے ہی پہنچ سکتے ہیں۔ صرف سترہ یا اٹھارہ ارکان (صفحہ ۲۹)

اسی صفحہ کے آخری پیراگراف میں یاسو دا لکھتا ہے بالآخر ہائیکو کی سترہ ارکان کی روایتی طوالت کو تبدیل کرنے کی تمام کوششیں رائیگاں ثابت ہو چکی ہیں۔ اور اب ہائیکو کی سترہ رکنی نظم کی بنیادی تحریک کو سنجیدگی کے ساتھ چیلنج نہیں کیا جاتا۔" آگے چل کر یاسو دا نے اپنے اس بیان کی تائید کے طور پر عہد حاضر کا بھی حوالہ درج کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "شاید اسی سے موجودہ عہد کے عظیم ہائیکو شاعر کیوسی تاکا ہاما نے ہائیکو کی مستقل حیثیت کی بنیادی وجہ کے بارے میں اپنے ایک سادہ اور واضح بیان میں کہا ہے" میرے نزدیک فکر کا مخصوص ہیئت میں اظہار ایک تکنیک ہے۔ یہ تکنیک بذات خود ایک دوسرے کو منتقل کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے..... لوگ عام طور پر ہائیکو کی سترہ رکنی حیثیت کو ہی تسلیم کرتے ہیں۔ جو ۵، ۷، ۵ کی ترتیب میں تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

وہ اپنے احساسات اور جذبات کو آپس میں ہائیکو کے اس نظام میں ظاہر کرنے اور پسند کرتے ہیں چنانچہ میرا ایقان ہے کہ منجملہ دیگر اہم وجوہ کے یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ شعری دنیا میں ہائیکو اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہے۔" (ص ۴۰)۔

ہائیکو کی اپنی اصلی زبان میں ہیئت، موضوع اور مزاج کے بارے میں بنیادی معلومات کے بعد اردو میں اس صنف سخن کی ہیئت کے تعین سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ فرانسیسی اور انگریزی زبان سے اردو زبان میں در آنے والی اصناف مثلاً آزاد نظم ترائیلے اور سانیٹ وغیرہ کے فارم اور مزاج کے بارے میں اردو شعراء کا رویہ کیا رہا ہے۔

شعری ادب کے سرسری جائزے سے ہی اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اکابر شعراء سے لے کر عہد حاضر کے معتبر شعراء تک نے ان اصناف کی اصل ہیئت کو اردو میں نہ صرف برقرار رکھا ہے، بلکہ ترائیلے اور سانیٹ میں مصرعوں کی تعداد اور قوافی کے التزام کی تقلید کرتے ہوئے موضوعات کے تنوع اور زبان و بیان کی ان مراعات کا بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ جو ہماری پابند نظموں کیلئے شعریت اور زبان و بیان کے لطافت کے نام پر شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔

چنانچہ روایت کے تسلسل میں ہم جاپان سے در آمد ہونے والی اس صنف سخن کی ہیئت اور مزاج کو اردو میں برقرار رکھتے ہوئے ہی ہائیکو کا نام دے سکتے ہیں۔ ورنہ اسے مختصر نظم کا نام ہی دیا جائے جس کا تجربہ آج سے تقریباً نصف صدی پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ مختصر نظموں کا یہ تجربہ اردو ادب میں تیسری اور چوتھی دہائی میں کیا گیا تھا۔ اور محمود جالندھری نے تو اپنی اس مختصر نظم پر مشتمل پورا مجموعہ "مختصر نظمیں" کے نام سے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے مختصر ترین نظم اور تین مصرعوں والی چند نظمیں درج کی جاتی ہیں۔

بارش!

بوندیں ہیں کہ گندم کے برستے ہوئے دانے

بڑھاپا

تو کیا جانے تیرے سر پر
وقت کا چرخا گھوں گھوں کرتا
کاٹ رہا ہے بال سفید

امید شکستہ

اک اور ناؤ کنارے پہ بھر کے ڈوب گئی

امید تھی دے سمندر کی موج کف آلود
اُن سے بنتے ہوئے اور بکھرتے ذرے

مندرجہ بالا صراحت کی روشنی میں ہائیکو کی ہیئت طے کیا جانا نہایت ضروری ہے۔ ہائیکو کے پانچ سات پانچ کے طلسم سے مقابل اردو میں مندرجہ ذیل وزن تجویز کیا ... جن پر ... اردو ہائیکو پر تحقیق کرنے والوں نے اتفاق کیا ہے۔ جن میں پروفیسر محمد علی زیدی، ... محمد امین احمد، رفیق سندیلوی وغیرہ شامل ہیں۔ وزن کی تقطیع ملاحظہ ہو۔

آ وا رہ پت تے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کل یہ کون چلے
[illegible] ۵

(تقطیع کرتے ہوئے ہ یا نون غنہ کا وزن نہیں لیا جاتا۔ لیکن ... ملاحظہ کے لئے ... دیا گیا ہے۔)

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون اردو ہائیکو منظر پیش منظر (مطبوعہ ... ۱۹۸۰ء) میں ہائیکو کی بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ "وہ لکھتے ہیں ... کوئی ... ہو ... زبان سے ... اب ... سارا ... اور صفات باقی رہی ہیں اور یہی اپنی انفرادیت اور پہچان اور اس کی علامت بن گئی ہیں۔ ... اردو ہائیکو ... اردو شعراء کا ... عمل اس سے بہت مختلف ہے ... کہ اردو ہائیکو ... جاپانی ہائیکو سے ... ہیئت ... اردو ... تک ... جاپانی ہائیکو کے ... مماثلت نہیں رکھتیں۔ جاپانی ہائیکو کے دوسرے رموز و نکات کو جانے دیجئے ... تو یہی جانتے ہیں کہ اس کی بہت نمایاں شرائط مختصراً حسب ذیل ہیں۔

جاپانی ہائیکو کا خاص وزن و آہنگ مقرر ہے۔ یہ وزن و آہنگ کئی ارکان پر مشتمل ہوتا ہے یعنی پہلا اور تیسرا مصرع پانچ پانچ صوتی آہنگوں اور دوسرا مصرع سات آہنگوں سے بنتا ہے۔ اردو میں بحر متقارب سے اس کے وزن و آہنگ کو اس طور پر ظاہر کر سکتے ہیں:

فعلن، فعلن، فع ۵
فعلن، فعلن، فعلن، فع ۷
فعلن، فعلن، فع ۵

موضوعات و اختیارات ہائیکو کا تعلق عموماً مناظر فطرت، اور موسموں کی خوشگواری اور رومانی طبیعتوں کی جمال پرستانہ امنگوں پر ہوتا ہے۔ ان خصوصیات ... اور ... کے ساتھ اگر ہائیکو کی ہیئت فی الواقع اردو میں ... آ گئی ہے۔ ... نظم کو ہائیکو کا نام دیا جا سکتا ہے ... کا ذکر ... گیا ہے۔"

ہیئت ہی کے موضوع پر ... نظر سے رفیق سندیلوی کا ایک مضمون گزرا، جو حریر کے سالنامہ ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے "اردو ہائیکو کی ہیئت کا تعین" پر سیر حاصل اور تفصیلی بحث کرتے ہوئے آخر میں اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا ہے۔

"اس ساری بحث کی روشنی میں اردو ہائیکو کی ... ہیئت کا تعین ... ہو جاتا ہے ... جاپانی ہائیکو ... اردو ہائیکو کی ... ہو سکتی ہے کہ ایک ہی لے یا آہنگ کی حامل ایسی ... مقفیٰ یا غیر مقفیٰ ہیئت جو پانچ سات پانچ کی ترتیب سے سترہ اسباب پر مبنی ہو۔" ہیئت سے قطع نظر رفیق سندیلوی نے اپنے اس مضمون میں جاپانی ہائیکو کو اردو روپ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہ اردو شاعری کی ایک صنف ... قرار دیا ... ان کے اس موقف سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن زیر نظر مضمون اس کا متقاضی نہیں ہے۔ بہرحال مذکورہ بالا ... سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پانچ سات پانچ ... اسباب ... بحر متقارب میں ... ہائیکو جاپانی ہائیکو کی ہیئت کے تقاضے پورے کرتا ہے اور اردو میں بھی ہیئت ہائیکو کی پہچان بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں تین مساوی الاوزان مصرعوں پر مشتمل ہائیکو لکھنے والے جن میں عذرا ... نسیم ... بشیر سیفی اور رفیق سندیلوی نے اپنے موقف پر نظر ثانی کرتے ہوئے پانچ سات پانچ کی پابندی

[باقی صفحہ ۲ پر دیکھئے]



شبنم مناروی

حجاب اندر حجاب

خواب میں ڈرتے ہو تم!
خواب آدھی زندگی ہیں۔ زندگی کے ہم نوا
جسم کے اعضا کے محوِ خواب ہونے کے عجب انداز ہیں
چند سو جاتے ہیں کچھ بیدار رہتے ہیں بڑی ترتیب سے
خواب بیداری کے رشتے سے عبارت ہیں سبھی
خوبصورت ساعتوں کا بھی یہی انداز ہے
خوف گرنے کا، بدن سے وحشتوں کا سابقہ
دشمنوں کے وار، اپنوں کی قرابت داریاں
بے محابا جسم کی طاقت، حجاب و انفعال
پانیوں کے ساتھ سائے کا تعلق گاہے گہرا، گاہے تیز
سانپ بچھو، جن۔ حسیناؤں کا ساتھ
جسم سے باہر تعلق جسم کا
موت کی دہشت، جزیرے، بارشیں
گاہے اڑنا، گاہے شل اپنا وجود
ہم کبھی خوش اور کبھی غمناک ہیں
جسم بیداری کے عالم میں بھی جب کھونے لگے
خواب میں جب خواب کا ادراک سا ہونے لگے
زندگی پاکیزگی کی آرزو کرنے لگے
اپنے خوابوں کو بنا لیں داستانِ زندگی
خواب کے پردوں سے پھر باہر نکل آؤ گے تم!!

● پوسٹ بکس ۴۰۲۷۰، ریاض ۱۱۴۱۷ (سعودی عرب)



جمیل الرحمٰن

جلاوطن

روز شام ہوتے ہی
لوگ جب پلٹتے ہیں
دوسرے دیاروں سے
سوگوار پیڑوں کے
ہونٹ کپکپاتے ہیں
کتنے زیرِ لب جملے
راہ بھول جاتے ہیں
چیختے ہیں دروازے
گونجتی ہیں دیواریں

پتھروں کی بارش میں
جس نے شہر چھوڑا تھا
آج بھی نہیں لوٹا

KORMELINK WEG - 44
1104 NS-AMSTERDAM, HOLAND ●



فیاض رفعت

عقیدتیں

تم اکیلی تنہا
نیم روشن کمرے میں
دھڑکتے دل کے ساتھ
لفظوں کی روشنی کو
اپنے ذہن و دل کے چاند نگر میں
اتار رہی تھیں
عقیدتوں سے سنوار رہی تھیں
یہ جانے بغیر یہ سوچے بغیر
کہ عقیدتیں
نئے موسم کی طرح
وقت کی دھول میں
کھو جاتی ہیں۔

● اسٹیشن ڈائریکٹر، آواز دوستی، پالی گڈ



معرفت روزنامہ اردو ٹائمز۔ مولانا آزاد روڈ۔ بمبئی ۸

راکھ

(فرحت شہزاد کے نام)

بیماری اور موت مل کر بھی شمع کے چہرے کی کشش کو ختم نہیں کر سکے۔

جمال نے فرش پر رکھی ہوئی لاش کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ شمع کا مردہ جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ صرف چہرہ کھلا تھا۔

شمع کی گھنی سیاہ پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ ایک ٹک اس کے سرخ و سفید چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ شمع نے پیالی اٹھا کر کافی کا ایک گھونٹ لیا لیکن اس کی پلکیں بدستور جھکی رہیں:

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ میز پر تھوڑا جھک گیا۔ "میں بہت سیریسلی کہہ رہا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں:"

جمال نے شمع سے کل بھی یہی بات کہی تھی۔ لیکن شمع نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ صرف جھرجھری لے کر رہ گئی تھی۔ جمال کی اس خواہش کو سن کر وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ شادی کے اس تصور ہی سے اسے بخار سا ہو جاتا تھا جیسے ساری دنیا کی عورتیں تحفظ سمجھتی ہیں۔ "بابا کو اگر پتہ چل گیا کہ ایک مسلمان لڑکے سے وہ شادی کرنا چاہتی ہے تو..... سوچ کر ہی وہ کانپ جاتی تھی۔ دو برس قبل جمال سے اس کی ملاقات ایک فوٹوگرافی ایگزی بیشن میں ہوئی تھی۔ جسے تین ایسچر فوٹوگرافرز نے مل کر ترتیب دیا تھا۔ شمع کو ایک تصویر بے حد پسند آئی تھی جس کا عنوان تھا۔ "زندگی"۔ جس میں ایک سی گل کو سمندر کی بپھری موجوں سے کچھ اوپر پرواز کرتے دکھایا گیا تھا۔

شمع نے جب ایگزی بیشن کے ناظم سے اس فوٹوگرافر کے بارے میں پوچھا۔ تو اس نے چشمہ لگائے ایک سانولے سے نوجوان کی طرف اشارہ کیا تھا جس نے ایک ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ وہ ایک عورت سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ جمال کو ایک عمدہ تصویر پر مبارکباد دینے کا خیال ترک کر کے وہ جب گیلری کی سیڑھیاں اترنے لگی تب اس نے سوچا کہ یہ فنکار کی ناقدری ہے۔ وہ لوٹ کر ایگزی بیشن ہال میں آ گئی تھی۔ اور اس عورت کے جانے کا انتظار کرنے لگی تھی جو اپنی سوتی ساڑی سیلویس بلاؤز اور ہینڈلوم کے جھولے کی وجہ سے کوئی آرٹ کریٹک معلوم ہو رہی تھی۔ اس عورت کے چلے جانے کے بعد شمع نے جمال کے قریب جا کر اپنا تعارف کراتے ہوئے تصویر کی تعریف کی تھی۔ دوران گفتگو اس نے بتا دیا تھا کہ جے جے اسکول آف آرٹس میں انسٹرکٹر ہے اور ملازمت کا یہ اس کا پہلا سال ہے۔ دوسرے روز جمال نے جے جے اسکول میں جا کر شمع کو وہی تصویر تحفے میں پیش کی تھی۔ دونوں کی رسمی ملاقاتیں دوستی اور دوستی جلد ہی محبت میں بدل گئی تھی۔

"جمال اگربتیاں کہاں ہیں؟" جمال نے گردن گھما کر دیکھا اس کا فوٹوگرافر دوست منوج تھا۔ جمال نے وال کیبنٹ سے اگربتی کا پیکٹ نکال کر منوج کو دیا۔ منوج نے اگربتیاں شیشے کے ایک گلاس میں ڈال کر شمع کے سرہانے سلگا کر رکھ دیں۔ دھواں دھیرے دھیرے بل کھاتا ہوا فضا میں ایسے تحلیل ہونے لگا جیسے کمرے کے بوجھل ماحول سے وہ بھی افسردہ ہو۔ منوج نے جمال کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم نے اپنے ڈیڈی کو خبر کر دی ہے؟"

جمال نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور شمع کے بابا کو؟" جمال نے سر جھکا دیا۔ شمع کے بابا کو اس نے دادر ہندو کالونی میں خود جا کر خبر دی تھی۔ انہوں نے شمع کی موت کی خبر ایک سنگین خاموشی کے ساتھ سنی تھی۔ اور اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر لیا تھا۔

"شمع اور میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔" جمال کے اس جملے پر شمع کے بابا نے اپنے جینؤں میں انگوٹھا ڈال کر اسے دو بار اوپر نیچے کیا۔ اور پھر موٹے چشمے کے پیچھے سے اسے گھورتے ہوئے بولے۔

"تم جانتے ہو ہم لوگ چترویدی برہمن ہیں۔ میرے پتا جی پونے میں اس عمر میں بھی جنم کنڈلی اور ہتھیلی کی ریکھائیں پڑھتے ہیں۔ اور تم ایک انصاری

مسلمان ... جمال اس سوال کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ اس نے فوراً کہا۔ میں دھرم بدل لوں گا۔ جمال کے اس جواب نے کچن میں ماں کے ساتھ چھپ کر دونوں کی باتیں سن رہی شمع کے دل کے بوجھ کو کم کر دیا۔

"کوئی بھی غیر ہندو ہندو نہیں بن سکتا۔"

"اور اگر میں آریہ سماجی طریقے سے ہندو بن جاؤں کیا تب بھی آپ مجھے سویکار نہیں کریں گے؟"

"نہیں کبھی نہیں" بابا نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ "کون کس دھرم میں پیدا ہوگا یہ ایشور کی اِچھا سے ہوتا ہے۔ انسان کی مرضی سے نہیں۔"

دوران گفتگو شمع کی ماں نے جمال کے لئے اپنی چھوٹی بیٹی کے ہاتھ سے جب اسٹیل کے گلاس میں پانی بھجوایا۔ تو بابا نے بڑی ملائمت سے لڑکی سے کہا۔ شیشے کے گلاس میں پانی لاؤ۔ جمال پانی پئے بغیر ہی وہاں سے اٹھ کر چلا آیا تھا۔ دوسرے روز جمال کو شمع نے بتایا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اسے پہلی بار پتہ چلا کہ بابا مسلمانوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے "اگر کسی چمار کے ساتھ بھی بھاگ جاتی تو مجھے اتنا دکھ نہیں ہوگا جتنا ایک ملیچھ کے ساتھ شادی کرنے سے ہوگا۔" کہتے ہوئے شمع رو پڑی تھی۔ "میں تمہیں نہیں کھونا چاہتی جمی۔" ہچکیوں سے اس کے کندھے ہلنے لگے تھے۔

اسی روز جمال نے اپنی والدہ کو شمع کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو خاموشی سے اپنے جوان بیٹے کے اتنے بڑے ارادے پر غور کرتی رہیں۔ پھر کہا۔ "اگر وہ مسلمان ہو جاتی ہے۔ تو میرے خیال میں تمہارے ابو کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" جمال دس بارہ دنوں تک شمع سے روز ہی ملتا رہا۔ لیکن مذہب تبدیل کرنے کی تجویز اس کے سامنے رکھنے کی ہمت وہ اپنے میں نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک روز [illegible] ریسٹورنٹ میں جمال نے کھانے کے لئے شمع کو پوچھا تو اس نے یاد دلایا کہ آج اس کا منگل وار کا برت ہے۔ وہ صرف لیمو پانی لے گی۔ جمال نے کوفی ختم کر لی لیکن وہ اپنا منشا بیان نہ کر سکا۔ شمع نے لیمو پانی کے گلاس پر ابھر آنے والے ابخرات کی بوندوں کو انگلی سے پھیلاتے ہوئے کہا۔ "میرے بابا تمہارے ہندو ہو جانے کے بعد بھی تمہیں سویکار کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ تو میں نے [illegible] فیصلہ کر لیا ہے۔ میں ہی مسلمان ہو جاتی ہوں۔"

وہ سوچ بھی [illegible] تھا کہ [illegible] اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی کر لے



گی۔ شمع نے ایک روز خاموشی سے بدن کے کپڑوں کے ساتھ گھر اور مذہب دونوں کو چھوڑ دیا۔ جامع مسجد میں کلمہ پڑھ کر وہ "شمع گپتا" سے شمع جمال ہو گئی۔ مسجد ہی میں جمال اور شمع کا نکاح ہوا تھا۔

جمال کی بڑی بہن نے کمرے میں شمع کے مردہ جسم کو دیکھتے ہی ایک دبی دبی چیخ ماری۔ اور جمال سے لپٹ کر رونے لگیں۔ جمال کی آنکھیں خشک تھیں لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سینے میں کوئی وزنی پتھر رکھا ہوا ہو۔

"یہ کیسے ہو گیا جمال؟ ...." وہ روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔

"خدا کو یہی منظور تھا آپی، حوصلہ رکھئے۔"

بڑی بہن نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کر کے اپنی والدہ کے بابت دریافت کیا۔ کہ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچیں۔ پھر اس نے مراٹھی ترجمہ والے قرآن کو کپ بورڈ سے اتارا اور شمع کے قریب بیٹھ کر دھیمی آواز میں تلاوت کرنے لگی۔ شمع عربی تو نہیں پڑھ سکتی تھی البتہ کبھی کبھار قرآن کا مراٹھی ترجمہ ضرور پڑھا کرتی تھی۔

جمال کو اس درمیان نتاس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں سینئر فوٹو گرافر کا جاب مل گیا تھا۔ ایجنسی نے ہی اسے بوریولی میں سنگل روم کا ایک فلیٹ الاٹ کر دیا تھا۔ جو میاں بیوی کیلئے کافی تھا۔ وہ اس فلیٹ میں شمع کے ساتھ منتقل ہو گیا تھا۔ لیکن ہفتے کے روز دونوں محمد علی روڈ جمال کے والد کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ شمع نے ایک روز سوچا کہ اتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ بابا نے بھی آئی (ماں) نے تو اس کو معاف کر دیا ہوگا۔ وہ جمال کو بتائے بغیر کالج سے فارغ ہو کر دادر ہندو کالونی پہنچ گئی۔ "دروازے پر کھڑی بیل بجاتی رہ گئی لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔" شاید آئی ہول سے اسے دیکھ لینے کے بعد ایسا کیا ہو۔ اس کے بعد اس نے پھر کبھی ماں کی دہلیز کا رخ نہیں کیا۔

شمع نے خود کو جمال کے گھر کی تہذیب کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کی تھی۔ رمضان کے روزے اس نے پہلی بار رکھے۔ لیکن منگل وار کے برت کا اس کا معمول برقرار رہا۔ جمال جب تک گھر نہیں آجاتا۔ وہ کھانا نہیں کھاتی تھی۔ اس نے یہ عادت اپنی آئی سے پائی تھی۔ آئی کہا کرتی تھی۔ پتی پرمیشور ہوتا ہے پتنی کو اس سے پہلے کھانا نہیں کھانا چاہئے۔ جمال نے اسے کئی بار سمجھایا کہ ان کے یہاں اس قسم کی کوئی تہذیب نہیں ہے۔ اسے وقت پر کھانا کھا لینا چاہئے۔ لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتی۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ [illegible]

بنتی ہے۔ تو اس میں پہلے جیسی کشش نہیں رہ جاتی۔ لیکن شادی کے بعد بھی دونوں کی محبت میں نہ صرف شدت آگئی تھی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورا محسوس کرتے تھے۔

کمرے میں شمع کے بے جان جسم کے قریب ہی باجی اور کچھ دوسری رشتے دار عورتیں اور بچیاں قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں۔ ابو اور امی بھی پہنچ گئے تھے۔ امی تو شاید راستے بھر روتی رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی جمال کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا جیسے اس کے سینے کا سارا درد اپنے کلیجے میں اتار لینا چاہتی ہوں۔ تب بھی اس کی آنکھیں خشک ہی رہیں۔

"بیٹے غسالہ کو میں نے خبر کر دی ہے۔ وہ بس آتی ہی ہوگی۔" انہوں نے اپنی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ابو دروازے کے قریب صوفے پر دوسرے لوگوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اپنی بہو کی ملنساری اور سگھڑاپن کی تعریفیں کر رہے تھے۔ رمضان کے مہینے میں پورے سارے روزے رکھے اور پانچوں وقت نماز ادا کی۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ غیر قوم سے آئی ہے۔ میت میں آنے والے بھی مرحومہ کی انہیں صفات پر تعریفی کلمات ادا کر رہے تھے۔

گزشتہ ایک مہینے سے شمع کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی ڈاکٹر نے یرقان تشخیص کیا تھا۔ بیماری کے سنگین نتائج بھی نکل سکتے ہیں یہ بھی بتا دیا تھا۔ کیوں کہ شمع امید سے تھی۔ جمال نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی یہ بیماری اتنی خطرناک ثابت ہوگی۔ ورنہ وہ دفتر سے چھٹی لے کر خود ہی اس کی نگہداشت کرتا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے بیماری کے دنوں میں بھی شمع کو منگل وار کا برت رکھنے سے نہیں روکا۔ دو تین روز قبل شمع کو دن میں چار پانچ قے ہوئی تو وہ روہانسی ہو گئی اس نے جمال سے کہا "دیوالی میں بھی اپنے بابا اور ماں کا آشیرواد لینے نہیں گئی تھی۔ شاید اسی کا پاپ ہے۔" جمال نے اس بات پر اسے بہت بری ڈانٹ پلائی تھی کہ وہ پڑھی لکھی ہو کر اس طرح کے وہم رکھتی ہے۔ اس نے کہا تھا "وہم ہے یا حقیقت میں نہیں جانتی لیکن پنر جنم میں میرا وشواس ضرور ہے میری اوپر والے سے یہی پرارتھنا ہے کہ دوسرے جنم میں بھی وہ مجھے تمہارا ہی پتنی بنائے۔" اس جملے پر جمال نے بے اختیار بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

کل رات اچانک ہی شمع کی طبیعت بگڑ گئی ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن اور دوائیں دے کر اس خدشے کا اظہار ضرور کر دیا تھا کہ یرقان اپنے آخری اسٹیج پر ہے اس لئے شمع کو کل سویرے ہی کسی اچھے اسپتال میں داخل کروانا بہت ضروری ہے۔ جمال نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ساری رات کاٹ دی تھی۔ انجکشن کی وجہ سے شمع گہری نیند ضرور سوئی۔ لیکن صبح جاگنے کے بعد اس کی حالت پھر بگڑ گئی۔ شمع کی ایسی حالت دیکھ کر جمال بے حد نروس ہو گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو فون کیا لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی شمع بجھ گئی تھی۔

"بیٹے تمام لوگ آ چکے ہیں۔ غسالہ نے میت کو غسل بھی دے دیا ہے۔" ابو جمال کو قریب بلا کر بولے۔ "دفن کے لئے کیا سوچا ہے مغرب بعد یا عشاء بعد؟"

انہیں جواب دینے کے بجائے جمال شمع کی لاش کو دیکھنے لگا۔ جسے غسل کے بعد کفن پہنا کر دیدار کے لئے رکھا گیا تھا۔ غسل کے بعد چہرہ اب اور نکھر آیا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ ابھی اٹھ کر کہے گی "ارے مجھے جگایا کیوں نہیں؟" اکثر چھٹی کے روز جمال پہلے اٹھ جاتا تو خود ہی چائے بنا کر پی لیتا۔ شمع کو گہری نیند سے جگانے میں اسے اس لئے تکلف ہوتا تھا کہ وہ ہفتہ کے چھ روز بڑے سویرے اٹھ کر گھر کے کام کاج میں جٹ جاتی تھی۔ اسے دفتر بھیجنے اور کالج جانے کی تیاری میں اسے کافی وقت لگتا تھا اس لئے تمام دنوں میں نہ چاہتے ہوئے سویرے اٹھنا اس کی مجبوری تھی۔

"مہرہ صاحب نے کہا ہے کہ ایجنسی کی طرف سے شمع کا ایک OBITUARY ٹائمز آف انڈیا میں دی جائے؟"

سورج نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

جمال نے کاغذ پر نظر ڈالی۔

شمع، جمال

تاریخ پیدائش: ۸ اپریل بروز بدھ ۱۹۶۹ء۔

تاریخ وفات: ۶ جون بروز منگل ۱۹۹۵ء۔

جمال کی نگاہ تاریخ وفات پر آ کر ٹھہر گئی۔ اوہ آج منگل وار ہے۔ شمع کی برت کا دن! شمع نے اسے بتلایا تھا کہ ہر منگل وار کو گنیش جی کا برت میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے رکھ رہی ہوں۔ کبھی ناغہ نہیں کیا۔ اس نے بڑے فخر سے کہا تھا شمع کی آواز کی بازگشت دیر تک جمال کی سماعت میں جاری

رہی۔

"جمال میاں تم نے بتایا نہیں تدفین کب ہوگی؟" ابوجی نے دوبارہ اسے یاد دلایا۔ جمال نے نم آنکھوں سے شمع کی لاش کی طرف دیکھا۔ سرہانے اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ دھوئیں کی نیلی لکیریں فضا میں دھیرے دھیرے رینگ رہی تھیں۔ امّاں اور باجی تلاوت کر رہی تھیں۔

"شمع کو قبرستان نہیں شمشان لے جانا ہے۔"

"ہیں!!" جمال کے اس جواب پر ابو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ چند ثانیوں تک وہ بیٹے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ جو فرطِ جذبات سے لرز رہا تھا۔ پھر انہوں نے شمع کی لاش کو غور سے دیکھا۔ اور غصّے سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کیا یہ مرنے کی اپنی خواہش تھی۔۔؟"

"نہیں۔ اس کے اور میرے درمیان اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہوئی۔ اور پھر اتنی جلدی یہ سب کچھ ہو جائے گا ہم نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔"

"دیکھو میاں وہ مسلمان ہو چکی تھی۔ اس نے کلمہ پڑھا تھا۔۔۔" ابو دانتوں کو بھینچ کر سخت لیکن دھیمی آواز میں بولے "اس نے میرے مذہب سے متاثر ہو کر اپنا مذہب نہیں بدلا تھا۔ مجھے حاصل کرنے کے لئے اس نے مذہب تبدیل کرنے کی رسم ادا کی تھی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو۔؟" ابو کی آواز غصّے سے بلند ہو گئی۔ کمرے اور راہداری میں موجود تمام لوگ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں کہہ چکا ہوں جو مجھے کہنا ہے۔ میں اس کی آتما کو سکون پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"کیا جلانے سے اس کی آتما کو سکون مل جائے گا؟" ان کا لہجہ اتنا ہی اتنا ہی تیز اور تلخ تھا امی اور باجی کلام مجید رحل پر بند کرکے باپ بیٹے کے قریب چلی آئیں۔

"ابو ذرا سوچئے شمع نے میرے لئے مذہب بدل دیا تو میں اس کی آتما کو سکون پہنچانے کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتا۔"

امی اور باجی نے اسے خدا کا واسطہ دے دے کر سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔ "شمع کی آتما کو داہ سنسکار سے ہی سکون ملے گا۔"

ابو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے اور امی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے سیڑھیوں سے دھم دھم کرتے ہوئے اتر گئے۔ باجی کچھ لمحوں تک اس کا منہ تکتی رہیں۔ پھر شمع کے بے جان چہرے پر ایک نظر ڈال کر برقعہ پہنتے ہوئے وہ بھی چلی گئیں۔ ایک ایک کرکے سارے رشتے دار اور شناسا اپنی خشمگیں نگاہوں کی حدّت کو کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف اگربتیوں کا دھواں اذیت ناک خاموشی کے ساتھ پٹ کر گریہ کر رہا تھا۔

سورج کی دستک پر دروازہ کھلا سامنے شمع کے بابا کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے آنٹی منہ پہ پلو دبائے ایسے کھڑی تھیں جیسے رو پڑیں گی۔ بجھے ہوئے چہرے اور دھندلی آنکھوں سے انہوں نے جمال کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ جمال نے پیتل کی ایک چھوٹی سی کلسی جس کے منہ پر سرخ کپڑا بندھا تھا۔ بابا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں آپ کی بیٹی کو لوٹانے آیا ہوں۔"

بابا نے کلسی کی طرف کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ آنٹی دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ اور جمال کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا آنسوؤں کا سیلاب بھی بہہ نکلا۔ ❁

بقیہ صفحہ ۲۰ ہائیکو کی ہیئت کا مسئلہ

کے ساتھ کامیاب ہائیکو لکھے ہیں۔ اور راقم الحروف کو لکھے گئے خطوط میں اس تبدیلی کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ہائیکو کے ایک اور اہم شاعر دنفا دھرامن نے بھی ذاتی ملاقات میں ہائیکو کی ہیئت کے بارے میں مندرجہ بالا موقف کی تائید کی ہے۔

یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ ہر صنفِ سخن کی پہچان اس کی ہیئت ہی ہوتی ہے جس طرح ہم ہر چار مصرعے کی نظم کو رباعی نہیں کہہ سکتے۔ بالکل اسی طرح ہر تین مصرعے کی نظم کو ہائیکو نہیں کہا جا سکتا۔ ❁

بقیہ صفحہ ۳۴ — حراست

کیے جا رہے تھے۔ دف بج رہی تھی۔ عود اور لوبان کی خوشبو فضاؤں میں بکھر رہی تھی، اور — اور دور کہیں قید خانے کا دروازہ پھر کھل رہا تھا۔ ❁

ترسیلِ زر کا پتہ:

Shair' Monthly
302-228 [illegible] Building,
PB [illegible] Bombay 400 004.



عبدالحمید

رستے ہی اِن مرجائیں تو کیا ہوگا
اور سلامت گھر جائیں تو کیا ہوگا

نیش زنِ دل ۔ وہ تو اپنے اندر ہے
چھوڑ کے گھر باہر جائیں تو کیا ہوگا

جن کے قریب آنے سے دل ڈرتا بھی ہے
دور ہی دور گذر جائیں تو کیا ہوگا

سارا دھیان اسی جانب کیوں رہتا ہے
آنکھ سے یہ منظر جائیں تو کیا ہوگا

جیت بھی لیں ساری دنیا تو کیا ہوگا
اور یہ بازی ہر جائیں تو کیا ہوگا

ہمیں سمندر دور سے کھینچا رہتا ہے
کبھی جو ساحل پر جائیں تو کیا ہوگا

شعبۂ اردو، گورنمنٹ رضا پی جی کالج ۔ رامپور



ارمان نجمی

اکیلے حوصلے کا ماجرا لکھا ہوا ہے
بلندی پر کسی کا نقشِ پا لکھا ہوا ہے

ہزیمت خوردگاں کو جس نے صف آرا کیا تھا
ہر اک رخ پر وہ سحر بے صدا لکھا ہوا ہے

طلسم نور سے معمور ہو جاتی ہیں آنکھیں
در و دیوار میں کیا معجزہ لکھا ہوا ہے

نکالی اس نے کیسی راہ جس کے پیچ و خم تک
دیارِ خود شناسی کا پتہ لکھا ہوا ہے

تمہاری دسترس میں کیا ہے خود ہی دیکھ لوگے
گذرتے وقت کا جو فیصلہ لکھا ہوا ہے

دھندلکوں کا نوشتہ سامنے کیا پڑھ رہے ہو
پسِ دیوار حرفِ آئینہ لکھا ہوا ہے

ہوا سے برسرِ پیکار رہ کر سانس لینا
چراغِ رہگذر کا مرتبہ لکھا ہوا ہے

پوسٹ بکس ۹۴۴ ۔ جیزان (سعودی عرب)



ساجد حمید

جگنوؤں کو گھپ اندھیروں میں اچھال
زندگی بن جائے گی ورنہ وبال

چاہے پی لے یا ملا دے خاک میں
میں تری آنکھوں میں ہوں شبنم مثال

منجمد احساس کو سیّال کر
ورنہ دھندلا جائے گا روئے خیال

کیا فسردہ ہی رہے گی شاخِ دل
کیا گذر جائیں گے یونہی ماہ و سال

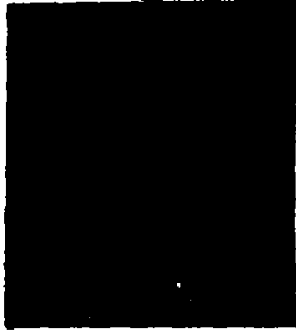
اس کی چپ مجھ کو پشیماں کر گئی
گو بہت آسان تھا میرا سوال

چاند اترے گا ہماری چھت پہ جب
ہم بھی کہلائیں گے ساجد باکمال

سوائی پلیا، شموگا ۵۷۷۲۰۱ کرناٹک

نیر جہاں

1721 MILL STREET. SUITE 14
SANTA MONICA, CA 90405 U.S.A



سیامیز ٹوئنس

ظہیر علی کی وفات کے چھ ماہ بعد بھی جب اس کے ذکر پر سارا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تو حبیبہ علی کے ذہن میں پہلی مرتبہ پھنکارتے ہوئے سانپ کی طرح ایک خیال نے سر اٹھایا۔

آج بھی روز کی طرح شام ہی سے سارا اس کے پاس آ گئی۔ تھی اور دونوں اپنے اپنے بچوں کو کھلانے پلانے اور سلانے کے بعد ظہیر علی کا ذکر کرتے ہوئے 'ادب میں' دکھ اور درد کے موضوع پہ باتیں کر رہی تھیں۔ یہ بہت اچھی اور دلنشیں بات تھی کہ سارا کو اس کے پاکستانی بوائے فرینڈ نے انگریزی ادب سے بہت اچھی طرح روشناس کروا دیا تھا۔ اور وہ اس وقت بھی جاتے جاتے دروازے میں رک کر حبیبہ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے SHELLEY کو دہراتے ہوئے کہا:

WE LOOK BEFORE AND AFTER

AND PINE FOR WHAT IS NOT

یہ کہہ کر اس نے ظہیر علی کے نام کی تختی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

I WISH THERE WOULD BE A

DEVICE TO ERASE MEMORIES

تب پھر سانپ نے سر اٹھایا۔ اور پھنکار ماری اور حبیبہ نے دل کو بہلاتے ہوئے دہرایا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○

حبیبہ کا زرد اترا ہوا چہرہ، رتجگوں کی گواہ سرخ آنکھیں آواز میں رچے ہوئے آنسو اور پورے وجود پہ کرب کی مہر اپنے شوہر سے اس کی بے پناہ محبت کی گواہی دیتی تھیں۔ سارا اس کی پڑوسن اور بہترین سہیلی تھی۔ دراصل یہ DUPLEX ان لوگوں نے سارا کے ساتھ خریدا تھا۔ سیامیز ٹوئنس کی طرح یہ دونوں گھر پشت کی مشترکہ دیوار سے جڑے ہوئے تھے لیکن درست بالکل مخالف رخوں پر تھے۔ ظہیر نے یہ گھر بڑے ہی خفیہ انداز میں خریدا تھا۔ ویسے بھی ظہیر خاموش طبیعت انسان تھا۔ اس کے والد پاکستان میں امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتے تھے۔ اور حبیبہ کے والد کسٹمز کلکٹر تھے۔ دونوں بچوں کا رشتہ خود بچوں کے لئے مناسب تھا یا نہیں لیکن والدین کے بزنس کی بقا کا ضامن ضرور تھا۔ لہٰذا ظہیر علی جوں ہی امریکہ چھٹیوں میں گھر آیا حبیبہ سے اس کی شادی کر دی گئی۔ کسی پسند یا ناپسند اقرار یا انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی تھی رہی حبیبہ تو اماں نے گلے سے لگا کر صرف اتنا کہا تھا "بیٹی خوابوں کو آنکھوں کے اندر تک ہی رہنے دینا۔" اور حبیبہ سمجھ گئی تھی کہ اگر کہیں خواب آنکھوں کی سیڑھیوں سے اتر کر دل تک پہنچ جائیں تو پھر ہر دھڑکن میں سما جاتے ہیں۔ اور زندگی جیسے ہر وقت ٹک ٹک کرتے ہوئے بم کے سائے میں گزرنے لگتی ہے۔ کیا جانے کب کہاں کس جگہ یہ بم پھٹ پڑے اور عافیت کا گوشہ گوشہ تباہ کر ڈالے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ منظور احمد نے کالج میں سوائے ہنسی مذاق کرنے کے کسی خوبصورت خواب، کسی کہکشاں، کسی قوس قزح کی طرف بھولے سے بھی اشارہ نہیں کیا تھا۔ محبت کو تو یادوں میں تو یک طرفہ سڑک کی طرح چلایا جا سکتا ہے۔ مگر عملی زندگی میں نہیں حبیبہ نے غور سے اپنی اماں خالہ اور آپیا کی طرف دیکھا۔ ہر چہرے پہ ایک ہی کہانی لکھی تھی۔ خالہ کی ویران آنکھیں، اماں کا بناوٹ سنگھار سے بے نیاز آنہ بڑتاؤ، اور آپیا کی زرد پھولوں جیسی اداس مسکراہٹ۔ چلو اچھا ہوا حبیبہ نے بھی تام جھام سے بچنے کا راستہ ڈھونڈ لیا۔ اور آنکھوں سے دل تک جانے والے زینے پر کہیں کسی کا نقشِ قدم ابھرنے نہیں دیا۔ اور یوں اس کی شادی ہو گئی۔ حبیبہ کو شادی کے بعد پتہ ہی نہیں چلا کہ سمندروں کو پار

کرتے کرتے وہ کب حبیبہ سے بابی بنی۔ کب شلوار کی جگہ جینیز اور لمبی چوٹی کی جگہ چھوٹے چھوٹے بال لے لئے۔ نیاگرا آبشار کے قریب اس چھوٹی سی بستی میں رہتے ہوئے حبیبہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ جب انسان اندر سے سمجھوتوں کے لئے تیار ہو تو باہر کی زندگی کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ بڑے دنوں بعد جب ایک دن ظہیر کی بہن نے باتوں باتوں ہی میں حبیبہ کو بتایا کہ "بھیا کو تو بڑی گوری چٹی دلہن چاہئے تھی"۔ تو حبیبہ سمجھوتوں نے بٹھے کر اسکے ساتھ کروٹ بدلا تھی۔ اس کا دل اپنی سانولی رنگت پہ بہت دکھا تھا۔ اور وہ اس وقت تک گورے ہونے کے نسخے آزماتی رہی تھی جب تک روشن پیدا نہیں ہوگیا۔ پھر تو دن رات جیسے خالی مزی دے پر دوڑتی ہوئی کاروں کی طرح گزرنے لگے۔ روشن کی پہلی دوسری تیسری سالگرہ بھی آئی چلی گئی کہ اچانک حبیبہ کو یہ احساس ہوا کہ اس کا شوہر کچھ بدل سا گیا ہے۔ اب وہ اکثر دیر سے گھر آتا اور آنے کے بعد بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ڈوبا سا لگتا۔ عموماً ویک اینڈز پر بھی کام کے سلسلے میں باہر چلا جاتا۔ ابھی وہ حالات کا جائزہ لے رہی تھی۔ کہ ایک شام وہ جلدی گھر آگیا۔ اور بولا "جلدی سے تیار ہو جاؤ ہمیں ایک جگہ جانا ہے۔"

"کہاں۔ کس کے گھر؟ کیا تقریب ہے"۔ وہ بار بار بیتابی سے پوچھتی رہی۔ مگر ظہیر چہرے پر ہلکی مسکراہٹ سے معاملہ کو اور بھی پراسرار بناتا رہا۔ یہاں تک کہ جب اسکائی وے سے انہوں نے نیاگرا فالز کی EXIT لی تو حبیبہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"یہ نیاگرا ناگرا جانا کب سے اتنی خفیہ بات ہو گئی؟" ان کا اپارٹمنٹ فالز سے بہت زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ یہ پورا شہر ہی بہت چھوٹا سا تھا۔

ظہیر نے خاموشی سے کار کو دو چار سڑکوں پر گھمانے کے بعد ایک گھر کے آگے روک دیا اور گھنٹی بجائی۔ ایک دراز قد خاصی خوش شکل امریکن لڑکی نے دروازہ کھولا اور بڑی خوش دلی سے بولی۔

"ہائے حالی"

"مس برٹش یہ میری بیوی ہے۔ بابی۔ اور بیٹا روشن ہے" پھر حبیبہ سے بولا۔

"بابی۔ یہ مس برٹش ہیں اور یہ ان کی بیٹی مریم"

گوری سی بڑی بڑی کالی آنکھوں اور کالے کالے بالوں والی چھوٹی سی بچی نے شرما کر ماں کے اسکرٹ کے پیچھے چھپتے ہوئے ہلکی آواز میں "ہلے" کہا۔

چار سال پہلے جب حبیبہ امریکہ آئی تھی تب کوئی اسے کسی غیر شادی شدہ عورت سے ملاتا تو اس پر بجلی گر پڑتی مگر اب اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ یہاں عورت کی زندگی میں مرد کار کے SPARE TYRE کی حیثیت رکھتا ہے بس، تب ہی تو اس ملک میں شناخت کے لئے ہر فارم پر صرف ماں کا نام ضروری ہوتا ہے۔ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ۔ حبیبہ ابھی اپنی آمد کا مقصد بھی نہیں سمجھی تھی کہ ظہیر نے سارا کے ہاتھ سے چابی لی اور اسے اشارے سے اپنے ساتھ آنے کو کہتا ہوا چکر کاٹ کر دوسری طرف پہنچا۔ دوسری طرف بھی بالکل اسی گھر کی طرح ایک گھر تھا۔ اس نے تالا کھولا۔ اور انتہائی ڈرامائی انداز میں دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر ہتھیلیوں کی طشتری پر چابی رکھتے ہوئے بولا "مبارک ہو لینڈ لیڈی بننا"۔

حبیبہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ مشرقی عورت کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اس کا اپنا گھر ہوتا ہے۔ کسی قبر میں پاؤں لٹکائی ہوئی بڑھیا سے بھی اس کی خواہش پوچھئے تو وہ گھر کی فرمائش کرے گی اور حبیبہ تو نہ صرف جوان تھی۔ بلکہ ایک ایسے بچے کی ماں بھی تھی جس کے لئے اب ایک بیڈ روم کے اپارٹمنٹ میں ٹرائیسکل چلانا ناممکن ہوگیا تھا۔

اگلے چھ آٹھ ماہ گھر کو سنوارنے اور پڑوسن سے دوستی بڑھانے میں گزر گئے۔ نئے گھر میں آنے کے بعد جو سب سے بڑا فائدہ ہوا وہ یہ تھا کہ اب ظہیر جلدی گھر آجاتا اور سوائے ویک اینڈز کے تقریباً تمام وقت گھر پر گذارتا۔ گرمیاں چلی گئیں، جاڑے آگئے۔ قیامت کی برف باری میں حبیبہ دروازے، کھڑکیاں بند کئے شوہر کے لئے سویٹر بنتی رہتی اور سوچتی رہتی کہ اللہ کتنا مہربان ہے۔

پڑوسن کی سارا برٹش سے اس کی بڑی گہری دوستی ہوگئی تھی وہ بھی روز کام پر جاتے ہوئے اپنی بیٹی مریم کو حبیبہ کے پاس چھوڑ دیتی دونوں بچے مل کر کھیلتے رہتے۔ حبیبہ کو بھی مریم سے بہت محبت ہوگئی تھی۔ دونوں بچے آدھی انگریزی، آدھی اردو میں باتیں کرتے حبیبہ جہاں بھی جاتی دونوں کو ساتھ لے جاتی۔ بارہا ایسا ہوا کہ لوگ روک کر پوچھتے ARE THEY TWINS اور حبیبہ ہنس پڑتی۔ وہ ہر وقت خوش رہنے لگی تھی۔ سوائے ان ویک اینڈز کے جب ظہیر کو باہر جانا پڑتا تب وہ بہت دکھی ہو جاتی ایسے میں اکثر سارا بھی اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاتی۔ تو تنہائی بہت بڑھ جاتی۔ مگر سچ بات تو یہ ہے کہ اگر تنہائی انسان کے اندر گھر نہ بنالے تو باہر کی تنہائی سے نبٹنا مشکل نہیں ہوتا۔ سو اس سے نبٹنے کے لئے وہ ڈھیروں سویٹر بن لیتی کبھی کبھی جب وہ ظہیر کے برابر

لیٹتی تو سارا کے اکیلے پن کا خیال آ جاتا۔ اور وہ کہتی "ظہیر! دیکھو یہ دونوں گھر بالکل ایک جیسے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں آپ جیسا شریف شخص ہے اور سارا کے گھر میں وہ کمینہ انسان اپنی ذمے داریوں سے پیچھا چھڑا کر بھاگ گیا ہے۔" حبیبہ کو اکثر اس پاکستانی لڑکے پر غصہ آتا جو سارا سے دل لگی کرتے کرتے ایک عدد بچی کا تحفہ دے کر وطن چلا گیا کبھی کبھی وہ جھلا کر کہتی "ان کمبختوں کو خدا کا خوف بھی نہیں۔ کیا ان کی اپنی ماں بہنیں نہیں ہوتی۔" کبھی وہ سوچتی ظہیر سے کہے گی۔ "اے یہ بیچ کی دیوار گرا دیتے ہیں تم سارا سے نکاح کر لو۔ اسلام میں تو چار شادیاں جائز ہیں کم از کم ایک بچی کو باپ اور ایک عورت کو معاشرے میں عزت تو مل جائے گی۔" مگر دوسرے لمحے وہ خود ہی اپنی سوچ کی نفی کر دیتی۔ عورت محبت میں شرکت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اسے پورا مرد چاہیے۔ عجیب بات یہ تھی کہ حبیبہ کو اس بے وفا لڑکے پر ہمیشہ غصہ آتا، وہ کہتی سارا مجھے اس کا پتہ دو۔ میں پاکستان جا کے اس کو ذلیل کروں گی۔ سارا ہنس کر اس کی طرفداری کرتی اور کہتی۔ "باجی تم نہیں جانتیں ضرور اسے کچھ مجبوری رہی ہوگی۔ ورنہ کوئی ایسے وفا نہیں ہے۔" اور بار بار اصرار پر بھی سارا نے نہ تو کبھی اس لڑکے کا نام بتایا اور نہ ہی پتہ دیا۔

کبھی کبھی جب حبیبہ تنہا ہوتی، سارا اپنے ماں باپ کے گھر اور ظہیر کام کے سلسلے میں باہر گیا ہوتا۔ تو اسے سارا کا گھر اور ساتھ ہی اپنا گھر عجیب آسیب زدہ سے لگتے ہلکے ہلکے قدموں سے چلنے کی آہٹیں، دبی دبی سی ہنسی، رات گئے برتنوں کے بجنے اور دروازے کھلنے بند ہونے کی آوازیں جب آتیں تو حبیبہ سہم کر آیت الکرسی پڑھتی۔ چاروں قل پڑھ کر حصار باندھتی یا علی مشکل کشا مولا مدد کہتی ہوئی روشن کو سینے سے چمٹا لیتی۔ کبھی کبھی جب دن میں بھی یہ آوازیں آتیں تو وہ ہر آہٹ کو اپنا وہم سمجھتی۔ اور ظہیر کی واپسی پر اس سے اپنے خوف کا اظہار کرتی تو وہ ہنس کر مذاق اڑانے لگتا۔ سو یہ دونوں گھر ایک جیسے ہوتے ہوئے بھی ایک جیسے نہیں تھے۔ مگر جس دن ظہیر علی کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوا اس دن یہ دونوں گھر ایک جیسے ہو گئے۔ سارا روزانہ کام کے بعد حبیبہ کے پاس آ جاتی اور دونوں گھنٹوں بیٹھے ظہیر علی کو یاد کرتیں۔ حبیبہ ایک دلگرفتہ بیوی کی طرح اور سارا بیوی کے سچے غمخوار کی طرح مگر آج سارا کے جانے کے بعد جب بستر پر لیٹی تو ایک ایک کر کے سارے پردے اس کی آنکھ سے اٹھتے چلے گئے۔ اعتماد کی پوری عمارت اڑا اڑا دھم کرتی ہوئی زمیں پہ آ گری تھی۔ اور وہ ہر اینٹ کے نیچے ایک ایک آسیب چن کر نکال رہی تھی۔ حبیبہ کو پہلی مرتبہ اس پاکستانی لڑکے کو برا بھلا کہنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ یوں بھی مرنے والوں کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیے۔

اس نے کروٹ بدلی، رات کے دو بجے تھے، صبح تک انتظار مشکل تھا۔ اس نے سارا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جوں ہی سارا نے دروازہ کھولا۔ ایک چیخ کے ساتھ حبیبہ اس سے لپٹ گئی۔ اور ہچکیوں کے درمیان بولی :

WE SHARED PLEASURE TOGETHER NOW

WE ARE PARTNERS IN GRIEF.

آج دونوں گھر صحیح معنوں میں سیامیز ٹوئنس ہو گئے تھے۔

بقیہ مکتوبات صفحہ ۴۸

★ مہتپال سنگھ بیتاب — ۱۸۸۱ جھنی ہٹ ہاؤسنگ کالونی، جموں توی

شاعر کے دونوں تازہ شمارے موصول ہوئے۔ شاعر یوں تو محترم اعجاز صدیقی کے زمانے میں بھی ہندوستان کا اول نمبر کا ادبی رسالہ تھا لیکن عہد جدید میں مخالف حالات کے باوجود جس طرح آپ نے اس چراغ کو روشن رکھا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ سچ پوچھئے ہم لوگوں کے لئے آپ کا دم غنیمت ہے۔

★ جاوید اقبال — معرفت جن ستہ ایکسپریس ہاؤس، نریمان پوائنٹ بمبئی ۲۱

شاعر کے مارچ، اپریل اور مئی کے شماروں کے سرورق بے حد پسند آئے۔ اردو کے بعض ادبی رسائل کے بے ڈھنگے سرورق دیکھ کر جو کوفت ہوتی ہے وہ شاعر کے سرورق دیکھ کر دور ہو جاتی ہے۔ ادھر وسائل کی فراوانی ہے، ادھر محدود وسائل کا بہترین استعمال، جس کا سلیقہ تخلیقی ذہن اور سے ہی آتا ہے۔ اپریل اور مئی کے شماروں کے مشمولات کے بارے میں آپ کو شاید کچھ خطوط تو ملے ہوں، مگر شاعر کی قدامت اور باقاعدگی اشاعت کے لئے قارئین کی یہ کوششیں قابل قدر ہوں گی۔

خط و کتابت کا نیا پتہ

'Shair' Monthly
P.O Box No. 3770
Girgaon H.P.O.
Bombay 400 004



بلراج کمار

عجیب سلسلوں میں ہم نے زندگی تباہ کی
ثواب کی ہیں تلخیاں نہ لذتیں گناہ کی

نہ پاؤں میں زمین ہے نہ سر پہ آسمان ہے
کہاں پہ ڈھونڈتا پھروں کوئی جگہ پناہ کی

کوئی تو ٹھہرے رات بھر ہمیشہ اس طرح نہ ہو
کہ شام ہو گئی تو سب نے اپنی اپنی راہ لی

نہ میں تو میں بھی ہنس پڑوں وہ چپ رہے تو چپ رہوں
مکھی گھٹتیں میرے لیے مصنوعی نباہ کی

کہاں غروب ہونے دیں دکھوں کے آفتاب کو
یہ دل کی حکمرانیاں یہ سلطنت نگاہ کی

ندامتوں کے زرد رُو چراغ جھلملا اُٹھے
ہزار داغ دے گئی تلاش گاہ گاہ کی

● آدرش نگر، وارڈ نمبر ۲، نزد عیدگاہ، ادھم پور۔ (کشمیر)

اصغر رضوی

نغمے خاموش ہیں الفاظ کے گھر خاموش
طائرِ فکر ہے سہما ہوا پر ہیں خاموش

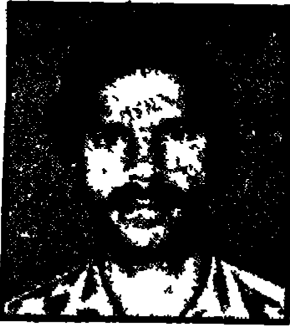
ہاتھ اُٹھتے ہیں مرے شام و سحر سوئے فلک!
کیا دعا کیجیے سب بابِ اثر ہیں خاموش

ہے اداسی کا سفر شعر کی دنیا میں عجیب
کچھ تو ہے بات کہ شعروں کے نگر میں خاموش

اب بھی نظارے ہر اک سمت ہیں بکھرے لیکن
جانے کیا بات ہے کیوں اہلِ نظر ہیں خاموش

گونجتے تھے جو ہر اک سمت فضا میں اصغر
اب انہی لفظوں کی جھنکار کے در ہیں خاموش

● بی ۱۳۸۔ بنگالی بازار، مٹیا برج، کلکتہ۔ ۲۴



اکرم کمال

یوں حسنِ التفات سے کر آئینہ مجھے
اعجازِ کُن سے بخش دے ارضِ سما مجھے

اک قفلِ سرزنش نے مرے ہونٹ سی دیئے
ورنہ جنون تھا شوخیِ گفتار کا مجھے

اے عشق تیرے باغ کا موسم ہے انتظار
اور اضطرابِ شوق نمو یافتہ مجھے

روشن تاثرات کو محفوظ کر سکوں..!
ظلمات میں ہے ایک یہی مشغلہ مجھے

اک شعلۂ رُخ کی حسرتِ ناکامیاب نے
اک آرزوئے خاک شدہ کر دیا مجھے

اک گہرے انتشار کے گرداب نے کمال
ہر سمت سے غروب کا منظر کیا مجھے

● ۴۳۹۔ بالمقابل تاشقند بکری جوبلی
اندھیری بمبئی ۵۸...

نورالحسنین

آل انڈیا ریڈیو، اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۵ (مہاراشٹر)

حراست

پھر ایک بار ویسی ہی رات تھی، وہی بے چینیاں، پھیپھڑوں میں عجیب سی اینٹھن، ناک بند، اور رکتی ہوئی سانسیں۔ اس کے کانوں میں عجیب و غریب آوازوں کا شور تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی تھی۔ وہ ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ اس نے پوری شدت کے ساتھ بازو میں لیٹی ہوئی بیوی کو آواز بھی دی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ شاید آواز اس کی حلق سے نکلی ہی نہ تھی۔ وہ جلدی سے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اٹھ کر بیٹھنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔ تب ہی اس کے کانوں نے سنا ——،

"جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا —!"

"ہاں —! ہونی کو کون ٹال سکتا ہے —؟"

اس کے اطراف جانی پہچانی آوازوں کا شور تھا لیکن وہ پھر بھی کسی کو پہچان نہ سکا۔ یہ آوازیں تو اس کے تحت الشعور میں کہیں کھو گئی تھیں یہ سب پلٹ کر کیسے آگئیں۔؟ دور کہیں دف اور تاشوں کا شور تھا۔ جیسے نوشاہ پہونچنے ہی والا ہو۔ کیسی عجیب سی چہل پہل تھی۔ اور وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

"بس کچھ ہی دیر کی بات رہ گئی ہے —!"

"ہاں —! پھر وہ ہم میں بیوپج جائے گا —!"

"کہا دے کس لو — بس اب سفر شروع ہونے ہی کو ہے۔"

پتہ نہیں وہ کب تک اسی طرح تڑپتا رہا۔ پھر اس پر غشی سی طاری ہوگئی۔ اور بند آنکھوں میں منظر پلٹنے لگا۔ سپاہی دوڑ رہے تھے سائرن بج رہے تھے۔ سیٹیاں پھونکی جا رہی تھیں۔ ایک ہنگامہ تھا۔ ابھی وہ کچھ سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ بھاگتے قدم اس کے روبرو تعظیم سے جھک گئے۔

"سر! وہ نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہے —!"

"اتنے سخت انتظامات کے باوجود بھی؟" وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر سپاہیوں پر برس پڑا۔ "ڈھونڈو اسے، ابھی وہ اس عمارت سے بہت دور نہیں گیا ہوگا —!"

سپاہی پھر دوڑنے لگے۔ سائرن اسی طرح بجنے لگے۔ اور وقفے وقفے سے سیٹیاں چیختی رہیں۔ اسے پکڑنے کے لئے سارے ہی سائنٹفک انتظامات کر دیئے گئے تھے۔ ہر جگہ ناکہ بندی ہو چکی تھی۔ اس کا اب یہاں فرار ہونا ناممکن ہی محسوس ہو رہا تھا۔ سڑکوں پر پولیس کی گاڑیاں ایسے دوڑ رہی تھیں جیسے شریانوں میں خون دوڑتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اب بھی قابو سے باہر تھا۔

اُس نے فون کو کریڈل پر رکھا۔ اور پھر کرسی کی پشت پر جھول گیا۔ اس کی ڈیوٹی میں آج تک جیل کی چار دیواری کو پھلانگ کر بھاگنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی تھی۔ وہ اس قدر سخت مزاج تھا کہ بڑے سے بڑا مجرم اس کی جیل میں پناہیں مانگتا تھا۔ لیکن آج یہ کیسے ہو گیا۔؟ وہ سوچنے لگا آخر وہ اس جیل میں کب آیا تھا؟

"اپنی مرضی سے کون آتا ہے۔ ادھر بابو جی —؟" ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا وہ اس کی آنکھوں میں ابھر آیا: "بابو جی! قانون بھی تمہارا، سپاہی بھی تمہارے اور تمہارے ہی وجود کو باقی رکھنے کے لئے ہم لوگوں کو بار بار جنم لینا پڑتا ہے! اسے ہم نہ ہوں تو اس وردی کی آبرو ہی کیا ہے —؟"

گناہوں پر پردہ ڈالنے سے پارسائی نہیں مل جاتی۔ ہونہہ — تمہارے لئے بے شمار مکتب تھے۔ لیکن تم نے ان میں پڑھ کر بھی کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ منزل کے سراب نے تمہیں سیدھی راہ سے بھٹکا کر پگڈنڈیوں پر ڈال دیا۔ یہ وردی کی آبرو ہی ہے جو تمہیں اب بھی پوری طرح گم ہونے سے پہلے ہی ڈھونڈ کر لے آئی ہے —!"

اسکے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر کہیں خلاؤں میں کھو گیا۔ لیکن آواز اس کے جسم سے آرہی تھی۔ "پنچھی کے پنکھ تو ہوتے ہیں۔ لیکن دانے کی

ضرورت اسے اندھا کر دیتی ہے۔ تمہارے قانون نے جب بھی دیکھا تو چھی کو جال میں پھڑپھڑاتے ہی دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں کو اندھا ہونے سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

"یہاں تمہاری آنکھوں کا علاج اس طرح ہو گا کہ پھر کبھی دانے کو دیکھ کر تمہاری بینائی رخصت نہ ہو سکے گی ——!"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ بیماری آنکھوں کی نہیں ہے۔ بابو جی پیٹ کا ہوتا ہے ——!"

"شٹ اپ!" وہ قیدی پر برس پڑا۔ "میری ہی قید میں آ کر مجھ سے ہی زبان درازی کرتے ہو! میں تم لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہاری ہر برائی پیٹ سے شروع ہو کر پیٹ پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ تم اگر کبھی یاد کرو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن تم ہی ناشکرے ہو۔ دانہ ڈھونڈنے کا عذاب تم نے خود اپنے آپ پر مسلط کیا ہے۔ ورنہ دانہ تو گھر بیٹھے تم تک پہنچ رہا تھا۔

"تو پھر اس بدن میں طاقت اور مزاج میں حرکت پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی، کمزور کر دیتے پیڑ پودوں کی طرح" وہ پھر ایک بار اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "بابو جی!! شاید یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اگر ایسی ہی بات ہوتی تو جنت کے سارے میوؤں کو چھوڑ کر حوا کو گندم کی ٹہنی نہ بھاتی ——!"

اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور عین ممکن تھا کہ اس کی ضروریات اس کے گناہوں کے مقابل قوت حاصل کر لیتی، اس نے چیخ کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے کوٹھری میں منتقل کر دو۔ اور پہرہ مزید سخت کر دو۔

وہ سلاخوں پر اپنا سر پھوڑنے لگا۔

اس نے پھر ایک لمبی سانس لی۔ اور آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ وہ اپنے آپ کو بے حد کمزور محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اب دھند چھٹ چکی تھی۔ بلب روشن تھا۔ اس نے اپنی ناک کو دبا کر دیکھا۔ وہ معمول کے مطابق سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے بازو میں اب بھی اس کی بیوی اسی طرح سمٹی ہوئی تھی۔ تکئے کے نیچے ڈائری میں یہ عورت منہ چڑھا رہی تھی کہ سب کچھ نارمل ہے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہر قیدی کو بہر حال ایک دن آزاد ہونا ہوتا ہے ——!"

"آزادی وازادی کچھ نہیں ہوتی بابو جی! آدمی ایک قید سے نکلتا ہے تو دوسری قید میں اٹک جاتا ہے کبھی روتے دھوتے اور کبھی خوشی خوشی —— میں جب پیدا ہوا تھا تو میرا باپ خوش ہو رہا تھا کہ میں دنیا میں آ گیا ہوں۔ اور میں شاید اس وقت اس لئے رو رہا تھا کہ میرا صرف قید خانہ بدلا تھا ——!"

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ سچائی کو دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی قید ہی میں تو ہیں۔ لیکن گمان ایک دوسرے کو یہی ہے کہ وہ جیلر ہے! جنون کنڈ میں اگنی ہے یا سراب، یہ تو پتہ ہی نہیں چلتا۔ اور آدمی ارت کے دھوکے میں کیسے کیسے وعدے کرتا ہے۔ اور پھر اپنے ہی وعدوں پر شرمندہ سا نادم سا ہو کر ساری زندگی چوروں کی طرح بسر کر دیتا ہے۔ اس نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ تو پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی جیل میں آنے والے ہر مجرم سے زیادہ گناہگار تو وہ خود ہے وہ شاید قید کی سب سے طویل سزا کاٹ رہا ہے۔ اس نے کتنے ہی قیدیوں کو اپنے ہاتھوں رہائی دلوائی۔ لیکن اپنی ہی جیل سے خود کبھی باہر نہ نکل سکا۔

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو! تمہیں تو آرام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمیشہ سے سونے والی بیوی۔ اب بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے شاید اس کی طرف دیکھا تھا۔ شاید جواب بھی دیا تھا۔ لیکن اس کی آواز حلق سے باہر ہی نہیں نکلی تھی۔ اس کے اطراف بڑا شور تھا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی۔ اور وہ پلنگ پر ہاتھ پیر پٹخ رہا تھا۔ ناک بند تھی۔ پھیپھڑوں میں عجیب سی اینٹھن تھی۔ وہ منہ سے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ اور پھر ایک طویل سانس کے ساتھ ہی جسم کے پنجرے سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے لپنے ہی پائینتی کھڑے ہو کر دیکھا۔ اس کی بیوی اس کے جسم پر جھکی ہوئی تھی۔ اور بے تحاشہ رو رہی تھی۔

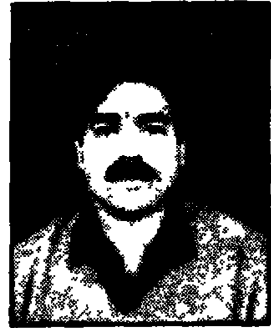
"اپنے جیلر ہونے کا تم کو بہت غرور تھا نا! دیکھو میں آزاد ہو گیا۔ اب ہر قید سے میں آزاد ہو گیا ہوں۔

وہ چپکے سے جونہی باہر نکلا۔ دو اجنبی زنجیر لئے اس کے منتظر تھے۔ اور پھر انہوں نے اسے دبوچ لیا۔ اور اس کی مشکیں کس دیں۔ اس نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا ——

"جو آیا ہے اسے واپس لوٹنا ہے ——!"

معدوم روحانی انجانی مسرتیں خوشیاں منا رہی تھیں۔ کاد

[باقی صفحہ ۲۲ پر دیکھئے]



ناھید سلیم

یہ لالہ زار بھی میرے یہ ویرانی بھی میری ہے
اگر میں ضد پہ آجاؤں تو سلطانی بھی میری ہے

بہت بے چین رکھتی ہے مری تشنہ لبی مجھ کو
ترا قبضہ ہے دریا پر یہ نادانی بھی میری ہے

بہت سر چڑھ کے بولے گا یہ میرے شعر کا جادو
زمانے میں جدا سب سے غزل خوانی بھی میری ہے

جہاں چاہوں وہیں سجدوں کی مہریں ثبت کردوں گا
زمیں وآسماں میرے ہیں پیشانی بھی میری ہے

مجھے کب راس آتے ہیں تری محفل کے ہنگامے
حقیقت میں طبیعت کچھ بیابانی بھی میری ہے

● علی بکری، محلہ شاہ چندن، چاند پور۔ ۲۴۶۷۲۵ (یوپی)



اطہر فاروقی

جب نہ ہو تخلیق میں اپنے مسائل کا بیاں
دوستو! لفظوں میں پھر تاثیر کا جادو کہاں

زندگی کرتی رہی کتنی ہی بزم آرائیاں
میری قسمت میں رہیں، تنہائیاں، رسوائیاں

ہے ہر اک دستک شکستِ خواب کا دھڑکا لئے
اور میں تعبیر کے در پر کھڑا ہوں بے زباں

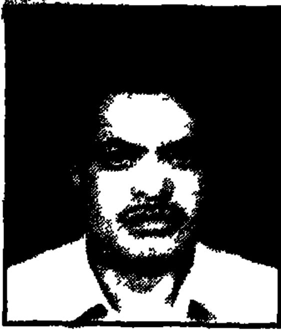
عمر بھر پرچھائیوں سے میں نے سمجھوتے کئے
میری راہیں بے جہت ہیں، میری منزل بے نشاں

ہے فریبِ آگہی کی دھند تا حدِ نظر
اور سر پر ہے غبارِ روز و شب کا سائباں

گامزن ہے قافلہ اس دوپہر کی دھوپ میں
اب کسی سائے کا بھی ملتا نہیں کوئی نشاں

اس سمندر کا سفر اطہر مری تقدیر تھا
جس سمندر کی تھیں ساری کشتیاں بے بادباں

● ۲۴۶۔ پیری یار ہوسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ ۶۷



مختار احسن انصاری

جذبۂ رشک و حسد قاتلِ چالاک میں ہے
ڈھونڈتا ہے کہ چھپا کون دلِ چاک میں ہے

تیرے مجذوب نے جلوؤں کو ترے دیکھ لیا
کہہ رہا ہے کہ گل ولالہ کی پوشاک میں ہے

ایک ننھا سا پرندہ سہی، غافل تو نہیں
جانتا ہوں کوئی صیاد مری تاک میں ہے

جیج بن جائے تو سب زیر و زبر کر ڈالے
ایک آواز جو مخفی دلِ صد چاک میں ہے

لوگ کہتے ہیں کہ اب جنگ خلا میں ہوگی
کتنا انمول خزانہ ہے جو افلاک میں ہے

دیکھنا یاب بھی دیکھنا حسن لائے گا
حوصلہ اتنا سمندر ترے تیراک میں ہے

غرق ہو جاؤں گا میں اس کے تصور نے کہا
کیسا طوفان ترے دیدۂ نمناک میں ہے

● آفیسرز کوارٹرز، دوسرا منزلہ۔ ایس وی پی روڈ۔ بمبئی ۹

دھیریندر استھانہ

نیچر ایڈیٹر، روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، ٹاؤن، نریمن پوائنٹ، بمبئی ۲۱

میری فرنانڈس! کیا تم تک میری آواز پہنچتی ہے



بوریولی، کاندیولی ..... ملاڈ ..... گورے گاؤں ... میری فرنانڈس!

میری فرنانڈس؟ ہڑبڑا کر میری آنکھ کھل گئی۔ گاڑی جوگیشوری پر رکی تھی۔ گورے گاؤں سے اگلا اسٹیشن جوگیشوری ہی ہوتا ہے۔ اور گاڑی جوگیشوری پر رکی بھی تھی۔ تو پھر؟ گورے گاؤں کے بعد میرے نیم خوابیدہ حافظے میں جوگیشوری کے بجائے میری فرنانڈس کیوں اتر آئی۔ گاڑی پھر چل پڑی تھی۔ میں سر جھٹک کر پھر نیم خوابیدگی میں تھا۔

اندھیری، ولے پارلے ..... سانتا کروز ..... میری فرنانڈس!

میری فرنانڈس؟ میں بھی چھلانگ لگا کر اپنی نیند سے باہر آ گیا۔ گاڑی کھار پر رکی تھی۔ کہاں ہے میری فرنانڈس؟ میں کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ جہاں لوگوں کا ہجوم اپنی مسلسل بے صبری میں جنگلی بیلوں کی طرح لہرا رہا تھا۔ کیا ان کی بے صبری میں کوئی میری فرنانڈس سرگرداں ہوگی؟ گاڑی پھر آگے بڑھ گئی تھی۔ میں پھر نیند میں سرک رہا تھا۔

کھٹ کھٹ کھٹاک! کھٹ کھٹ کھٹاک! بغل سے ویرار فاسٹ گزر گئی۔ میری آنکھ کھلی۔ گاڑی باندرہ سے آگے جا رہی تھی۔

"کون سا اسٹیشن آنے والا ہے؟" مقابل نے میری کھسی کھسیا کر پوچھا۔

میری فرنانڈس ... ! میرے ہونٹوں نے سرگوشی کی۔ گاڑی ماہم پر کھڑی تھی۔ اور سامنے ایسی کوئی لڑکی موجود نہ تھی، جو میری فرنانڈس سے رتی بھر بھی مشابہ ہو۔

تم سے کون میل کھا سکتا ہے میری فرنانڈس؟ تم تو تم تو ..... میری پلکیں مندنے لگی تھیں۔ وہ پال گھر کی شام تھی میری آسودہ، خوش حال زندگی میں بدنصیبی کی طرح اتری ہوئی شام

لیکن اس وقت جب وہ وقوع پذیر ہو رہی تھی، چاروں طرف سکھ ہی سکھ بکھرا ہوا تھا۔ خوشگوار سردی کے ساتھ سڑکوں پر اترتا سانولا سا قصباتی اندھیرا مجھے بھا رہا تھا۔ وہاں میرے اپنے مہانگر کا گھنا اور بے کراں شور نہیں تھا۔ کوئی کسی کے کندھے نہیں چھیل رہا تھا۔ کسی کو کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی۔ کتنے دن ..... نہیں کتنے برس بعد میں سکون میں تھا۔

سڑک کنارے بازار لگا تھا۔ تانبئی بدن اور تیکھے نین نقش والی کولی بائیاں خریداروں کو اپنی اپنی مچھلیوں کی نایاب خصوصیات گنوا رہی تھیں۔ دور ..... بازار کے اس پار کھیتوں میں برف جیسی سفید نمک کی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ پرندے اپنے گھر لوٹ رہے تھے۔ نہیں، آج تو میں گھر نہیں جاؤں گا۔ کسی سنکی ضد کی طرح اس خواہش نے سر اٹھایا۔ آج رات تو یہیں قیام کرنا ہے۔ رکنے کا پیسہ دفتر دے ہی دے گا۔ دفتر والوں کو کیا معلوم کہ میرا کام آج شام ہی انجام پا چکا ہے۔ اسے کل تک آرام سے کھینچا جا سکتا ہے۔ بس میں پال گھر کی پرسکون سڑکوں کا بے فکر آوارہ بن گیا۔

اے جی، نخرا نہیں کرنے کا۔ دوں گا ایک لافا تو ساری آوارگی اتر جائے گی۔ ڈبے میں شور مچ گیا۔ دو لوگ لڑ پڑے تھے۔ دکھ بھری شکست، محنت اور تھکان کے درمیان تڑپتے اس شہر کے لوگوں کو غصہ بہت جلد آتا ہے۔ لیکن اتنی عجلت سے وہ اتر بھی جاتا ہے۔ کسی کے پاس مسلسل تنازعے کے لئے فالتو وقت نہیں ہے۔

لیکن پال گھر کی اس گہراتی ہوئی شام میں میرے پاس ڈھیر سارا فالتو وقت تھا۔ جس میں کافی کچھ میں نے خرچ بھی کر دیا تھا۔ تھکان اور خوشی کے درمیان پال گھر میرے اندر بچے کی طرح ہمک رہا تھا رات ہونے کو تھی۔ اب میں بسیرے کی تلاش میں تھا۔ کسی نے بتایا "وِہم ہیم" میں چلے جائیے یہ یہاں کا بہترین ہوٹل ہے۔

"سیم سیم"، شاید یہاں کا مشہور ہوٹل تھا۔ راستے میں جس سے بھی پوچھتا تھا وہ فوراً رک کر اطمینان کے ساتھ راستہ بتانے لگتا تھا اور کچھ ہی دیر میں گہری تھکان سے لدا ہوا میں "سیم سیم" کے سامنے تھا۔ اس قصبے کے لحاظ سے وہ واقعی ایک شاندار بلڈنگ تھی۔ احاطے میں فواروں والا باغیچہ تھا۔ دروازے پر دربان تھا۔

"اے، دروازہ چھوڑو! بابے سینٹرل اترنے کا ہے" کوئی زور سے چیخا اور میری پلکیں کھل گئیں۔ کافی بڑی بھیڑ اپنی دھینگا مشتی والی مانوس اداؤں میں گاڑی سے اتر رہی تھی۔ گاڑی کے چلتے ہی میں پھر نیند کی آغوش میں تھا۔

گرانٹ روڈ.. چرنی روڈ..... مرین لائنس ..... میری فرنانڈس! "اٹھو چرچ گیٹ آگیا"۔ کسی نے مجھے جگا دیا۔ میں اٹھا۔ انگڑائی لی اور پھر گاڑی سے اتر گیا۔ اب مجھے ٹیکسی سے کرنرمین پوائنٹ جانا تھا۔

تم اس دن میری زندگی میں ایک نئے اور اصلی استعجاب اور ناقابلِ یقین انبساط کی طرح داخل ہوئی میری فرنانڈس۔ تو پھر تم میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ کیسے بن گئیں۔ ٹیکسی سڈنہم کالج کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ سڑک پر، کاروں کے بونٹ پر سڈنہم کی حسینائیں عریاں چھاتیوں اور جانگھوں کے ساتھ بے شرمی کی طرح موجود تھیں۔ شہر کی بند اس زندگی اور فلموں کی وافر عریانیت نے انہیں بتمیز طریقے سے لاپرواہ اور بولڈ بنا دیا تھا۔ لڑکیوں والی یہ گلی شہر کے نسائی حسن کا ہوسناکی سے دھندلا آئینہ تھی۔

اسی گلی میں کسی وقت گلے میں عیسیٰ مسیح کا کراس لٹکائے میری فرنانڈس بھی بسا کرتی تھی۔

آہ! درد میری شریانوں میں تیزاب کی طرح اتر رہا تھا۔ چھ گھنٹے ہاں صرف چھ گھنٹے تمہارے ساتھ گزارنے کے بعد جتنی بار میں تمہارا نام لے چکا ہوں میری فرنانڈس اتنی بار تو تمہاری ماں نے تمہیں نو مہینے اپنی کوکھ میں رکھنے اور سولہ برس اپنے گھر آنگن میں پالنے کے باوجود نہیں لیا ہوگا۔

ٹیکسی رک گئی۔ میں باہر نکلا۔ سامنے بے کراں سمندر تھا۔ ہر طرح کی بے فکری سے باہر، شہر کے سکھ اور تفاخر سے لبریز۔ اوبرائے ہوٹل تھا، ایکسپریس ٹاور تھا۔ ایئر انڈیا کی بلڈنگ تھی

اے چوبیس اور اٹھائیس منزلہ فلک بوس عمارتو! تم گواہ

رہنا کہ ابھی چند روز پہلے کامیاب اور پرمسرت زندگی گزارنے والے ایک بے قصور شخص کی دنیا بلاوجہ ہی برباد ہو گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے میری فرنانڈس تم مجھ سے پہلے اس دنیا سے رخصت لوگی۔ لیکن یاد رکھنا کہ آخری وقت میں بھی پربھو یشوع تم پر رحم کی بارش نہیں کریں گے۔

دس منٹ تک لفٹ نہیں آئی تو میں سیڑھیاں چڑھنے لگا دوسری منزل تک پہونچتے پہونچتے سانس اکھڑ گئی۔ ایک رانہ خوف نے میرے اندر آنکھ کھولی۔ کچھ عرصہ، شاید دو سال یا تین سال یا چار سال بعد میں ان سیڑھیوں پر نہیں چڑھ سکوں گا۔

اپنے کیبن میں داخل ہو کر میں نے اپنی کرسی، اپنی میز اور اپنے ٹیلی فون کو کسی گم شدہ مسرت کی طرح چھوا۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ کل کی طرح، پرسوں کی طرح، پچھلے ہفتے کی طرح اور اس سے بھی پہلے والے اس ہفتے کی طرح جس کی ایک شام میں پال گھر کے "سیم سیم" میں "کیپر دان" بار کی ایک میز پر تھا۔ دو پیگ پی لینے کے بعد کے سرور میں۔

تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ اس طرف کسی عورت کی آواز تھی۔ میری فرنانڈس! میرے ذہن میں کوئی دیپ جلا اور بجھ گیا۔ مجھے نہیں بات کرنی کسی عورت سے۔ میں نے کہا اور فون کاٹ دیا۔ جسم میں کپکپی سی ہونے لگی تھی۔ میز پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر میں نے تھوڑا سا پانی پیا اور تولیئے سے چہرہ صاف کرنے لگا۔

گھنٹی پھر بجی، میں نے فون اٹھایا۔

"فون مت کاٹنا۔ میں اسمتا ہوں" ادھر سے آواز آئی۔

"ہاں بولو" میں نے کہا۔ وہ میری چھوٹی سالی تھی۔

"دیدی بتا رہی تھی کہ جب سے آپ پال گھر سے لوٹے ہیں، بے حد گم سم رہنے لگے ہیں۔ کیا ہوا؟"

اسمتا کی آواز بھی ویسی ہی تھی۔ اتنی ہی کھنک بھری جتنی کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ میری فرنانڈس سے پہلے والے دنوں میں۔

"کچھ نہیں" میں نے کہا "صرف تھکان ہے اور تھوڑا سا دفتر کا ٹینشن۔ دو چار روز میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"دو چار روز میں؟"

"ہاں سچ مچ۔ کویتا کو سمجھا دینا" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ کویتا میری بیوی تھی۔ اور پہلے میں اسمتا سے لمبی لمبی باتیں کیا کرتا تھا۔ "دو چار روز میں" میں نے دہرایا اور ہلکے سے کانپ گیا۔ اس بار انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ ڈپٹی جی۔ ایم تھے۔

"کچھ دنوں سے تمہارے کام میں سستی آگئی ہے" وہ پوچھ رہے تھے۔ "شکایت کر نہیں رہا ہوں، پیارے۔ کتنی ساری ضروری فائلیں تمہارے پاس اٹکی پڑی ہیں۔"

"ساری سر!" میں نے ادب سے کہا "طبیعت تھوڑی سست رہی اس بیچ۔ شاید موسم کی وجہ سے۔"

"موسم؟ موسم کو کیا ہوا؟ وہ تو بہت شاندار ہے۔" انہوں نے یاد دلایا کہ میں جون جولائی نہیں، دسمبر کے شہر میں ہوں۔

"جی" میں نے کہا۔ "تین دن میں ساری فائلیں نپٹاتا ہوں۔"

"کوئی پرابلم ہو تو بولو" ان کے اندر کا بڑا بھائی جاگ گیا تھا۔

"نہیں سر، تھینک یو، تھینک یو ویری مچ۔"

"او کے۔ گو اہیڈ" انہوں نے فون رکھ دیا۔

گو اہیڈ۔ میں بڑبڑایا۔ لیکن کہاں؟ میں نے سوچا۔ اور سارے امکانات پر راکھ جھڑنے لگی۔ صدی کے سب سے کربناک المیے سے میری روح گلے مل رہی تھی۔

"کیبر وان" میں اکا دکا لوگ ہی تھے۔ اس چھوٹے سے قصبے میں اتنی مہنگی عیاشی کون کر پاتا ہوگا۔ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ رم جھم کرتے نیلے اندھیرے کے بیچ تیسرے پیگ کا سرور پرسکون ارتعاش میں خوشگوار انگڑائیاں لے رہا تھا۔ میرے سامنے میری تنہائی بیٹھی تھی۔ پیگ ختم کر کے سڑکوں پر بھٹکنے کا فیصلہ میں کر چکا تھا کہ اس لمحے میرے دائیں کان کی طرف ستار سا بجا۔ "میں آپ کے ساتھ بیٹھوں؟"

دھیمے دھیمے تھرتھراتے اپنے چہرے کو میں نے دائیں جانب گھمایا اور ششدر رہ گیا۔

سامنے کھڑے بدن سے جو روشنی بھر رہی تھی۔ اس کا سامنا کر کے میرا شہر شرمسار ہو سکتا تھا۔ میرا کلک اشتعال حیرت زدگی میں ڈھل رہا تھا۔

دونوں ہاتھ میز پر ٹکا کر وہ تھوڑا سا جھکی۔ اس کے گلے میں لٹکا عیسیٰ مسیح کا لاکٹ باہر کی طرف جھول آیا۔ وہ میکسی کے اسٹائل والی کوئی شاندار لباس زیب تن کئے ہوئی تھی۔

"میرا نام ہیری ہے۔ میری فرنانڈیس۔ میں آپ کے ساتھ بیٹھوں؟"

اس وقت متحیر ہو کر اس کے دودھیا لباس کو تک رہا تھا۔

اس نے پھر اپنا نام بتایا اور بیٹھنے کے لئے پوچھا۔ میں جھینپ گیا اور جلدی سے بولا۔ "ہاں ہاں بیٹھئے نہ؟"

"ون منٹ" وہ مسکرائی اور گھوم گئی۔ اونچی ایڑی کی سینڈل پہنے وہ کھٹ کھٹ کرتی کاؤنٹر کی طرف جا رہی تھی۔

ہے بھگوان! میری آنکھوں میں کتنے سارے انار ایک ساتھ چھوٹنے لگے تھے۔ اس کٹاؤدار کو چھونے کے لئے چھوٹے شہروں میں دنگا ہو سکتا تھا۔ اور اس پر اس کی چوٹی۔ اپنی اب تک کی زندگی میں میں نے اتنی لمبی اور پرشکوہ چوٹی نہیں دیکھی تھی۔ وہ گھٹنوں کے جوڑ سے بھی نیچے چلی گئی تھی۔ تھوڑی اور لمبی ہوتی تو ایڑیاں چھو لیتی۔ جب تک وہ کاؤنٹر پر بات چیت کر کے لوٹی۔ میں مارا جا چکا تھا۔

"یہ اصلی ہے!" میں ابھی تک حیران تھا۔ "اسے چھو کر دیکھوں"۔

جواب میں وہ مسکرائی اور اس نے چوٹی کو میز پر بچھا دیا۔ پھر ہاتھ میں گلاس اٹھا کر بولی۔

"چیئرس۔ تمہاری لمبی، سکھی زندگی کے نام۔"

"چیئرس۔" میں خواب میں چل رہا تھا۔ کسی طلسمی کشش میں مبہوت اسی عالم میں سرگوشی کی۔ "تمہارے ملکوتی حسن کے نام" پھر اپنے بائیں ہاتھ سے اس کی چوٹی سہلانے لگا۔ اس کا دوسرا اور میرا چوتھا پیگ ختم ہونے تک اس کے یہاں ہونے کا راز میں جان گیا تھا۔

کبھی وہ بھی سڈنہم میں پڑھتی تھی اور مشہور ماڈل بننے کے خواب بنتی تھی۔ تبھی بدقسمتی اس کی زندگی پر قہر کی طرح ٹوٹ پڑی۔ سعودی عرب میں دولت کمانے گیا اس کا باپ وہیں کا ہو کر رہ گیا اور اس کی ماں کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے چکر میں پھنس گیا۔ ماں بمبئی میں ہے۔ چھ دن یہاں رہ کر ساتویں دن ماں کے پاس جاتی ہے۔ اس کی ایک دوست نے جو اپنا مہنگا جیب خرچ کمانے کی خاطر کبھی کبھی یہاں آتی تھی، اسے "سیسم سیم" کا دروازہ دکھایا۔ ابھی صرف سترہ کی ہے۔ تھوڑا اور پیسہ جمع ہوتے ہی یہاں سے نکل لے گی۔

میں اس سے مل کر ترحم آمیز محبت سے لبریز ہو گیا تھا۔

"کیا تمہیں پایا جا سکتا ہے؟" اس کا سچ جان کر میں نے اسے اپنی خواہش سے آگاہ کیا۔

"رات بھر کے بارہ سو روپئے کاؤنٹر پر جمع کر دیجئے" وہ اپنے لاکٹ سے کھیلنے لگی۔

میں نے فوراً پرس سے بارہ سو روپئے نکال کر اسے تھما دیئے

وہ اٹھ کر کاؤنٹر پر چلی گئی۔ میں اس کے انتظار میں کانپنے لگا۔ کیسا ہوگا اس کا بدن؟ ایک مشتعل چاقو میری نسوں کو چیر رہا تھا۔

وہ آئی اور میرا ہاتھ تھام کر پہلی منزل والے میرے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔

"مے آئی کم ان؟" کیبن کا دروازہ کھول کر ایک لڑکی جھانک رہی تھی

"تم میری فرنانڈس تو نہیں ہو نہ؟" بے ساختہ میرے منھ سے نکلا۔

"نہیں" وہ خوشی خوشی اندر آگئی۔ "سر کیا آپ نے پہلے مجھے کہیں دیکھا ہے۔ یا میری شکل میری فرنانڈس سے ملتی ہے؟" وہ بے تکلفی بڑھانے کی کوشش میں تھی۔ میں سمجھ گیا۔ یہ کسی اچھی کمپنی کی پی۔آر۔او ہے۔ مرد ہو یا عورت، پی۔آر۔او کو میٹھی، نرم اور انسیت سے بھری زندگی جینے کی ہی تنخواہ ملتی ہے۔

کسی نئے پراڈکٹ کے اجرا کی تقریب کا دعوت نامہ دے کر اور آنے کا پکا وعدہ کر کے اس نے ہاتھ ملایا۔ اس کے جاتے ہی پانی بھرے گلاس سے اپنا ہاتھ دھو کر میں نے تولیے سے پوچھ لیا۔

کمرے کی نیم تاریکی میں میری فرنانڈس کی نرم سانسیں میرے چہرے پر بکھر رہی تھیں۔ اس نے اپنی چوٹی کھول دی تھی۔ بیسویں صدی کے تمام بیتے ہوئے سال اس کے مدہوش کن بالوں پر پھسل رہے تھے میں میری فرنانڈس کے کپڑے اتار رہا تھا۔

شیو بناتے وقت میں نے سامنے رکھے شیشے میں دیکھا۔ باتھ روم سے نہا کر نکلا میرا بیٹا۔ میرے تولیے سے اپنا بدن پوچھ رہا تھا۔ جن سے میرے اندر کچھ ٹوٹ گیا۔ میں لپک کر اٹھا اور بیٹے کے گال پر چانٹا جڑ دیا۔

"کیا ہوا؟" چانٹے کی آواز سن کر کویتا کچن سے دوڑی دوڑی آئی

"یہ میرا تولیہ استعمال کر رہا ہے" میں اپنے غصے کی انتہا پر کھڑا کانپ رہا تھا۔

"ارے تو اس میں چانٹا مارنے کی کیا بات ہے؟ پہلے بھی تو کئی بار وہ تمہارا تولیہ لے کر باتھ روم جاتا رہا ہے" کویتا تنک گئی۔ "کچھ دنوں سے تم بالکل بدل گئے ہو۔" وہ بگڑی، پھر روہانسی ہو کر بولی "

"تم نے ہم لوگوں کو پیار کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"نہیں کویتا۔۔۔۔" میری سختی ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگی لیکن

میں نے خود کو سنبھال لیا۔ یہ میرا پیار ہی تو ہے۔ میں بڑبڑایا۔ اور پھر شیو کرنے لگا۔

سامنے رکھے آئینے میں میری فرنانڈس ابھر رہی تھی۔ بے لباس میں پاگلوں کی طرح اسے چوم رہا تھا جگہ جگہ۔ وہ میرے کپڑے کھول رہی تھی۔ اپنی دونوں پستانوں کے بیچ اس نے میرا سر رکھ لیا تھا اور میری گردن سہلانے لگی تھی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس نے میرا چہرہ اٹھایا اور اپنے سلگتے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

سکھ میرے اندر بوند بوند اتر رہا تھا۔

کچن میں کویتا نے کوئی برتن گرا دیا۔ وہ اپنے دکھ کے گھنے جنگل کی سفاک تنہائی میں کھڑی باؤلی ہو رہی تھی۔

میں اپنا تولیہ لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔ کپڑے اتار کر میں نے شاور چلا دیا۔ اور کتنے دن؟ میں نے سوچا۔ اور کتنے دن اس شاور میں نہلانے کا سکھ بچا رہنے والا ہے میرے پاس؟

میں نہا کر نکلا تو میری فرنانڈس پلنگ پر الٹی لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے بدن پر ہاتھ پھرایا۔ اس کی گردن چومتے ہوئے بولا "بہت گہرا سکھ دیا ہے تم نے میری فرنانڈس۔ میں اس رات کو اور تمہیں یاد رکھوں گا۔"

"سکھ؟" میری فرنانڈس پلٹ گئی

"ارے؟" میں چونک گیا۔ یہ کیسا ہو گیا ہے میری فرنانڈس کا چہرہ۔

"سکھ؟" میری فرنانڈس کا چہرہ ایک ناقابل فہم سختی میں تنا تھا۔ "سکھ تمہاری زندگی سے رخصت ہو چکا ہے مور کھ آدمی۔!"

"میری؟" میں نے تڑپ کر کہا

"یس" میری کھڑی ہو کر کپڑے پہننے لگی۔ پھر میری طرف چہرہ گھما کر بولی۔ "یاد تو تمہیں رکھنا ہی ہوگا"

میں نے دیکھا، اسکی آنکھوں میں انتقام کے چاقو چمک رہے تھے۔ ایک شاطر لیکن لاپرواہ ہنسی ہنستے ہوئے وہ بولی۔ "کپڑے پہنو اور گھر جاؤ۔ میں نے تمہیں ڈس لیا ہے" اس کی آواز پر تشدد تھی۔

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں میری! صاف صاف بتاؤ۔ دیکھو میں نے تم کو پیار کیا ہے۔" میری آواز التجا کی طرح پھسل رہی تھی۔

"تم میرے بیسویں شکار ہو" میری غرائی۔ اب وہ اپنا عیسیٰ مسیح والا لاکٹ پہن رہی تھی۔

"معاف؟" میں نے میری کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"میں نے تمہیں ایڈس دے دیا ہے" اس کی آواز پتھر تھی۔
"کیا؟" میں گھبرا کر پلنگ پر گرا۔ "تم کو ایڈس ہے؟"
"ہاں"
"لیکن کیوں؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے بتایا کیوں نہیں؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟" میں رونے کو تھا۔ جسم کے سارے مسام کھڑے ہو گئے تھے۔
"میں نے کس کا کیا بگاڑا تھا؟" میری حملہ آور تھی۔ "جس عرب شیخ نے مجھے یہ تحفہ دیا میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ایک سکھی زندگی کی خاطر میں کچھ عرصہ کے لئے اس دنیا میں آئی تھی۔ مجھے کیا ملا؟" میری پر جیسے دورہ پڑ گیا تھا۔ الفاظ کو چباتے ہوئے وہ پھپھکاری۔ "جتنا بھی وقت میری تقدیر ہے اسے میں تم مردوں کی قسمت برباد کرنے میں لگا دوں گی۔ سنا تم نے! تم برباد ہو چکے ہو" میری کھٹ کھٹ کرتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ دروازہ دھڑام سے بند کیا اس نے۔
میرے سامنے، میرے منہ پر، گویا میری زندگی کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔
"اوہ میری.... یہ کیا کیا تم نے؟" میں چہرہ ڈھانپ کر سسکنے لگا تھا۔
پانی چلا گیا تھا۔ میں نے دیکھا۔ میں باتھ روم میں کھڑا رو رہا تھا میری فرنانڈس کے جسم کا کوئی حصہ میرے جسم میں تحلیل ہو گیا تھا جو مجھے گھن کی طرح لگاتار کھائے جا رہا تھا۔
باہر کویتا باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ تو اس نے عجیب بے اعتباری سے مجھ کو دیکھا۔ پھر بولی۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"۔
"کچھ بھی تو نہیں" میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور کپڑے بدلنے لگا۔
اچانک اپنے کرب کے جاں لیوا اندھیرے میں میں بہت اکیلا چھوٹ گیا تھا۔ میرا ڈر ہر روز بڑا ہو رہا تھا۔
میری فرنانڈس کیا تم کو میری آواز سنائی دیتی ہے؟ اگر ہاں تو سنو! تم خوش ہو نہ؟ دوسروں کو ٹوٹتے بارتے ہوئے دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے نہ؟ ایک ظالم اطمینان۔ لیکن کتنا کمینہ ہے یہ اطمینان میری فرنانڈس تم سن رہی ہو نہ؟ اپنے دکھوں کا حصے دار کیسے بنا سکتا ہوں میں؟ کتنا بے چارہ اور بے بس بنا دیا ہے تم نے مجھ کو!
میری آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور مسلسل چھت سے متصادم تھیں۔
اچانک کویتا پلٹی اور میرے اوپر آگئی۔
"ارے!" میں جھپاٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کیا کرنے پر تلی ہو تم؟"
"تم.... تم کو معلوم ہے.... " کویتا گہرے دکھ میں تھی۔ "عورت ہونے کے باوجود آج میں پیش قدمی کر رہی ہوں۔ ہم نے دو مہینے سے پیار نہیں کیا ہے....؟"
دو مہینے؟ دہشت میرے دل کو دبوچ کر بیٹھ گئی۔ دو مہینے کتنے مہینے اور.. ؟ میرا ہر عضو تشنج میں تھا..... اے کویتا.... کوئی میرے اندر برسر پیکار ہوا... اے کویتا میں تمہیں بتا دوں...
میری پیشانی پر پسینہ تھا سینے میں ارتعاش
"تم پاگل ہو گئی ہو" میں نے غیر واضح الفاظ میں کہا۔ الفاظ کسی مصیبت میں گھرے کانپ رہے تھے۔
"کیا تمہاری زندگی میں کوئی اور آ گیا ہے؟" کویتا بپھر چکی تھی
کوئی اور؟ میری فرنانڈس؟ میرا دل ڈوبنے لگا۔ لیکن میں نے طاقت بٹوری اور کویتا سے خود کو ہٹا لیا۔ دو ماہ بعد ملی پیار کی گرمی میں وہ دھیمے دھیمے سلگنے لگی تھی میں بھی۔
اچانک جذبات کے تموج کے ان شدید لمحات میں میری آنکھوں میں میری خوشحال دنیا خوفناک ہچکولے لینے لگی۔
نہیں، یہ قتل ہے.... کوئی میرے اندر برہم ہوا۔
"سکھ تمہاری زندگی سے رخصت ہو چکا ہے مورکھ آدمی" میری فرنانڈس مسکرا رہی تھی۔
میں نے اسی لمحے کویتا کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اور بستر چھوڑ دیا دسمبر کی سرد رات میں اپنے زخم زخم آنسوؤں سے مجھے بددعا دیتی ہوئی کویتا اپنے کپڑے سنبھال رہی تھی۔
پتہ نہیں، میں اس کی زندگی میں جل رہا تھا یا وہ میری زندگی میں بجھ رہی تھی۔ جو بھی تھا وہ میری فرنانڈس کے انتقام کے سائے میں تڑ تڑ تڑک رہا تھا۔
لا متناہی کرب کے اس بے حد کٹھن لمحے میں کوئی سائل میرے اندر گڑگڑا رہا تھا.... ہے کویتا!



میرے کمن دنوں کی ساتھی دوست ! تمہارا قتل نہیں ہو سکتا مجھ سے۔ دیکھو، مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم نہیں جانتی کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ میرے پیار کا قتل مجھ سے دور رہو۔ میرے سامنے سے بھی ہٹ جاؤ اب تمہیں۔ میں اس پوری دنیا کے لئے اچھوت ہو گیا ہوں۔

مگر کچھ کہہ نہیں سکا میں۔ رات بھر میرے اور کویتا کے درمیان ایک بامعنی زندگی بے معنی ہو کر گھلتی رہی۔

عجیب و غریب سوالوں، اندیشوں اور پچھتاوے کے ساتھ میں مسلسل منجدھار میں پھنس گیا تھا اور وہ بھی بالکل تنہا۔ رشتوں اور دوستوں کی ایک خاصی تعداد کے باوجود میں اپنے دکھ میں اکیلا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی سب سے زیادہ محبوب کویتا کو بھی یہ نہیں بتا پا رہا تھا کہ میرا شکار کیا جا چکا ہے۔

لیکن اس کا اختتام کہاں ہے ؟ اپنے راز کو پوشیدہ رکھنے کی صلاحیت لگاتار گھٹ رہی تھی۔ دکھ اور پچھتاوے کی سب سے اونچی چوٹی پر اٹک گیا تھا۔ میں اور مجھ سے باہر پوری زندگی ویسی ہی رواں دواں اور جاودواں تھی جیسی کہ اسے ہونا چاہیئے۔ تمناؤں سے لبریز اور خون کی طرح گرم۔

خون ! میری سوچ کو جھٹکا لگا۔ اپنے خون کی جانچ بھی تو کروا سکتا ہوں میں۔ میں نے فوراً فون اٹھایا اور اپنے ایک ڈاکٹر دوست کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ لیکن ادھر سے ہیلو آنے پر ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

دس طرح کے سوال کرتا ڈاکٹر۔ تمہیں جانچ کیوں کروانی ہے ؟ کہیں غلط جگہ چلے گئے تھے کیا ؟ تم تو ایسے نہیں تھے ؟ اور جانچ کا نتیجہ اگر مثبت آیا تب ؟

میں نے دیکھا۔ میں سڑکوں پر بدحواس بھاگا جا رہا ہوں۔ ایک ہجوم اپنے مشتعل شور کے ساتھ میرے پیچھے ہے۔ جس دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہوں وہ تڑاک سے بند ہو جاتا ہے۔ ہجوم کا خیال ہے کہ ایک اندھیرا بند کمرہ میرے لئے زیادہ مناسب ہے جس میں تل تل کر کے گلنا ہے مجھے۔

دونوں ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں میری۔ ان دنوں کچھ زیادہ ہی پسینہ آنے لگا ہے۔ کبھی کبھی اچانک اٹھنے پر چکر بھی آ جاتا ہے۔ اکثر بھوک کا بھی احساس نہیں ہوتا ہے۔ زبان پر ایک میٹھک قسم کی بدمزگی مستقل جگہ بنا چکی ہے۔ کیا میں ایڈز جیسے مہلک مرض کے شکنجے میں ہوں یا میری فرنانڈس کا وردان پھل پھول رہا ہے۔

اور اپنی بے چارگی کے اس بے پناہ وقت میں مجھے پھر میری فرنانڈس کیا یاد آئی۔ تم کہاں ہو میری فرنانڈس اور کیسی ہو ؟ تم بھی تو گھل رہی ہوگی نہ ؟ میرے بعد اور کتنے شکار کئے ہیں تم نے ؟

کیا میری فرنانڈس کو گرفتار نہیں کرایا جا سکتا ؟ میرے دل میں ایک فلاحی خیال اٹھا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس بارے میں اگر میں ایک صحافی دوست سے بات کروں تو وہ سب سے پہلا سوال یہی کرے گا کہ تمہیں کیسے معلوم کہ حسن کی وہ دیوی محبت کے گداز لمحات میں موت کا تحفہ بانٹتی ہے۔ پھر وہ خبر چھاپ دے گا۔ اور اپنی زندگی میں بچا ہی کیا رہ جائے گا۔

سب سے اچھا یہی ہے دوست۔۔۔۔ کسی نے میرے اندر چپکے سے سرگوشی کی کہ تم خاموشی سے نکل لو۔ آج نہیں تو چار سال بعد تمہیں ویسے بھی اس دنیا سے رخصت ہونا ہی ہے۔ لیکن یہ رخصت کتنی شرمناک اور اذیت سے بھری ہوگی ! ابھی کسی کو بغیر کچھ بتلائے، بغیر آہٹ کے نکل چلو گے۔ تم کم سے کم کویتا کی زندگی تو بے خطر اور بے فکر بنی رہے گی۔

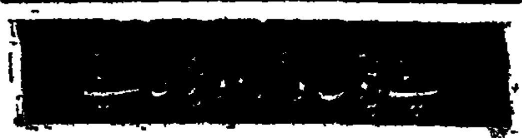
تو۔ ؟ میرے اندر فیصلے اور تذبذب کی کشمکش جاری تھی۔ سامنے کی دیوار پر ٹنگے ایئر انڈیا کے کیلنڈر پر کوئی ایئر ہوسٹس نمستے کے پوز میں کھڑی تھی۔

اچانک نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ شیر جیسی برق رفتاری سے اٹھا اور نالیں اٹھا کر ایئر ہوسٹس پر پٹکنے لگا۔

آخر تھک کر میں پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ میری آنکھ سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اور میں بڑبڑا رہا تھا۔ میں تھک گیا ہوں میری فرنانڈس۔۔۔۔ اپنے آپ سے لڑتے لڑتے میں بہت بہت تھک گیا ہوں۔ تم سن رہی ہو نہ میری فرنانڈس ! کیا تم تک میری آواز پہنچتی ہے ؟

ہندی سے ترجمہ

جاوید اقبال، معرفت جن ستہ ایکسپریس، 4 اور۔ نریمان پوائنٹ، بمبئی





شاہین اقبال

بچپن کی آنکھوں میں چمکتا ہوا جگنو جیسا ایک گاؤں تھا میرا
ماں کی لوری کی طرح بھابی کے کنگن جیسا ایک گاؤں تھا میرا

صحن سے کھلے سویروں میں بچپن کی خوشبو، پیڑ پودوں کا وضو
گلے ملتے ہوئے خوشحال گھر آنگن جیسا ایک گاؤں تھا میرا

پاٹھ شالے میں بھری شوق سے لے جاتا ہوا، مار خود کھاتا ہوا
یادیں ہنستا گرو جی کے لڑکپن جیسا ایک گاؤں تھا میرا

دور بکھرے کھیتوں سے چوپال سجاتا پھاگن، دھان برساتا آنگن
تاروں کا غذ کی بچھاتا ہوا ساون جیسا ایک گاؤں تھا میرا

جھریاں آکاش زمیں پھولوں پہ اٹھلاتی ہوئی کھڑا پل کھاتی گوری
چنچل دھان، گلابی پی کے دامن جیسا ایک گاؤں تھا میرا

من ہی من روٹھ کے پردیسی کو چٹھی لکھ کر، رکھ کے آنچل سر پر
جھمی کے چاروں طرف پھرتا سہاگن جیسا ایک گاؤں تھا میرا

ایک کمرے کے بکھرے شہر کو پلکوں پہ لئے پھونک کر سامنے دئے
سوچتا [illegible] جیسا ایک گاؤں تھا میرا

● [illegible] ۲۵۹ [illegible] ۴۰۰۰۰۸



خالد جمال

خیال و خواب سے نکلوں ظہور تک دیکھوں
سفر کے حادثے تنہا عبور تک دیکھوں

مرے لئے ہیں یہ ہفت آسمان و ہفت زمیں
تو کس لئے ترے جلوے میں طور تک دیکھوں

سمجھ سکا ہوں تجھے بس شعور کی حد تک
یہ فکر ہے کہ تجھے لاشعور تک دیکھوں

رگیں کھنچ گئیں رشتوں کی شورشیں کبھی
صدا لہو کی جو آئے تو دور تک دیکھوں

سخن میں جرأت تعلّی و ثوق کی حد تک
کبھی نہ خود کو میں حد غرور تک دیکھوں

الجھ نہ جاؤں کہیں ریشمی خیالوں میں
ترا جمال پس رنگ و نور تک دیکھوں

● بی ۱۴/۲۲ [illegible]



شکیل اعظمی

غلط ہوا، کہ فلک کو خفا نہ کرنا تھا
زمیں کے حق میں ہمیں فیصلہ نہ کرنا تھا

خیال رکھنا تھا سورج کی آگ کا ہم کو
بلند اتنا بھی دستِ دعا نہ کرنا تھا

اب اس سے رسم دعا و سلام بھی تو رہی
تعلقات میں اتنا خلا نہ کرنا تھا

شکست اس کا مقدر تھی دوستی میں
میں گر گیا تھا تو اس کو کھڑا نہ کرنا تھا

اے زندگی! جو تجھے ملنا ہی تھا مجھ کو
تو پال پوس کے اتنا بڑا نہ کرنا تھا

وہ جانتا تھا اگر صلح، تو ہمیں [illegible]
[illegible] نہ کرنا تھا

● [illegible]

ہدایت کاشف

ہماری سوچ پہ ان کے عتاب کتنے ہیں
وجود ایک ہے لیکن عذاب کتنے ہیں

اب آئینوں کے نگر پہ نظر جو ڈالی ہے
جبینِ شب پہ کھلے ماہتاب کتنے ہیں

سوالِ ترکِ تعلق کوئی تو کر مجھ سے
مرے لبوں پہ تڑپتے جواب کتنے ہیں

خضر مزاج کوئی ہم سفر بنا ڈالو
رہِ حیات میں ورنہ سراب کتنے ہیں

نجانے کون سا چہرہ تمہارا اپنا ہے
نجانے رخ پہ تمہارے نقاب کتنے ہیں

یہ اور بات کہ صحرائے دل بھی پیاسا ہے
وگرنہ آنکھ میں اپنی سحاب کتنے ہیں

دہکتی دھوپ کے سورج کو کیا پتہ کاشف
مرے چمن میں سلگتے گلاب کتنے ہیں

● [illegible]، ضلع رحیم یار خان (پاکستان)



امیر حمزہ ثاقب

خدا کے نام سے صرفِ نظر کیا
وہ ہر سُو ہے اِدھر کیا اور اُدھر کیا

تو کیوں یہ سنگباری ہو رہی ہے
میں آخر بن گیا شیشے کا گھر کیا

خرد کے ہوش اڑتے جا رہے ہیں
جنوں کی آ رہی ہے رہ گزر کیا

میں اپنے حوصلوں سے اڑ رہا ہوں
مرے نزدیک ہیں یہ بال و پر کیا

کسی کو فرصتِ گریہ نہیں ہے
ہم اپنے ساتھ دیکھیں نوحہ گر کیا

جھجک کیسی یہ جائے میکدہ ہے
یہاں ثاقب تمیزِ خیر و شر کیا

● ۵۰۹- دھامنکر ناکہ، بھیونڈی ضلع تھانہ - ۴۲۱۳۰۵-



پردیپ ساحل

رہگزارِ درد کی ساری کتھا کہہ لیجئے
منزلوں پر جستجو کا مرثیہ کہہ لیجئے

ایک رشتہ ہے ابھی باقی ہمارا آپ سے
اب اسے کہئے تصور یا دعا کہہ لیجئے

رنگ ہیں قائم اگر اپنی جگہ پر دوستو
پھر مری آنکھوں کو دھندلا آئینہ کہہ لیجئے

اب ہراسِ وسعتِ شب کی یہی تدبیر ہے
چاند کو سورج، اندھیرے کو ضیا کہہ لیجئے

پوچھتے ہیں لوگ جب مجھ سے جدائی کا سبب
کہہ دیا کرتا ہوں قسمت کا لکھا کہہ لیجئے

اب کہاں وہ رنگ خونِ دل کی عکاسی کا اب
شعر گوئی کو محض اک مشغلہ کہہ لیجئے

ہم مٹے جاتے ہیں ساحل ابتدائے شوق میں
آپ چاہیں تو اسی کو انتہا کہہ لیجئے

● ٹی/۱۱۱۲- جہانگیر پوری، دہلی ۱۱۰۰۳۳

فروری — مارچ ۹۵ء

★ دلیپ سنگھ — [illegible] (ضلع [illegible]) [illegible] کے ساتھ گزشتہ ہفتے [illegible] ملے۔ ان دونوں شماروں کے مشمولات دلچسپ ہیں لیکن کچھ تخلیقات اعلیٰ پایہ کی بھی تھیں۔ ستیہ پال آنند صاحب کا مضمون "انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاری" دو مرتبہ پڑھا۔ جس طرح انہوں نے [illegible] کو اس طرح لکھا ہے کہ عام قاری اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ یہ بات مجھے اس لئے بھی اچھی لگی کہ بعض نقاد بہت سے ہلکے پھلکے مضامین کو بھی ایک گنجلک سا بنا دیتے ہیں جن کی عام آدمی مطالعہ کے بغیر سمجھ نہیں سکتے۔ ایسے مضامین تو قاری کی سمجھ سے باہر ہیں جب تک کسی تعلیمی کورس میں شامل کیا جائے، قاری کو ان کا علم نہیں ہوتا۔ ان دو شماروں میں شامل نظمیں بہت اچھی لگیں۔ خاص طور پر شاہد علی کی نظم ہے کوئی [illegible] کی ہم قافیہ [illegible]، خورشید ہاشمی کی نظم "[illegible] شعروں کا اسیر" اور آپ کی اپنی نظمیں خصوصی طور پر "ایک نظم"۔

سید ظہیر نے ماؤ مین کہانی کا ترجمہ بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔ وہ ایک اور رسالوں میں ان کی ترجمہ کی ہوئی کہانیاں پڑھ چکا ہوں۔ بہت اچھی لگیں۔ وہ خود بھی تو بڑی اچھی کہانیاں لکھتے ہیں لیکن کئی دنوں سے ان کی اپنی کہانی کہیں نظر نہیں آئی۔ امید ہے کہ وہ اس طرف بھی توجہ دیں گے۔

★ [illegible] — [illegible] (بھارت)
"[illegible]" کے دو شمارے (شمارہ ۲۰ اور ۲۱) موصول ہوئے۔ شمارہ تین میں بھی آپ کا اداریہ بہت فکر انگیز ہے۔ اگر آپ اس طرح کی تحریری تخلیقات کو مسلسل صورتوں میں پیش کرنا شروع کریں تو مجھے یقین ہے کہ آپ جیسا تخلیق کار بھی بہت تیزی کے ساتھ سامنے آ جائے گا۔ [illegible] کے خیالات کے انتخابات [illegible] میں اضافہ کرتے ہیں۔ بہت [illegible] ہو سکے تو ایک مکمل خیالات [illegible] [illegible] (انگریزی) خیالات کرانا کہ ان کی طباعت کرائیں تو آج کے دور کی ٹرانسلیشن EASY MORE اور فن سے سنجیدہ شعر کو پڑھا جائے، [illegible] فنکاری کیسی بہت اور معقولیت ہوتا ہے۔ آپ نے بھی اسی غزلوں کے عنوان سے مرحوم [illegible] صدیقی صاحب کی غزلوں کا انتخاب شائع کر کے بہت اچھا کیا۔ مرحوم نے ساری زندگی شعر و ادب کی خدمت میں تنگ دستی میں گزار دی۔ اس کے گروہ اور کچھ لوگ (جن میں میں بھی شامل ہوں) انہوں نے انھیں اس

سلسلے میں معروف تھا [illegible] افسوس تو یہ ہے کہ زندگی میں بھی انھیں ہمارے قلم کار [illegible] تھوڑی سی عزت نہیں ملی۔ اب اُن کا ادب کو یاد [illegible] حضرات انہیں "[illegible]" پڑھ چکے ہیں۔

اردو میں دوسری زبانوں کے ادب سے متعلق مضامین لکھے جاتے رہے ہیں۔ یہ بڑا مبارک قدم ہے۔ آپ نے بھی اس سلسلے میں جس تیزی کا ثبوت دیا ہے اس کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔ اس کا ثبوت ان دونوں شماروں میں بھی تخلیقات سے بھی مل جاتا ہے۔ [illegible] نے [illegible] نظموں کے ترجمے کر کے اچھی بات کا ثبوت کر دیا ہے۔ آپ کو خیال ہوگا اس قسم کے سلسلے اس وقت بہت تیزی سے ابھرے تھے جب اردو والوں کو بیرونی ادب سے نزدیک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب کچھ برسوں سے اس تیزی میں کمی آگئی تھی۔ اس سلسلے کو دوبارہ تیزی دینے کا سہرا قاری کو بھی حاصل رہا ہے۔ میری رائے میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کو بھی اس قسم کے تعارفی مضامین اردو میں لکھے جاتے رہیں۔

کئی دنوں سے آپ پاکستانی تخلیقات بھی بڑی تعداد میں شمارے میں شامل کر رہے ہیں۔ یہ مناسب تو ہے مگر اکثر لگتا ہے کہ یہ تخلیقات کہیں اور بھی RE-PRODUCE تو نہیں کی جا رہی ہیں۔ ایسے مضامین وغیرہ کی اشاعت سے گریز کریں جن میں زیادہ تر پاکستانی تخلیقات ہی کے حوالے دئے جاتے ہیں۔ مثلاً انشائیہ پر [illegible] کا مضمون ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف کی ہندوستان میں موجودہ تخلیقی صورتوں کا وہ شاید [illegible] زیادہ علم نہیں ہے۔ احمد جمال پاشا اور کنہیا لال کپور کے بعد بھی ہندوستان میں انشائیہ نگاروں کی ایک کافی تعداد رہی ہے جن کا ذکر اور ان کے انشائیوں کا تجزیہ اس مضمون میں نہیں کیا گیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پاکستانی انشائیہ نگاروں کا جائزہ اپنی معلومات کے تحت لینے میں تو کامیاب ہیں مگر ہندوستان میں اس صنف کے ارتقاء کے بارے میں ان کا علم ادھورا ہے اسی لئے ان کا مضمون تشنہ تشنہ لگتا ہے۔ عمر انشائیہ کی تعریف (یا اصول) دو تین برسوں سے لکھا جا رہا ہے۔ اس صنف کی تاریخ سے بھی اب اردو کا قاری پوری طرح واقف ہو چکا ہے۔ ان باتوں کو بار بار دہرانے کا کوئی مقصد اب باقی نہیں رہ جاتا۔

★ انیس رفیع — [illegible] ۔ ۲۵
اداریہ "ایک تحریر اور — نئی نسل کے لئے" ضمیر سارے سوالات اٹھاتا ہے۔ اب میرا سوال یہ ہے کہ کیا صرف سوال مرتب کر دینا ہی آپ کا کام ہے؟ آپ نے اداریہ کے

آخر میں خود لکھا ہے "[illegible] کا راستہ ابھی موجود ہے" [illegible] کے پیشِ نظر ہمارے معاشرے میں موجود ہے لیکن اہل قلم وہ باتیں ان راستوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ آپ کے لئے یہ کام اور بھی آسان ہے کہ "شاعر" کے اوراق میں تخلیقات کی صورت یہ راستے منظر عام ہیں۔ ایڈیٹر ان تخلیقات کی نبض پر ہاتھ رکھے اور ان راستوں کی موجودگی کو محسوس کرے اور قاری کو ان سے روشناس کرائے۔ سدا OUT LOOK (زاویہ نگاہ) کا ہے۔ آپ کی اس تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس طرح آپ چاہتے ہیں وہ صاف طور پر منظر عام پر لکھا نہیں جا رہا ہے۔ اور آج کے [illegible] رجحان کی نفی ہی ہے کہ آپ کی اپنی سوچ دب کر رہ گئی ہے۔ شاعر [illegible] اسلام کو سید [illegible] امام صدیقی اور [illegible] شاعر کا IMAGE بھی کہا جاتا ہے اور اسے [illegible] بھی کہا ہے۔ ایک حساس شاعر کے لئے یہ صورتحال یہ تشویشناک ہے لیکن میں یہ کہوں گا کہ اب صاف صاف بات کرنا ہوگی۔ آپ کس ادارے کا ادب چاہتے ہیں کھل کر بتائیں۔ گول مول گفتگو سے قاری اور تازہ اذہان تذبذب میں پڑتے جا رہے ہیں۔ "نئی ادبی اقدار کی وضاحت بھی ضروری ہے"۔ امید کہ آپ کا ہم عصر اردو ادب نمبر آپ کے اپنے تصورِ ادب کا ترجمان ہوگا، جسے ہم "نئی ادبی اقدار" کی طرح کہہ سکیں گے۔ "اردو کے تین [illegible] رسائل" ایک معلوماتی مضمون ہے، غیر ممالک سے شائع ہونے والے رسائل جو اردو کے تیزی کی اشاعت ہو رہے ہیں بہت کم ہے۔

میں جناب اصغر علی انجینئر کی اس بات سے متفق ہوں کہ "آج کی تنقید کو محض ساختیت، جدیدیت جیسی بحثوں میں الجھانے کے بجائے ادب کی بجائے سماجی حقیقتوں کا جائزہ لے کر تنقیدی رویہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے" میں اصغر علی انجینئر کی صاف گوئی سے خوش ہوں۔ "سماجی حقیقتوں" [illegible] انہوں نے اپنے مخصوص رجحان اور رویے کو آئینہ کر دیا لیکن یہیں محترم اصغر علی انجینئر صاحب سے یہ بھی کہنا ہوگا کہ سماجی حقیقتیں تو کئی پہلو اپنی وجہ پیچیدگیوں کو پیش کرتی ہیں۔ لہٰذا وہ تنقید سماجی حقیقتوں کے ساتھ ساتھ انسانی ذات اور اس کی [illegible] پیچیدگیوں کو بھی مد نظر رکھے ورنہ ساری EXERCISE ہی بے کار ہو جائے گی۔ افسانے "[illegible] ہوا تھا" اور "[illegible] بنتے چہرے" جیسے موضوعات کو اردو ادب میں داخل کرنے کی کامیاب کوشش ہیں۔ ہمارے [illegible] ایسے کچھ ہو رہے ہیں جو چند تحریروں کا شبنم [illegible] ہے۔ "[illegible]" اور "[illegible]" جیسے موضوعات کو [illegible] نے [illegible] کی ہیں۔ عبدالاحد

متعلقہ بحث میں وہ شعر درج کر کے نقل کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر شاعری صد فیصد نہیں کہی جاسکتی ہے۔

یہ رنگ شاعر نشاط الحسن کی تخلیقی سرگرمیاں حسب معمول یہاں دیکھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔ "بادلوں کی دھوپ" مضمون کی شام کہاں "بشیر بدر ایک بار پھر نئے لب و لہجے والے شخص نظر آتے ہیں۔ "یعنی بحر نظمیں" انتسابات نے انہیں مزید معتبر اور بعدی بحر کم پیدا کیا ہے۔

صلاح الدین پرویز تجربہ فرما کر ایک نیا DIMENSION پیش کر رہے ہیں جس سے وہ اجا ہ ستی اور بنیاد پرستی جیسے الزامات سے صاف بری ہو جائیں گے۔ نعمان شوق کی غزل متاثر کرتی ہے۔

★ اسلم حنیف — گوہ، ضلع بدایوں (یوپی)

شمارہ نمبر ۲ میں وزیر آغا کا مضمون "انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاری" بھرپور اور جامع ہونے کے باوجود اس صنف کی ٹھوس تعریف پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یوں تو کسی بھی صنف کی مکمل اور جامع تعریف نہیں کی جاسکتی لیکن کم از کم صنف ادب کے نمایاں اور بنیادی پہلوؤں کو چند الفاظ میں سمیٹ کر پیش کیا جانا امکان سے باہر نہیں۔ کاش مصنف دیگر اصناف ادب کی تعریفات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس صنف کے بارے میں بھی معقول رائے پیش فرماتے۔ وزیر آغا کے مضامین میں انشائیہ کے مضمرات پر سیر حاصل بحث تو ملتی ہے مگر ان میں مذکورہ پہلو سے صرف نظر کی کوتاہی ہر جگہ نمایاں رہتی ہے۔ موصوف دونوں شماروں میں اچھے قلمکاروں کی شمولیت قابل داد ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ خاص طور پر غزلیات میں فنی خامیاں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ شمارہ نمبر ۲ میں تخت سنگھ کا یہ شعر میری سمجھ میں نہیں آیا۔

برنے گل ، عنبر دل ، دود چراغ محفل
ایک ہی سمت میں ہم سب کو سفر کرنا ہے

شین، بہاف، ناظم کی غزل کے دونوں مطلع "فاعل" کے وجود سے عاری ہیں۔ اسی غزل کا یہ شعر۔

ڈوبتا ہے سفینہ ساحل کا
نوح سا نگہبان کب دیکھا

ناموزوں ہیں۔ نگہبان، مفاعل کے وزن پر درست ہے نہ کہ "فاعلات" کے وزن پر۔ حنیف نگر کے یہ مصرعے شکست ناروا کے شکار ہو گئے ہیں۔

ولولے میرے گریز رگیں لہا کے رہ گئے
جلوے تمام دیدہ و دل میں سما کے رہ گئے

دل میں کسی کے پہلے مصرعے کے بعد تخلیق کی پیدا وار کو کر دیا

گیا ہے۔ اسی غزل کے مطلع میں شتر گربہ کا عیب بھی موجود ہے۔ جاوید صدیقی کے دوسرے شعر میں بھی اصل عیب ہے (کسی منصب کسی عہدے کی خاطر کوئی عہدیداری نہیں کی تھی)۔ مہدی پرتاپ گڑھی اور اکرام تبسم کے ذیل کے مصرعوں میں حشو کا عیب موجود ہے۔

وہ چھوٹے لفظ تھے شعلوں کے درمیاں میں رہے
بدن میں اترا ہے تو ، تو شراب کی صورت

اس شمارے کے افسانے اور موشحات (آزاد نظمیں) قابل مطالعہ ہیں۔ شمارہ نمبر ۳ میں نئے شاعر کے تحت منصور سبزواری کی دو غزلیں شائع کی گئی ہیں۔ منصور سبزواری اردو شاعری کا قد آور نام ہے ان سے ناموزوں اشعار کی تخلیق کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مطلع آپ خود ملاحظہ فرمائیے۔

اندر اندر راکھ ہوا ہوں باہر سے تابندہ ہوں
کب سے دو متضاد تماشوں پر میں زندہ ہوں

بالترتیب وزن اس طرح اخذ کیا جائیگا فعلن فعلن فعلن فعل
فعولن فعلن فعلن فعلن فع / فعلن فعلن فعل فعول فعولن فعلن فعلن فع۔ پہلے مصرعے میں بار بار کن فعلن زائد ہے۔ غزل کے بقیہ اشعار دوسرے مصرعے کے وزن پر خلق کیے گئے ہیں ان میں فعل فعل کا استعمال یہ تحقیق میر روا رکھا گیا ہے حالانکہ اندروں نے عروض۔ تحریف اشعار کو ناموزوں کے الزام سے نہیں بچا سکتی۔ مصرعے نیچے لکھ رہا ہوں۔

ہانپ رہا ہوں گلی گلی کی چاہان کا بوجھ اٹھانے
حسب لب کے ملبے کا میں ایک کارندہ ہوں
بیٹھا ہوں اک گیراج میں ٹوٹے چھکڑ کی مانند
گھر تو پچھلے وقت کا میں دور آئندہ ہوں

محسن بھلکاری کی غزل میں فنی خامیاں موجود ہیں مثلاً (دیکھا کہ گسند دماغوں نے گھر گئے) (بے محل تھا) (یک جانبیں تیرے ایسا خریدار بھی تو ہو) (تیرے؟ بے معنی ہے) (اترا عن نہانے تو اترا بھی تو ہو) (مصرعہ بے معنی ہے)۔ فن پارہ کیا ہے کیا نہیں؟ آپ کی گہری فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ ادھر آپ کے پاروں موشحات خوبصورت ہیں۔ کہانیوں میں سنگی ساتھی (پرویز بیدار) اور کابوس (محسن عثمانی) پسند آئیں۔

★ عتیق النظر — پوسٹ بکس ۸ جاوید روڈ قطر

شاعر کا شمارہ نمبر ۳ میں تنقید و تحقیق کے حوالے سے آپ کا اداریہ اہم ہے۔ مرزا حامد بیگ کا مقالہ "قراة العین حیدر کا جہان" اچھا ہے۔ قرأة کا امی ملیکہ۔ گلزار "نوٹس میں تمہارے خواب گھر کا دروازہ" ہمارا وقت تمہیں گرنا

گون اداز میں دیکھ سکتا ہے"۔ جس پر غالب کا یہ مصرع یاد دلاتا ہے "مصرع کی شمع ہے کہ دل بہ کسی کے واسطے ہیں" یا اس کا یہ جملہ "اگر کوئی شخص خوشی سے مر سکتا ہے تو میری آرزو ہے کہ یہ سعادت میرے حصے میں آئے"۔ غالب کا یہ مصرع یاد دلاتا ہے کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔ فراز کا اپنے سوانح نگار اور ناقد دوست شمیم کے نام خط اردو تحقیق کاروں کے لئے قابل غور ہے۔ رفعت جاوید کا "تعلی تنقید پر مقالہ" سیاہ کام تحقیق کاروں کو انعام دیتا ہے اور انہیں اچھی تحقیق پیش کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ خط شاعر کا صفحہ اچھا ہے۔ محسن بھلکاری کا کلام پسند آیا۔ معصوم انصاری کی غزل بھی اچھی ہے لیکن ان کا یہ مصرع: "الموش اک ملی کے لئے ہو جانے متفکلی ہوا" متفکلی ہوا محل نظر ہے۔ مزید برآں ہری کی نظم (شرا) "دائروں کا اسیر" کی لفظیات اچھی ہیں لیکن اس نظم کا آہنگ کیا ہے اس کو اگر پڑھا جانے یا سنایا جانے تو کس طرح، کیا شاعری کے نام پر اس سے محظوظ ہوا جاسکتا ہے۔ شاعری کی تعریفوں میں سے کوئی اہم تعریف اس پر صادق آتی ہے۔ میں آزاد نظموں کا قائل ہوں اس لئے نہیں کہ میں خود بھی آزاد نظمیں لکھتا ہوں بلکہ اس لئے کہ اس میں شاعری کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ آزاد نظم کسی نہ کسی بحر میں ہوتی ہے کسی ایک رکن پر اس کی تشکیل ممکن ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اس میں لفظوں کی ترتیب نثر سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کا ایک آہنگ ہوتا ہے جسے پڑھ یا سن کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعری ہے۔ لیکن نثری نظم کا تو ماجرا ہی جدا ہے۔ مجھے تو یہ کہ میں نہیں آتا کہ نثر کو نظم کا نام کیوں دیا جاتا ہے۔ اگر لوگوں کو شاعر کہلانے کا اتنا شوق ہے تو اس کے لئے تھوڑی سی محنت کرنی چاہئے۔ شاعری کے لوازمات کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ آخر وہ خیال کا کیسا طوفان ہے اگر محاورہ کون سا سیلاب ہے جو نظم معری اور آزاد نظم کے ساحل کاٹ کر نثر کی سپاٹ زمینوں میں بہا جاتا ہے۔ ابھی لوگ آزاد نظم کو حلق سے نیچے پوری طرح نہیں اتار پائے ہیں پھر نثری نظم کو کس طرح برداشت کر پائیں گے۔ دیگر نثری فن پاروں اور نثری نظم میں مابہ الامتیاز کیا ہے۔ بحر و وزن میں شاعری وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں خدا کی جانب سے اس کی صلاحیت عطا ہوئی ہے۔ آزاد نظم کے لئے بھی اس خداداد صلاحیت کی ضرورت ہے جبکہ نثری نظم کے لئے قطعاً اس کی ضرورت نہیں۔ ہر پڑھا لکھا شخص جب چاہے چند فقروں کو ٹکڑے ٹکڑے ترتیب دے کر انہیں نظم کا نام دے سکتا ہے۔ آخر شاعری کو نثر بنا کر اس کی اہمیت کیوں گھٹائی جارہی ہے۔ خدا کے واسطے شاعری کے نام پر نثری نظمیں۔

مطلب ہے کہ اس نثری شاعری کی [illegible] رسائی ہے۔ شاعری کا
تصرف ہے۔ نثری نظم کو ضرورت ہے غزل کے [illegible] اس کی
قدر کو حل کر سکے۔ [illegible] کو [illegible] نام عطا کر سکے۔
نثری نظم کے [illegible] رہا ہے۔ اگر نثری
نظم [illegible] کر [illegible] سکتی ہے اور بہت ضروری
ہے اس [illegible] نظم کا غیر مستقل نام دیا جائے
۔ نثری نظم کہانیوں کی شاعری ہے اگر اپنا ہی شوق ہے
نثری نظم لکھ کر شاعر بننے کا تو اسے نثری نظم کے بجائے
"نثری فن" کہا جائے۔ نثر میں فن کی بات تو سمجھ میں آتی
ہے لیکن نثر میں [illegible] اور ایک معیار ہے۔ نظم کا
[illegible] قائم کر کے نثر میں [illegible] زیب دیتا ہے۔ آپ
نثری نظموں کے لئے "نثری فن" یا "نثری فن پارہ" کا
عنوان دے سکتے ہیں۔ اس سے نظم کا نام اور اس کا وقار
محفوظ رہے گا میں سمجھتا ہوں کہ صرف نثری نظمیں لکھنے والوں
کو شاعر کہنا بھی جرم ہے انہیں نثری فنکار کا نام دیا جائے یا
جو کچھ بھی کہا جائے مگر شاعر نہیں۔ راشد عالی فاروقی کی نظم
[illegible] ہے جس کا ایک آہنگ ہے اور یہ آہنگ ہی نظم پیدا
ہوا ہے۔ بلکہ شاعری کے ایک اہم معیار کو مجروح کر دیا
ہے۔ ہماری نظم کو ہم [illegible] تصحیح کر سکتے ہیں۔ ایک
ہی مصرعے خارج از بحر محسوس ہوئے۔ شاہد عزیز کی نظم
"پہلا سورج" بھی نثری نہیں بلکہ آزاد نظم ہے اور اس کے
مصرعوں کو [illegible] تصحیح کیا جا سکتا ہے۔ نظم کے ساتویں
مصرعے میں "پرندوں" سے وزن بے مصرع کے
[illegible] میں "اور" [illegible] تو عیب بھی نہ رہتا۔ نظم
اچھی ہے۔ جبکہ اسی صفحے پر [illegible] کی نظم "انتظار" انتہائی
[illegible] کا شکار ہو گئی ہے، یہ نثری نظم یعنی نثری فن ہے،
اسے میں شاعری نہیں کہہ سکتا۔ یہ شاعری کے [illegible] کو مجروح
کرنے کی کوشش یا سازش ہے۔ [illegible] کی نظم "مکمل
[illegible]" اچھی ہے تب یعنی [illegible] اسلام صدیقی کی نظمیں بھی نثری
[illegible] نثری نظم سے متعلق میں اپنا خیال ظاہر کر چکا ہوں۔ آپ
کی نظموں میں خیال اچھا ہے اس کے باوجود وہ کوئی تاثر
[illegible] سکیں۔ جو شاعری کا نتیجہ ہے دل میں کسی طرح
کا [illegible] کوئی احساس مسرت یا غم پیدا نہیں ہوتا۔ شاعری کا
مقصد [illegible] ہے میں سمجھتا ہوں ان آزاد نظموں سے اچھی تو
[illegible] ہے اگر کہانیوں کو بھی نظم
کہا جائے۔ لفظوں کو [illegible] کی کوشش قابل قدر
ہے [illegible] "ایک نظم" کے پہلے مصرعے کے آخر
میں [illegible] ہے اس کی تشریح فرمائیں تو عنایت
ہوگی [illegible] مصرعہ [illegible] "قابل غور ہے

قدر کا تعلق سماعت سے ہے اور ملانے کا تعلق بصارت سے
ان دونوں کو آپ نے ملا دیا۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں لیکن
اس کے بعد والے ٹکڑے "شطرنج کھیلتے ہیں" "گرتے ہیں
میں" ملانے کا [illegible] کہاں تک مناسب ہے۔ آپ کی نظم
"ایک تنہا دعا" کوئی تنہا دعا نہیں ہے، حضرت سلیمان علیہ
السلام نے ایسی ہی دعا مانگی تھی جس کا ذکر سورہ ص آیت نمبر
۳۸ میں ہے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اے خدا مجھے ایسی
سلطنت عطا فرما جس کا اور کوئی اہل نہ ہو" دعا قبول ہوئی اور
حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہوا پر بھی حکومت فرمائی۔
آپ کا اپنی دعا میں خدا کے متعلق یہ کہنا "جو تیرے پاس
نہیں" زیادہ اچھا نہیں لگتا، خدا کے پاس کیا نہیں ہے۔ اقبال
نے بھی کہا "ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے" لیکن
وہاں مصرع سوالیہ ہے، یہ الگ بات ہے کہ "کمی ہے۔
رہائی نہیں ہے" سے گستاخی جھلکتی ہے اور اقبال کے
یہاں بہت ساری چیزیں مل جائیں گی اس طرح کی۔ مگر
شارحین نے ان کی توجیہہ پیش کی ہے۔ آپ کے مصرعے کی
توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ "مگر اتفاق ہے تو" پھر کر آپ نے
"جو تیرے پاس نہیں" کہنے کا جواز پیدا کر لیا ہے۔ آپ کا
"لوح محفوظ سے ماورا" والا مصرع بہت تفصیلی اور اخلاقی
ہے۔ پرویز شہزاد کا افسانہ طویل ہونے کے باوجود بھی
قاری کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ افسانے کی
بنت میں بڑی محنت کی گئی ہے ہر لحاظ سے یہ ایک اچھا افسانہ
ہے، محسن عثمانی کا "نروس" بھی اچھا ہے، مرزا فاضل کے
تراجم پسند آئے۔

★ عبد الحمید بٹ — شبنم، کشمیریہ نور بستی سرینگر

شاعر جلد ۶۹، شمارہ ۲ میں انشائیہ اور اردو انشائیہ نگاری
جناب وزیر آغا کا مقالہ ان کی فنی صلاحیتوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔
لیکن ایک بات سمجھنے سے قاصر ہوں اردو والے اب زیادہ تر
انگریزی اصطلاحات کا سہارا کیوں لیتے ہیں۔ کیا کہیں ایسا تو نہیں
کہ ہم نفسیاتی الجھن کے شکار ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ
ہم انگریزی جانتے ہیں۔ دراصل کہنا یہ تھا کہ مذکورہ مقالے
میں مقالہ نگار نے ترجمہ فرمایا ہے کہ (یہاں آپ کی اور جس
سوچ کے راستے میں ایک رکاوٹ یا BLOCKAGE
نمودار ہو جاتا ہے)۔ جب یہ BLOCKAGE
نہیں بلکہ BLOCKAGE ہے اگر آپ رکاوٹ لفظ استعمال
کرتے ہیں تو اسے سہارے کی ضرورت نہیں ہے یہ بذات
خود ایک مہذب لفظ ہے اور [illegible] درج ہے۔
دوسری زبانوں کا استعمال [illegible] کیا جانا چاہئے
اسلام صدیقی کی ساری غزلیں بہت اچھی لگیں، مہدی
صدیقی کی غزل کا یہ شعر

میں اپنا بیچ کر بیچ جس کو مانتے ہیں
وہ شرمندہ تھے ٹھکرانے میں ان کے وہاں میں سے

بظاہر ایک سادہ شعر ہے لیکن اس کے اندر گہرا
نفسیات پوشیدہ ہیں۔ اس شمارے میں شامل بعض
کہانیاں تو روحانی پرواز کی معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ "تصادم"
کا ایک ترجمہ ہے روایت سے ہٹ کر ہے جہاں تک
علیم کے افسانے "شطرنج کے مہرے" کا تعلق
محسن سے ہے اور یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ اور یہ بات
ہے کہ آج کل لوگ دوسروں کے گھروں میں آگ
پسند کرتے ہیں یہ افسانہ کا ایک بلند نمونہ ہے۔
جلد ۶۹ شمارہ ۲۳ جرمات (فن پارہ) کیا ہے کیا نہیں
کر ذہن کے دریچے کھل جاتے ہیں۔ آپ کے اداریے
کے ہوتے ہیں۔ صدیقی صاحب عام طور سے "شاعر
ہے" نہ بحث موضوع رہتا ہے۔ غیر اردو والے عام
اس سوال کو ہمیشہ چھیڑتے ہیں یعنی پوچھ کر ہیں جسکی بنا
ابھی تک کچھ نہیں۔ شاعری کیا ہے، ابھی ایسی ہی ایک
ہے۔ مہربانی ہوگی اگر کبھی جرمات یا اداریہ اس موضوع
فرمائے گا۔ ہمیں آپ سے کافی توقعات وابستہ ہیں۔
طرح مذکورہ شمارے میں آپ نے شاعری کی تھوڑی
وضاحت کی ہے امید ہے آئندہ بھی آپ وضاحت فرمائیں۔
رفعت اختر کا مقالہ "ادب اور تنقیدی مقالہ" بحث طلب
مقالہ ہے کہ ذہن میں طرح طرح کے سوالات ابھرتے
سب سے اہم [illegible] والوں سے قطعی ناواقف ہیں۔ جہاں
تک مقصد کی بات ہے وہاں تعریف کی ہے ان کی نظر
میں جہاں ادب کی بات آتی ہے وہاں ناقد ڈکٹیٹر بن جاتا۔
اب اگر ناقدین ادب کو نیا تنقیدی اسلوب دیتے ہیں کا
مطلب یہ نہیں ہے کہ موازن ایک تو اوزان دے دوسرا
لوگوں کو نقاد کے تحت مکمل کر لے۔ رفعت صاحب اگر ہم
تو آپ نے کوئی نیا تنقیدی اسلوب ترتیب دیا ہے تو
اجاگر کر کے پیش کیجئے وہ کس بات کی ہے۔ بقول رفعت
صاحب آج کے عہد کو دانشور سائنسی عہد کہتے ہیں ان
خیال میں یہ دانش ادب میں نہیں سائنس میں سرگرم
ہے۔ یعنی سائنسی عہد سے مراد کیا [illegible] قدریں بن
سکتی ہیں۔ کیا اس سائنسی دور میں غالب اور اقبال زندہ
رکھے ہیں۔ ہاں سائنس کی اہمیت پر یہ بات آپ نے صحیح
فرمائی ہے کہ [illegible] ادب اور تحقیق کا اس سلسلے میں
نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ایک عہد بنتا نیا اسلوب
تب ہے [illegible] کہ آپ کی باتیں ہو مختصر ہے کہ آپ کی

[illegible] سے دوستوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔
[illegible] کی شاعری کے بارے میں جو سلسلہ آپ نے شروع
کر رکھا ہے وہ اچھا جا رہا ہے۔ ندا فاضلی کا (عورت کی نسائی
شاعری) اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ شو شتک کی نظمیں
بھی بہت اچھی لگیں۔
مختلف کہانیوں کے ترجمے شاعر میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ یہ
آپ نے ایک اچھا طریقہ اختیار کیا ہے اس سے مشرق اور
مغرب کے مسائل اور موضوعات کا فرق معلوم ہوتا ہے۔
مذکورہ شمارے میں اختر امام کی چند نظمیں ان کے تجربے کی
عکاس ہیں۔ ابھی تک میرے ذہن میں نتاشا تعارف اور
"شاعر" کے حوالے سے ایک تصویر ابھری تھی آج شاعر
کے اس شمارے میں صدیقی صاحب کی تصویر بھی دیکھی،
بڑی خواہش تھی۔

★ اختر یوسف — [illegible]
شمارہ نمبر ۲ میں آپ کا اداریہ "فن پارہ کیا ہے، کیا
نہیں" فکر انگیز ہے۔ شاعری سے متعلق آپ نے جن نکات
[illegible] مسائل سے بالاتر آپ کی دنیا فن کار اور
[illegible] دونوں کے لیے ایک چیلنج ہے۔ نت نئے علوم اور
[illegible] کا حملہ چاروں طرف سے ہے۔ لہٰذا آج کے فن کار کی
ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ [illegible] کی نسائی شاعری مترجم ندا
[illegible] مجھے پسند آئی۔ [illegible] کی نسائی شاعری میں آپ نے غور
[illegible] زرد حسن کی مخصوص نزاکت موجود ہے۔ ایسی
نزاکت جس میں زرد اور گلابی رنگ کا خوش گوار امتزاج
ہے۔ آپ کی نظموں میں خود کلامی اور [illegible] کی تیزی
[illegible] ایک سوچتے ہوئے سنجیدہ [illegible] کا تاثر ابھرتا ہے، اس
[illegible] کو مزید [illegible] دیجئے۔
شمارہ نمبر ۳ میں وزیر آغا صاحب کا مقالہ "انشائیہ اور
انشائیہ نگاری" ایک [illegible] مقالہ ہے۔ سچ تو یہ ہے
انشائیہ کا بہت صاف CONCEPTION وزیر آغا صاحب کے
پاس ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے ان کی شاعر والی شخصیت پر
انشائیہ نگار والی شخصیت بھاری پڑ گئی ہے۔ [illegible]
محترم اعجاز صدیقی بہت خوب ہیں۔ ان کی غزلوں میں
[illegible] کی لے ابھرتی ہے۔

★ [illegible] علی — [illegible]
کئی [illegible] سے شاعر کا قاری ہوں۔ [illegible] تعلق کی
[illegible] سے [illegible] بھی ملتی ہے لیکن فکر ہے [illegible]
[illegible] ہوتا جا رہا ہے۔ شاعر کے بارے میں اب جو
[illegible] REPEATATION [illegible]
۹۲ کے شمارہ نمبر ۳ میں [illegible] کا مقالہ "انشائیہ اور
انشائیہ نگاری" نظر سے گزرا۔ [illegible] صاحب نے بہت ہی
اچھے انداز میں ESSAY اور LIGHT ESSAY کے فرق کو
واضح کیا ہے۔ ان دنوں انشائیہ، طنزیہ مزاحیہ اور طنز و مزاح کو
اس طرح گڈمڈ کر رہے ہیں کہ خود مضمون نگار کو پتہ نہیں
چلتا کہ اس نے کس نوع کا مضمون لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے
انشائیہ اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا موازنہ کر کے عام فہم انداز
میں ان کے فرق کو واضح کیا ہے۔ ان کے اس مضمون سے
ذہن کے بہت سے جالے صاف ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ
شاعر کے قارئین اور محبان جو شاعر کو اپنی ہی ملکیت سمجھتے ہیں
اس کے تحفظ اور سنوارنے، نکھارنے کے لیے ہر وقت آپ
کے ساتھ ایک مضبوط دیوار کی طرح رہتے ہیں، آپ کو مالی
مشکلات سے دوچار نہیں ہونے دیں گے۔

★ قمر جمیل — [illegible] گلشن اقبال، کراچی (پاکستان)
شاعر کا ہر شمارہ میرے لیے خاص دلچسپی کی چیز ہوتا
ہے (جنوری، فروری اور مارچ کے شماروں کے مقالے)
اس کے علاوہ بھی مندرجات خوب ہوتے ہیں۔ اتنی محنت
اور جانفشانی سے مجلہ نکالنا واقعی مشکل کام ہے اور شاعر تو
اتنے طویل عرصے سے نکل رہا ہے کہ داد دی جا سکتی ہے۔

★ شروَن کمار ورما — [illegible] (پنجاب)
شاعر شمارہ ۲ اور تین موصول ہوئے۔ یہ بلا خوف
تردید کہا جا سکتا ہے کہ شاعر ہر لحاظ سے ترقی کی منزل طے کر رہا
ہے۔ سیماب صاحب کا لگایا ہوا پودا جسے اعجاز صدیقی صاحب
نے پروان چڑھایا، اب آپ کی کوششوں سے تناور درخت
بن گیا ہے۔ اب اس کا سایہ دور دور تک محسوس کیا جا سکتا
ہے۔

★ اسنیٰ بدر زبیری — [illegible] (یوپی)
استاد کہ شاید [illegible] نے نہیں دیا جتنا آپ کی "ایک
نظم میں" —— ایک نظم بہت خوبصورت نہیں بلکہ
تکلیف دہ حد تک خوبصورت ہے۔ خدا کرے کہ یہ نظم بھی نہ
ہو۔ میں آپ کے لفظوں میں بچے کی قدرت سے متاثر
رہوں گی کہ یہ محض ایک نظم ہے۔ نظم "ماں: دنیا اور کائنات"
کے لیے کیا لکھوں۔ کاش کبھی میں بھی اپنی ماں کے لیے
ایسے بچے، ایسے منظر، ایسے خوب صورت لفظ تخلیق
کر سکوں۔ مگر ماں کی دعاؤں کا حصول اب کیسے ہو گا؟۔
دونوں ہی نظموں نے روحانی خوشی نہیں، روحانی دکھ پہنچایا
ہے۔

★ [illegible] جوری — [illegible] (جرمنی)
شاعر [illegible] ایک [illegible] نظموں اور [illegible] عمر
غزلوں کے لیے وقف ہو گیا ہے۔ اس بار [illegible] وقف
کیا گیا ہے۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اس بار آپ نے اس
[illegible] تخلیقات کے لیے وقف کیا ہے۔
محترم اعجاز صدیقی صاحب کی مرصع اور خوبصورت غزلوں کی
اشاعت کر کے آپ نے صرف ہم قارئین ہی پر نہیں بلکہ اردو دنیا
نیز شاعر پر بھی احسان کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر کبھی ان
کے [illegible] عظمت اور [illegible] تخلیقات سے [illegible]
ویسے تو آپ [illegible] ہیں، شاعر آپ کا [illegible]
ویسے میں آپ کو [illegible] اردو ادب میں کسی
بھی مروجہ صنف کا [illegible] نہیں [illegible] اس گستاخی کی معافی
چاہوں گا کہ [illegible] نظمیں، شاعر کے اس [illegible] کے
ہم آہنگ نہیں ہو پاتیں کیونکہ اس شمارے کا تقاضہ [illegible] ہے
کہ:

ایسی [illegible] من [illegible] آ [illegible]
اوروں کو [illegible] کرے، آپ [illegible] ہونے

اعجاز صدیقی صاحب کی پانچوں غزلوں میں جو وجد،
جو کیفیت اور جو [illegible] رقص ہوتی ہے وہ اس شمارے کی
دوسری تخلیقات میں کہاں۔ ان غزلوں کو پڑھ لینے کے بعد
دیگر تخلیقات کو نہ پڑھ کر بھی محسوس ہوتا ہے کہ پورا [illegible]
شمارہ میں نے پڑھ لیا۔ ویسے دیگر منظومات بھی آپ کے
حسن انتخاب کا اظہار ہیں۔

نہ غزل میں ہے کوئی تیرگی، نہ [illegible] میں کوئی روشنی
یہ [illegible] کے چراغ ہیں، کہیں بجھ گئے، کہیں جل گئے

تردید

نہ جانے کس خواہش کے تحت کہانی "سنگھاسن"
کے خالق شموئل احمد کو میرے خلاف شاعر میں ایک اشتہار
(مطبوعہ مارچ ۹۵، جلد ۶۶) شائع کروانا پڑا۔ ان کا یہ الزام
قطعی بے بنیاد ہے کہ دہلی اردو اکادمی کے ڈرامہ فیسٹول کے
لئے اسکرپٹ داخل کرتے ہوئے ان کی "شرط" کا لحاظ
نہیں رکھا گیا اور میں نے "سنگھاسن" کو اپنی کہانی بتایا۔
حقیقت یہ ہے کہ اصل مسودے کے پہلے ہی صفحے پر جلی
حروف میں تحریر ہے "شموئل احمد کے سنگھاسن پر مبنی
ایک ڈرامہ" —— یہی نہیں بلکہ میرے تصدیق نامے
اور اقرار نامے دونوں ہی میں یہ اعتراف میرے دستخط کے
ساتھ موجود ہے۔ دہلی اردو اکادمی کی جانب سے جاری شدہ
اشتہارات میں بھی ان کا نام موجود ہے۔ ڈرامہ [illegible] کے
جانے والے دن بھی جو اطلاع نامے تقسیم کیے گئے ان میں
بھی بحیثیت کہانی کار ان کا نام موجود ہے۔ اب اگر اکادمی کی

دیا گیا۔ تبصروں میں ان کا نام نہیں آیا تو اس کی ذمہ داری [illegible]
[illegible] نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ [illegible] میں [illegible]
[illegible] گئی ہوئی گئی [illegible]
سکے تھے۔ خوشی ہوئی [illegible] سر [illegible] گیا ہے۔ ان
کی [illegible] میں میرے [illegible] تعلق [illegible] سکتی
ہے۔ اس لئے ان کا [illegible] اخلاقی فرض بنتا ہے کہ وہ مجھ سے
تحریری طور پر معافی مانگیں۔ (شاید انور کی "تردید" کی
[illegible] کا مقصد زیر بحث میں "وہ شخص" کو بچانا لگتا ہے
جبکہ شاعر میں شائع ہونے والے اشتہارات کے کسی بھی [illegible]
سے [illegible] شاعر کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ادارہ)

[illegible]

اپریل۔ مئی ۱۹۹۵ء

★ آفتاب الحسن — ڈی۔ ۱۵۸، [illegible] روڈ، [illegible]
[illegible]

شاعر کے دونوں تازہ شمارے ملے۔ شاعر کے بارے میں اوروں کی طرح میں بھی بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر میری مجبوری یہ ہے کہ اگر میں تمام موصولہ رسائل کے بارے میں ان کے مشمولات پر [illegible] لکھنا شروع کروں تو میرا تخلیقی کام کیسے مکمل ہو پائے۔ بس اسی مجبوری کے تحت خاموش [illegible]۔ ویسے تو شاعر کا ہر شمارہ ہی تحفہ ہوتا ہے لیکن اس بار کے دونوں شمارے میں کوئی [illegible] صاحب کا سنجیدہ مضمون [illegible] طلب ہے۔ افسانوی حصے میں لکھنے والوں نے [illegible] سے بڑی مدد کی ہے۔ "در آید" اور [illegible] (جسے ہم [illegible] کہتے ہیں) عمدہ کہانیاں ہیں۔ [illegible]۔ ایک [illegible] اور [illegible] فکر انگیز اور [illegible] کی کہانی بھی [illegible]۔ [illegible]

★ محمود ہاشمی — [illegible]
شاعر کے دونوں شمارے [illegible]۔ سب عمدہ اچھے لگے۔

★ منصور الٰہی شیخ — [illegible]
یہ خط [illegible] کہ آپ کو اور سلطان سبحانی صاحب کو [illegible] سے مطلع کر [illegible]۔ [illegible] کے [illegible] خوبصورت [illegible] بیٹھے [illegible] ہے۔ [illegible] کے [illegible] سے [illegible] بعد [illegible] سلطان سبحانی تک میری [illegible]

"شاعر" کے بعد شمارے سامنے ہیں، [illegible] تک۔ ادارے نے تہذیبی سوچ اور [illegible] آپ کے [illegible] بھی [illegible] ہماری مجبوری کا اظہار کر رہی ہیں۔ [illegible] ایک [illegible] سطر بھی نہیں مگر [illegible] کوئی [illegible] نہیں۔ ایسی تخلیقات کی کمی ہے جنھیں بے ساختہ [illegible] جاسکے۔ شاید وہ سلسلہ اب ختم [illegible] اپنے قلم میں بھی وہ طاقت پیدا نہیں کر پائے [illegible] ایک ایسی تخلیقات کو اس طرح [illegible] وہ بھٹک گئے۔ انتخاب میں [illegible] اور مروت کو [illegible] رکھ کر معیار کا اور اپنے خصوصی [illegible] کا خیال رکھنا چاہئیے۔ ورنہ [illegible] کوئی [illegible] تو کامل اور معتبر [illegible] لیکن اب ان کے پاس کہنے کے [illegible] نیا ہے نہیں۔ شاعر کے تحفہ سے [illegible] ان کی کمی تخلیقات سے متحمل نہیں ہو سکے۔ ورنہ [illegible] کے متعلق چالیس برس سے جو کچھ چلے آئے ہیں، اس میں ایک [illegible] سطر کے علاوہ مجھے تو کوئی [illegible] نظر نہیں آیا۔

[illegible] اور جہت دولت اور عہدے کے بل پر [illegible] شاعری کو [illegible] کی کوشش کرتے ہیں۔ جس شعر کی انہوں نے [illegible] کے حوالے سے اتنی تعریف کی ہے وہ انتہائی گھٹیا اور معمولی ہے۔ [illegible] کی نظم و شعر دونوں اس قابل نہیں کہ ان پر کوئی [illegible] ضائع کئے جائیں۔ [illegible] اور [illegible] نے واقعات کے بیان سے [illegible] ادب تخلیق نہیں ہوتا۔ "شاعر" کی دو ایک بار جس الٹ پلٹ کے [illegible] اس روایت کو نیا رنگ و آہنگ دے کے منفرد مقام حاصل کرو جو سال بھر پہلے تک حاصل تھا، ورنہ [illegible] معمولی [illegible] میں [illegible] لئے گئے ہیں۔

★ سلیمان اطہر جاوید — [illegible]
شاعر کے شمارے [illegible] اور [illegible] ملے۔ ہمیشہ کی طرح آپ نے دریا کو کوزے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب ہیں۔ ضخامت کم سہی لیکن مواد تقریباً دوگنا ہے۔ میرے نزدیک شاعر کی انفرادیت یہ ہے کہ آپ نے اس کو روایتی انداز کے ایک ادبی جریدے کے بجائے ایک فکری اور تہذیبی جریدہ بنا دیا ہے کہ آپ کے اداریے، نیز مقالات، مباحث اور دیگر تخلیقات جاندار ہوتی ہیں۔ [illegible] شماروں کو دیکھنے سے یہ بھی مسرت ہوئی کہ اب آپ شاعر کو بر وقت شائع کر رہے ہیں۔ [illegible] سال سے چلی آنے والی تاخیر اب ختم ہوئی۔ اس خصوص میں آپ کو جن مراحل سے گزرنا ہوا ہوگا اس کا احساس [illegible] ہی کر سکیں گے [illegible]

★ منصور [illegible] — [illegible]
"۲ خطا باتیں ہزار" میں مختلف خیالات و نظریات — [illegible] کو [illegible] میں [illegible] دیتے ہیں۔ [illegible] آئندہ تو بہت [illegible] کی [illegible] آگے جیسے تو ہم سے پہلے کی تہذیب و تمدن تھا۔ ہندوستان کی تہذیب تو [illegible] ہے [illegible] ہے [illegible] رجحان کے رنگ کا [illegible] ذہن ہے۔ اور سب سے [illegible] کا [illegible] نام ہے، [illegible] ہے، [illegible] ہے [illegible] ہے [illegible] اور [illegible] ہے [illegible]

★ بلقیس ظفیر الحسن — [illegible]

شمارہ نمبر ۲ میں "۲ خط۔ باتیں ہزار" [illegible] شہزاد کی طرح میں بھی اس بات کو مانتی ہوں کہ فن [illegible] آزادی فکر و اظہار ہونی چاہئیے۔ لیکن دانشوری کے لئے خدا اور مذہب سے انکار کیا ضروری ہے؟ یا انہوں نے کیسے طے کر لیا کہ مذہب پیروی کے بغیر آزادی ذہن کا تصور [illegible] کیا جاسکتا۔ خدا کا معاملہ تو ہم خدا ہی پر چھوڑ دیں۔ انہیں [illegible] اندازی نہیں کرنی چاہئیے۔ اور مذہب! مذہب تو ابتدائے آفرینش سے اب تک تو ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا وہی "سلامتی کا راستہ" جو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے جانا جاتا رہا ہے۔ جب یہ مذہب اپنے اصل راستے سے ہٹ جاتا ہے تو کبھی ڈکٹیٹرشپ کی صورت اختیار کر لیتا ہے کبھی چنگیزی سیاست بن جاتا ہے۔ اور کوئی بھی دانشور، کوئی [illegible] فن کار یقینی طور پر اسے قبول نہیں کر سکتا۔ ایک تخلیق کار (آپ کے الفاظ میں [illegible]) کے لئے یہ کیسے طے کیا جا سکتا ہے کہ وہ کیا لکھے کیا نہیں لکھے۔ اگر وہ سمت تو وہ خود نہیں جانتا کہ وہ کیا تخلیق کرنے والا ہے۔ رع:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

[illegible] کو مجھ سے کہ محبت اور جنس [illegible] قرے ہیں کیوں نہیں [illegible] ہیں۔ رع:

[illegible] ریاض میں بس کر وہ تو اپنے "[illegible]" بالکل بھول گئے، بہاں لوگوں کو [illegible] کرنے کی نہ ہمت ہے نہ [illegible]

[illegible]

سچے تجربوں اور گہرے مشاہدوں کے شاعر

عتیق انظر

کی غزلوں اور نظموں کا اوّلین مجموعہ



● موجودہ نئی نسل میں عتیق انظر ایک اہم نام ہے۔ انظر نے اپنی شاعری کو سجانے کے لئے مروجہ علامتوں کو بیساکھیوں کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ دروں بینی اور انکشافِ ذات کے عمل کو دلیلِ راہ بنا کر انھیں نئے مفہوم سے آشنا کیا ہے۔ اس عمل سے اس کی غزل اور نظم دونوں میں روشنی بھی پیدا ہوئی اور گرمی بھی۔ انظر کی غزلوں اور نظموں کو پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مدت کے بعد تازہ ہوا کے جھونکے نے میرے دل و دماغ کو شاداب اور معطر کر دیا ہو۔ انظر کی شاعری کی پیکر تراشی نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد

● عتیق انظر کی شاعری میں جابجا تازگی اور فرحت بخش تازگی کی جھلکیاں ملتی ہیں، جن سے ان سے اردو دوستی کی نئی امیدیں بندھتی ہیں۔

محمد حسنی

● یہ بڑی بات ہے کہ اتنی کم عمری میں آدمی کی سمت کم پختہ ہو۔ ہمیں لگتا ہے کہ انظر ایسا شخص ہے جو اپنی آواز کی تلاش کر رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب وہ اپنی انفرادیت اور اپنی آواز کو پا لے گا۔

خلیق انجم

● عتیق انظر کی شاعری اور پچھلے دس برسوں کی شاعری میں دو، تین باتوں کا فرق ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بیشتر نظمیں جو پرچوں اور نظموں کے مجموعوں میں شائع ہوئی ہیں وہ منتشر تفصیلات کے مجموعے ہیں لیکن انظر کی نظمیں منتشر تفصیلات کا مجموعہ نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے نقطۂ تکمیل پر ایک نامیاتی وحدت کی منزل کو پالیتی ہیں۔ یہ بات اب بہت کم شاعروں میں ہمارے یہاں نظر آتی ہے۔ انظر کے ہاں عصری مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ ان کے بعض شعروں میں تہہ داری بڑی شدت سے اور بڑی جہتوں سے اظہار موجود ہے۔ ان کا یہ اوّلین مجموعہ، بڑے امکان کا مجموعہ ہے

بلراج کومل

● عتیق انظر نے بڑی حد تک اپنی لفظیات خود منتخب کرنے کی کوشش کی ہے۔

زبیر رضوی

● عتیق انظر کے ہاں تجربوں کا تنوع، اظہار کی جرأت اور ندرتِ خیال کی فراوانی ہے۔ انھوں نے نئی نئی زمینوں اور خوبصورت ردیفوں میں غزلیں کہی ہیں اور نہایت ہی خوبصورت علامتیں اپنی غزلوں میں استعمال کی ہیں۔ ان کی بیشتر غزلیں نئے لب و لہجے کی ہیں۔

مرنعت سروش

● پہچان کا مطالعہ شعر سے شغف اور شعر گوئی کی تحریک پیدا کرتا ہے۔

مظہر الحق

معیاری کتابت، طباعت، کاغذ اور مضبوط جلد

صفحات: ۱۹۲ ✻ قیمت: اسی روپے

ملنے کے پتے

◆ انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) اردو گھر، راؤز ایونیو۔ نئی دہلی ۲

◆ غالب اکاڈمی، بستی حضرت نظام الدین ۔ دہلی ۔ ۱۲

◆ مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک، امین آباد۔ لکھنؤ

◆ ناز اسٹور۔ پوسٹ بکس ۱۸۶، دوحہ ۔ قطر

◆ سید صدیق حسین، پوسٹ بکس ۹۴۳۸۷ ۔ ریاض

◆ ASIA PUBLICATIONS
7495 HURDLE CRESENT SURREY
B.C, V3W 8T8 CANADA

بہ اہتمام مجلس فروغ اردو پوسٹ بکس ۶۹۰۱ ۔ دوحہ ۔ قطر۔ فون نمبر: ۸۶۱۰۶۰

REGD NO MH BY SOUTH 51 B

Price Rs. 7/-

THE "SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 004

66 Years of Publication * Publishing Date 27-28 * Issue JUNE -1995 * Tel. No. 382 99 04

Registererd with the Registrar of Newspapers at R N. No 14482/57

